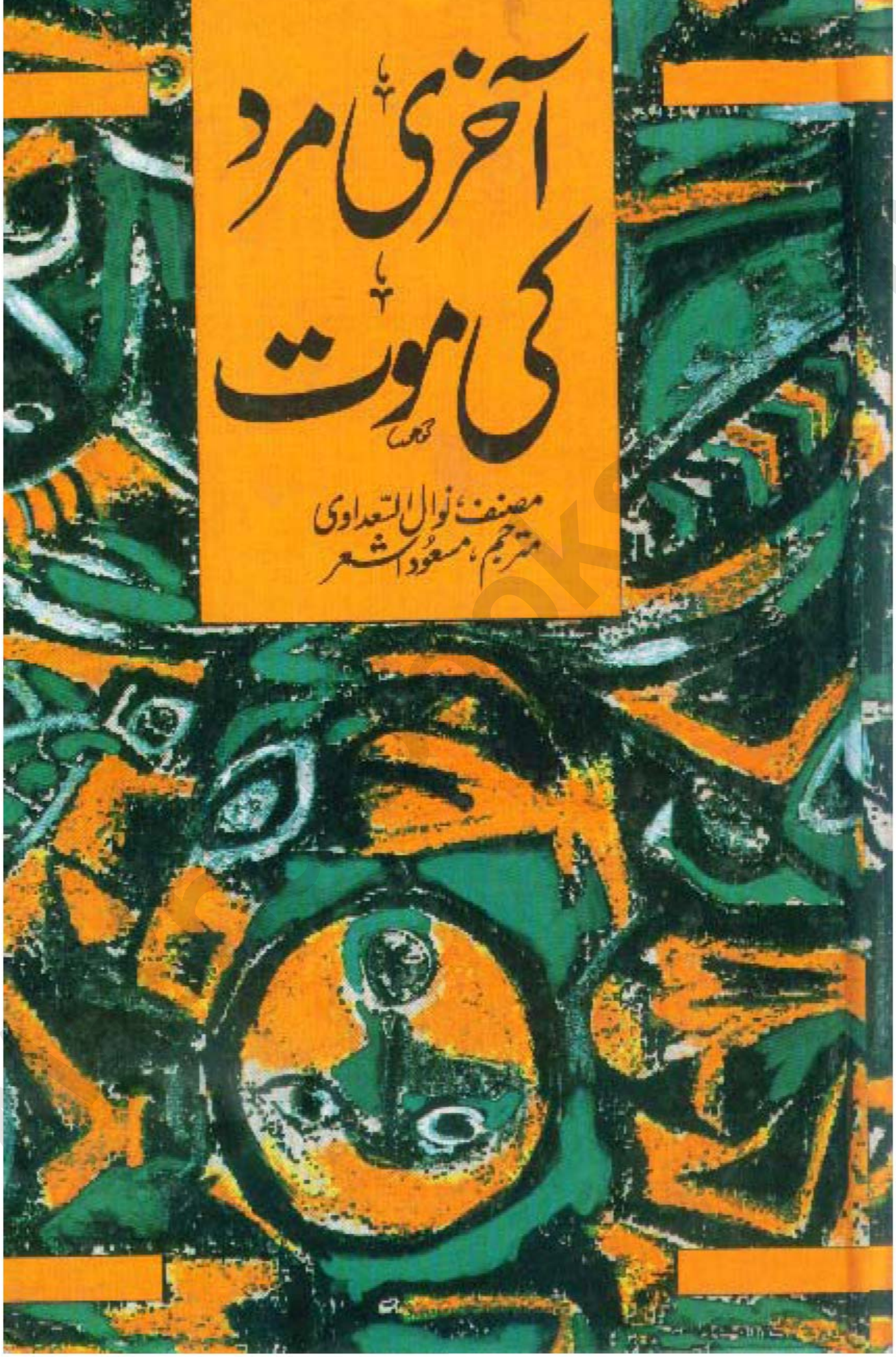
آخری مرد
کی موت
مصنف، نوال السعداوی
مترجم، مسعود اشعر

(ناول)

آخری مرد کی موت

اور

بارہ افسانے

مصنف: نوال السعداوی

مترجم: مسعود اشعر

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.com

MashalBooks.com

فہرست

دیباچہ	8
آخری مرد کی موت	12
افسانے	146
ایک سابق وزیر کی موت	148
جنت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں	162
بند کمرے میں	169
مرد	185
وہ خچر نہیں تھا	194
سب سے بڑا جرم	203
اسے کسی نے بتایا ہی نہیں	214
''بیوٹی فل''	219
ایک آرٹسٹ دوست کے نام ذاتی خط	226
دو سہیلیاں	236
تصویر	243
مضمون	249

MashalBooks.com

تعویذ گنڈوں میں لپٹی مسلمان عورت کی کہانی

کشور ناہید

اسرائیل میں زنا بالجبر کو کنٹرول کرنے کے لئے جب عورتوں پر پابندیاں لگائی گئیں تو گولڈا میئر نے کہا تھا کہ عورتیں تو مردوں پر وحشیانہ طور پر حملہ آور نہیں ہوتی ہیں۔ یہ تو مرد ہوتے ہیں۔ پابندیاں لگانی ہیں تو مردوں پر لگائی جائیں۔

مگر ابھی تک تاریخ اور تہذیب نے کوئی ایسا معاشرہ نہیں دیکھا جس میں اخلاقی پابندیوں کی زنجیر' مرد کے پیر میں بھی ڈالی گئی ہو! اس پر مستزاد یہ کہ ہر مذہب کے پاسداروں نے تمام تر پابندیاں عورت کے لئے مخصوص کیں اور ان پر عملدرآمد کو ہی معاشرے کے لئے جزو لازم قرار دیا۔

ساری دنیا کے معاشروں کے سارے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ان روایات کو ہی تہذیب کے نام پر مستحکم کیا۔ جس عورت نے بھی ان روایتوں کو چیلنج کیا' اس کو انسانی شرف تک سے محروم کرنے کی سعی کی گئی' اور جہاں کسی مرد نے تحریر یا تحریک کے ذریعہ' غلامانہ ذہنیت کی اس معاشرت کو للکارا' اسے بھی مزاحمت کی دہلیز پر پسپا ہونا پڑا۔

اس غیر مساوی اور غیر منطقی اور غیر انسانی معاشرے نے دنیا کو کیا دیا؟ پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو یہ قبیلوں اور ملکوں کی جنگیں ہی تھیں جو کبھی تاتاری بنے اور کبھی بوسنیائی۔

یا پھر مہلک ہتھیاروں کے لئے جنونی دوڑ جو چرنوبل بن کر' خود اپنی ہی ہلاکت کا سبب بنی۔

یا زر کے حصول کے لئے مافیا کی شکل میں سیاست سے معیشت تک پر قابو پانے کی غرض سے عدالتوں' اسمبلیوں اور ووٹ کی پرچیوں تک پر قبضہ...... پھر ہیروئن اور ایڈز کی دلدل۔

انسانی وجود کی اس دلدل کا متحرک کردار' صرف مرد تھا۔ عورت کو تو قلوپطرہ اور نور جہاں کی شکل میں بھی استعمال کیا گیا۔

قبیلوں کی لڑائی میں صلح کے حربے کے لئے عورت کو ہی سر اور پیر سے ننگا کر کے آج بھی بلوچستان میں بگٹی سرداروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ وزیروں اور اعلیٰ حکام کے سامنے بدن برہنہ کم سن آج بھی پیش کی جاتی ہیں کہ مردانگی کے رعب کی چادر تنی رہے۔

ہر ظلم اور ہر تیر ایک حد کو چھو کر اپنا اثر چھوڑنے لگتا ہے۔ آج جب الجزائر' مصر اور ترکی نے بنیاد پرستوں پر پابندی لگائی ہے اور حجاب کے استعمال کو ممنوع قرار دیا ہے تو مجھے آج سے 20 سال پہلے کا مصر یاد آ رہا ہے جب نوال السعداوی کی تحریروں پر پابندی لگی تھی اور انھیں جیل میں ڈالا گیا تھا اور ان کی کتابیں ممنوع قرار دی گئی تھیں۔

مردوں کی ممنوع کی جانے والی کتابوں کے موضوع سے تعارف تو بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ممنوعہ کتابیں چاہے لارنس کی ہوں یا منٹو کی۔ ان میں عورت کے جسم اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک اور مرد کا اخلاقی دیوالیہ پن حکومتوں سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ لکھنے والی عورت کی کتابیں ممنوعہ ہونے کے لئے الگ منطق وضع کی جاتی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہماری مہذب مشرقی لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں' ہمارے معاشرے میں بے حیائی آ جاتی ہے۔

ڈاکٹر نوال السعداوی نے کیا لکھا تھا' جس سے مصر میں بے حیائی پھیلی؟ نوال ایک گائنا کولوجسٹ ہیں۔ انہوں نے کم سن بچیوں کی Circumcision کے باعث' بچیوں کی اموات اور خرابیوں سے متعلق Case histories لکھیں۔ انہوں نے عورت کے ساتھ شادی کے نام پر غیر انسانی رشتے کی تہوں کو بے نقاب کیا اور جب یہ لکھ دیا کہ جس مرد نے اس بیوی سے سات بچے پیدا کئے جس کے بدن اور ہاتھوں کو لمس سے آشنا تک نہیں کیا بلکہ زمین پر دھکا دے کر اپنے غرور کی پیاس بجھائی۔ تو نوال کو گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔

ڈاکٹر نوال السعداوی سے میری ملاقات 1985ء میں نیروبی میں ہوئی تھی۔ سفید بالوں والی خاتون جن کے ساتھ گفتگو کرنے اور جن سے ملاقات کرنے کے لئے عورتوں کا ایک ہجوم ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کمال بات یہ ہے کہ ایسی کانفرنس میں بیٹی فریڈن بھی موجود تھیں۔ وہ درخت کے نیچے اپنا الگ حلقہ بنائے بیٹھی رہتی تھیں۔ لوگ ان سے ملنے جاتے تھے۔ مگر نوال تو بیچ کانفرنس ہر سیشن میں اپنی آواز اور نقطہ نظر کی گونج کے ساتھ موجود ہوتی تھیں۔

جب میں نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں پاکستان سے ہوں تو اسلام کے نام پر پاکستانی عورتوں کے ساتھ ہونے والی ساری زیادتیوں کی کہانی انہوں نے خوب تفصیل سے سنی۔ میری نظموں کے تراجم مانگے اور فلسطینی عورتوں کے خصوصی سیشن میں شمولیت کے لئے مجھے خاص طور سے دعوت دی۔ اس دن سے آج تک میرا اور نوال السعداوی کا قلمی رشتہ قائم ہے۔

نوال السعداوی کی زیرِ نظر کہانیاں اور ناولٹ، اردو زبان اور مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی کہانیاں ہیں۔ ہمارے ملک کے دیہی عوام سے لیکر امریکہ پلٹ لیڈران تک کالے علم، تعویذ گنڈوں اور مزاروں پر چادریں چڑھانے کو اپنے یقین اور اعتقاد کا حصہ مانتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی ہر وہ بچہ حرامی کہلاتا ہے جس کا باپ اپنا نام ظاہر کرنے سے بھاگ جائے۔ ماں اور بچہ دونوں کو سنگسار کر کے، جنت کمانے کے شوقین، ہر طرف نظر آتے ہیں۔

ہمارے دیہات میں بھی پولیس والا اور امام مسجد ہی ہر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کے اخبار بھی ڈاکٹر نوال السعداوی کے کہنے کے مطابق، ''جھوٹ لکھتے اور جھوٹ چھاپتے ہیں اسی لئے وہ باورچی خانے کے شیلف پر بچھانے کے کام آتے ہیں''۔

ہمارے یہاں کے وزیر، سابق ہونے کے لمحہ بھر بعد ہی مضطرب رہتے ہیں اس گھڑی کے لئے جب ایک بار پھر ٹیلی فون پر کوئی کہے ''وزیر محترم......''

مسلم تہذیبی معاشروں میں جہاں عورت مرد کے رشتے کی کوئی اکائی نہیں بنتی۔ وہاں عورت کی دوسری عورتوں کے ساتھ مفاہمانہ اور محبت کے رشتے کی اساس بھی نظر نہیں

آتی ہے۔اسی لئے بیشتر خودنوشتوں میں آپ کو ملے گا کہ بچیوں کو مائیں بھی بدن میں تبدیلی کے عمل سے شناسا کرنے اور سمجھانے سے گریز کرتی ہیں۔وہ کہتی ہیں جب وقت پڑے گا تو خود ہی سمجھ جائے گی اور یوں نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ، عورت کا اپنے بدن اور اپنے وجود کو ناپسند کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے جو زندگی بھر عمر کے مختلف مرحلوں میں نت نئی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔

یہ سارے حوالے، ڈاکٹر نوال السعداوی کی کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ان کا کوئی ایک کردار بھی تو ہمارے لئے اجنبی نہیں کہ پوری مسلم دنیا میں مرد، حاکمیت، جبر اور قرب کا سمبل ہے۔عورت کے لئے محاورتاً کہا جاتا ہے کہ پیروں تلے جنت ہے لیکن اس کے پیر سے جوتی نکال کر، اس کی ٹھکائی کر کے، مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا جب چاہے دوسری شادی کر لے۔

عرب عورتوں کے مسائل پر نوال السعداوی پہلی کتاب 1972ء میں شائع ہوئی تھی۔مصری حکومت کے ہاتھوں تنگ آ کر آخر انہوں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کا مرکز بیروت کو بنا لیا ادھر مصری حکومت نے ان کو وزارت صحت کی معتبر نوکری سے برخاست کر دیا۔

لطف اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نوال السعداوی کے شوہر شیرف ہتاتا......خود ایک ڈاکٹر اور ناول نگار ہیں۔ڈاکٹر نوال کی بیشتر کتابوں کا انگریزی ترجمہ انہوں نے ہی کیا ہے۔اس لئے وہ تہذیبی مزاج جس نے مسلم معاشروں کو دقیانوسیت کی تہوں میں پلیٹ رکھا ہے۔وہ اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ ترجمے میں بھی محفوظ ہے۔

ڈاکٹر نوال السعداوی کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے مسعود اشعر کو ذرا بھی تو دقت نہیں ہوئی ہوگی۔ بلکہ کہیں کہیں کسک سی ہوئی ہوگی کہ اردو افسانے کے دل میں یہ واقعات تراز و ہونے سے بچ کیوں گئے۔سبب یہ بھی ہے کہ طویل ترین مارشل لاء کے زمانوں نے ہم سب کو ذہنی طور پر بزدل بنا دیا ہے۔سب سے زیادہ متاثر ہونے والی مخلوق عورت ہے۔نئی کھڑکی سے جو منظر سامنے آتا ہے۔کبھی کبھی وہی منظر نئے سفر کا سامان بنتا ہے۔ڈاکٹر نوال السعداوی کی تحریوں کا یہ انتخاب، اردو زبان کے حجاب کو کم کرنے اور اردو لغت کو غیر متعصّب کرنے کی سمت ایک مثبت رجحان بننے کے امکانات رکھتا ہے۔

27 مئی 1993ء

آخری مرد کو موت

(1)

ابھی سورج کی نارنجی کرنوں نے درختوں کی پھننگوں کو نہیں چھوا تھا' ابھی مرغ نے بانگ نہیں دی تھی' کتے بھی نہیں بھونکے تھے اور گدھوں نے رینکنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور ابھی نیم تاریک خاموشی میں شیخ حمزوی نے فجر کی اذان دے کر مومنین کو نماز کی طرف بھی نہیں بلایا تھا کہ لکڑی کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا جیسے زنگ آلود رہٹ کا پہیہ چرچراتا ہوا۔ ایک لمبا اور سیدھا تنا ہوا سایہ باہر نکلا اور دو مضبوط قدموں پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے ایک اور سایہ تھا۔ اس کے چار پاؤں تھے جو بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ وہ کاہلی کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

دونوں سائے تاریکی میں غائب ہو گئے پھر وہ دریا کے کنارے نمودار ہوئے۔ صبح کی زرد روشنی میں ذکیہ کا دبلا پتلا' اور خون سے خالی چہرہ سامنے آیا۔ ہونٹ اس طرح سختی سے بند تھے جیسے ان سے کبھی ایک لفظ بھی نہ نکلا ہو۔ بڑی بڑی پھٹی آنکھیں افق پر لگی تھیں جن سے غصہ اور بغاوت ٹپک رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک بھینس کا سر اوپر نیچے ہل رہا تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا اور ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا لیکن اس میں بغاوت کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ اس کی پھٹی آنکھوں میں انکساری اور نرمی تھی کہ جو کچھ بھی پیش آنا ہے پیش آجائے۔

صبح کی روشنی دریا کی سطح پر جھلملا رہی تھی اور ایک ایک لہر نمایاں ہو رہی تھی جیسے کسی اداس بوڑھے چہرے کی جھریاں ...... نیچے گہرائی میں پانی ساکن تھا۔ اس کی روانی گزرتے لمحوں کی روانی کی طرح یا آسمان پر تیرتے بادلوں کی طرح محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

MashalBooks.com

دور تک پھیلے میدانوں میں ہوا بھی خاموش تھی۔ وہ پیڑوں کی شاخوں میں سے اتنی نرمی کے ساتھ گزر رہی تھی کہ پتے بھی نہیں ہل رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے ساتھ دریا کے اونچے کناروں تک ریت کے نظر نہ آنے والے باریک ذرے اڑا کر لا رہی تھی اور نشیبی علاقوں میں کھڑے مٹی کے جھونپڑوں پر برسا رہی تھی۔ ان جھونپڑوں کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بند تھیں اور ان کی نیچی ناہموار چھتوں پر کپاس کی سوکھی چھڑیوں کے گٹھے پڑے تھے اور بھوسے اور اپلوں کے ڈھیر لگے تھے۔ تنگ گلیوں میں کھاد کے ڈھیروں نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ گاؤں کی اس تصویر کو وہ تالاب مکمل کرتا تھا جس کی کائی جمی ہری سطح پر ہوا کے ساتھ آنے والے یہ ذرے نظر نہ آنے والی چادر سی تان رہے تھے۔

وہ سبز اور مٹیالے کھیتوں کے درمیان جھجکتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ آسمان پر اندھیری رات آہستہ آہستہ نارنجی روشنی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ یہ روشنی دھیرے دھیرے ہلکا نارنجی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اچانک زمین کے ایک کنارے سے سورج کی ٹکیہ نمودار ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ آگ کا گولا بن جاتی ہے اور پھر آسمان پر چھا جاتی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ دن کی روشنی رات کی تاریکی کو دور بھگائے ذکیہ اپنے کھیت میں پہنچ جاتی ہے۔ تالاب کے کنارے درخت کے ساتھ بھینس کو باندھتی ہے' سر سے کالی چادر اتار کر زمین پر ڈالتی ہے' آستینیں چڑھاتی ہے اور اپنے جلابیہ کا دامن کمر کے گرد لپیٹ لیتی ہے۔

اب ایک تسلسل کے ساتھ اس کے کدال کی آواز آ رہی ہے جو زمین کی کوکھ میں گڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے بازوؤں کے پٹھے ابھر آئے ہیں' سیاہ جلابیہ کے نیچے ننگی مضبوط پنڈلیاں صبح کی روشنی میں گندم کے رنگ کی نظر آ رہی ہیں۔ اس کے چہرے کے نقوش ویسے ہی ہیں' وہی تیکھے' سخت اور دبلے پتلے مگر اب چہرہ زرد نہیں ہے۔ گرمی' دھول' مٹی اور دھوپ میں پک کر تانبے کے رنگ کا دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اندر جسم پیلا ہے' بالکل زرد' جو رنگ اس کے چہرے پر پہلے نظر آیا تھا۔ اس کا جسم جھک گیا ہے۔ وہ کدال چلاتے ہوئے جھکی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں زمین پر نہیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ پیروں پر بھی نہیں جمی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرح اوپر دیکھ رہی ہیں۔ غصے اور بغاوت کے جذبات سے مغلوب وہ اسی طرح کہیں دور دیکھ رہی ہیں۔ وہ کدال سر سے اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر مارتی ہے تو اس سے بھی اسی غصے اور بغاوت کی آواز بلند ہوتی ہے۔

کدال کی آواز تسلسل کے ساتھ ایسے آ رہی ہے جیسے گھڑیال کی دبی ہوئی ٹن ٹن

سنائی دے رہی ہو۔ جیسے وہ گھنٹہ گزرنے کا اعلان کر رہی ہو۔ گھڑیال وقت کو ہڑپ کرتا رہتا ہے اور میکانکی انداز میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ زمین کاٹتا ہے۔ وہ کبھی نہیں تھکتا، کبھی خراب نہیں ہوتا، کبھی سانس لینے کو نہیں رکتا، وہ کبھی آرام نہیں کرتا۔ وہ دن بھر کھیت میں مسلسل کھٹ کھٹ کرتا رہتا ہے، کسی غیر انسانی طاقت کی طرح انتھک اور غیض و غضب میں بھرا۔ دوپہر کو جب لوگ کھانا کھانے کے لئے وقفہ کرتے ہیں اس وقت بھی وہ خاموش نہیں ہوتا۔ بھینس ٹھہر جاتی ہے، رہٹ کے پہیئے رک جاتے ہیں، لیکن ذکیہ کا کدال اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ وہ سر سے اوپر اٹھتا ہے پھر نیچے زمین پر چوٹ مارتا ہے پھر اٹھتا ہے پھر چوٹ مارتا ہے اور اسی طرح آسانی سے زمین تک اوپر نیچے آتا رہتا ہے۔

سورج آہستہ آہستہ اوپر آ گیا ہے۔ اس کا گولا آگ کی شکل اختیار کر گیا ہے، وہ ہوا کا دم گھونٹ رہا ہے، پیڑوں کی شاخوں پر اتر رہا ہے، ہر چیز کو ٹھوس سوکھی شے میں تبدیل کر رہا ہے ہر چیز اس آگ میں جھلس رہی ہے اور سوکھ رہی ہے، سوائے اس پسینے کے جو ذکیہ کے چہرے اور اس کے بدن سے کسی ندی کی طرح بہہ کر زمین پر گر رہا ہے۔ پسینے میں بھیگا اس کا چہرہ بھینس کے منہ کی طرح سرمئی ہو گیا ہے جو اپنے جوئے کے نیچے برابر ادھر ادھر چکر لگا رہی ہے۔

کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ سورج آہستہ آہستہ گھومتا ہوا زمین کے کنارے پر چلا گیا ہے۔ اس کے شعلے اس تیزی کے ساتھ اب نہیں جلا رہے ہیں۔ حدت کم ہو گئی ہے اور دریائے نیل کی طرف سے ہلکی ہلکی ہوا آنے لگی ہے۔ درختوں کی پھنگیں اس بیزاری کے ساتھ ہل رہی ہیں جیسے ان کا ہلنے کو جی نہ چاہ رہا ہو۔ ایک بار پھر آسمان نارنجی رنگ میں نہا گیا ہے۔ آہستہ آہستہ شام کا جھٹ پٹا ہونے لگا ہے۔ اس کے چہرہ کا پسینہ خشک ہو گیا ہے اور اس کی جگہ گرد کی تہہ جم گئی ہے جیسے بجھتی آگ پر راکھ جمی ہوئی ہو۔ وہ کدال ایک طرف پھینک دیتی ہے، کمر سیدھی کرتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ آس پاس ایسے دیکھتی ہے جیسے رات کو اچانک سوتے سے جاگ پڑی ہو۔ اپنی آستینیں نیچی کرتی ہے اور جلابیہ کا دامن کمر سے کھولتی ہے اور اسے پیروں پر گرا دیتی ہے۔ چادر سر پر ڈالتی ہے اور کھیت سے باہر نکل آتی ہے۔ چند لمحے بعد وہ پھر سایہ بنی اسی راستے پر چلے رہی ہے۔ انہیں مضبوط قدموں کے ساتھ۔ بھینس آہستہ آہستہ پیچھے آ رہی ہے۔ اب ہرے بھرے کھیت اس کے دائیں جانب ہیں اور نیل کا گدلا پانی بائیں جانب۔ دور کھڑے پیڑ دھندلا سایہ بن گئے

ہیں اور آسمان کو چھوتے نظر آ رہے ہیں۔ سورج زمین کے نیچے چلا گیا ہے اور اس کی قرمزی روشنی اب جھٹ پٹے کے ساتھ مقابلہ کرتی نظر نہیں آتی۔

دو سائے دریا کے کنارے کچے راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ اس کا سایہ ویسا ہی ہے۔ لمبا' سیدھا اور گردن تنی ہوئی۔ یہ سایہ ایسے بڑھ رہا ہے جیسے کہیں دھاوا بولنے جا رہا ہو۔ دوسرا سایہ بھی بالکل نہیں بدلا۔ وہ تھکا ہارا سست قدموں سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ وہ دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے ہیں۔ دو خاموش سائے گہرے پڑتے اندھیرے میں بڑھ رہے ہیں۔ اردگرد ساری دنیا میں کوئی چیز حرکت نہیں کر رہی ہے۔ کسی شخص کے بھی کراہنے' سسکیاں لینے یا رونے یا بولنے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ صرف خاموشی ہے جو ساکت رات میں اپنی چادر دور تک پھیلائے میدانوں' نیل کے پانیوں' سر پر تنے آسمان اور نیچے بچھی زمین پر پھیلا رہی ہے۔

آہستہ آہستہ کھیت پیچھے رہ جاتے ہیں اور جھونپڑے سامنے نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بے نشان جھونپڑے ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جڑے کھڑے ہیں جیسے دریا سے بچنے کے لئے ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں' جیسے انہیں ڈر ہو کہ انہوں نے ایک دوسرے کو سہارا نہ دیا تو وہ گرد میں ڈوبی نشیبی زمین کی طرف لڑھک جائیں گے۔

دونوں سائے نشیب میں ایک گڑھے کی طرف اترتے ہیں اور دبے پاؤں گھر کی طرف جاتے ہوئے تنگ گلیوں میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں بڑے پھاٹک کے سامنے رک جاتے ہیں۔ ذکیہ بھاری کواڑ کو زور سے دھکا دیتی ہے۔ وہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل جاتا ہے۔ وہ بھینس کی رسی گرا دیتی ہے۔ بھینس اندر آتی ہے اور اپنے تھان کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ پل بھر کے لئے اسے جاتا دیکھتی ہے اور پھر وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا منہ دروازے کی طرف ہے۔ وہ کھلے کواڑ سے گلی میں دیکھ سکتی ہے۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے جیسے سامنے کسی چیز کو دیکھ رہی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی نظر کھاد کے اس ڈھیر پر پڑ گئی ہے جو دروازے کے ساتھ پڑا ہے' یا اس نے بچے کی وہ غلاظت دیکھ لی ہے جو وہ سڑک پر بیٹھ کر کر گیا ہے' یا اسے وہ مکھیوں کا غول نظر آ رہا ہے جو مرے ہوئے پروانہ کے سر کے گرد جمع

ہے یا پھر گلی کے دوسری طرف بڑے پھاٹک پر گڑھی لوہے کی سلاخوں پر اس کی نظریں ٹک گئی ہیں۔

چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے' اب کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے' لیکن وہ اس وقت تک اسی طرح تاریکی میں نظریں گاڑے بیٹھی رہتی ہے جب تک اسے اپنے سر میں شدید درد کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ سر پر اور بھی زور سے چادر کس لیتی ہے لیکن درد اب پیٹ میں بھی پہنچ گیا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس ٹوکری کو ٹٹولتی ہے جس میں ہفتے بھر کا کھانا رکھا ہے۔ وہ ٹوکری قریب کرتی ہے' سختی سے بند ہونٹ کھولتی ہے اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے' سوکھا پنیر اور اچار منہ میں رکھنا شروع کر دیتی ہے۔

تھکن سے آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے سو جاتی ہے۔ اس کا سر گھٹنوں پر ٹکا ہے۔ اب تو کھلی آنکھوں سے بھی وہ اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ کفروی چپکے سے اندر آتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے۔ حالانکہ اس کی آنکھ کھل چکی ہے مگر اس نے اس سائے کو نہیں دیکھا جو مرد بن چکا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ پھر بچہ بن جاتا ہے۔ اب وہ بچی کی نظر سے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے گھر کے کچے آنگن میں پیٹ کے بل گھسٹ رہی ہے' وہ ہانپ رہی ہے' اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں' ناک اور کانوں میں گرد بھر رہی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی ننھی ننھی مٹھیوں سے آنکھیں ملتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی آنکھیں نہیں مل رہی ہے بلکہ اپنے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی ہے اور ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔ اچانک اسے جانور کے چار کالے کھر اپنی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا ہے۔ وہ اس کا کھر کا سیاہ ڈراؤنا اندرونی حصہ دیکھتی ہے جیسے کالا ہتھوڑا پوری طاقت کے ساتھ اس کے سر پر پڑنے والا ہو۔ اس کے سارے بدن میں جھرجھری پھیل جاتی ہے اور وہ چیخ مارتی ہے۔ دو مضبوط ہاتھ آگے بڑھتے ہیں اور اسے اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی بانہیں اپنے گرد محسوس کرتی ہے' ماں کے سینے کی گرمی اور اس کے جسم کی خوشبو اس کے نتھنوں میں بھرتی ہے اور اس کا ڈر جاتا رہتا ہے اور چیخ تھم جاتی ہے۔

اس ماں کا چہرہ یاد نہیں۔ چہرے کے نقوش اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو چکے ہیں۔ صرف اس کے جسم کی خوشبو اسے یاد ہے۔ اس خوشبو میں کوئی چیز ایسی ہے جس سے اسے

آٹے یا خمیر کی مہک یاد آ جاتی ہے اور جب بھی یہ مہک آتی ہے اس پر خوشی کا احساس چھا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرے پر نرمی اور ملائمت آ جاتی ہے لیکن یکدم پھر اس پر ہی سختی اور کرختگی طاری ہو جاتی ہے جو عمر بھر رہی ہے۔

جب وہ بڑی ہوئی اور اس نے چلنا سیکھ لیا تو اسے کفروی کے ساتھ کھیت پر جانے کی اجازت مل گئی۔ کفروی بھینس کی رسی پکڑے آگے آگے چلتا اور وہ پیچھے گدھے کے ساتھ چلتی جس پر کھاد لدی ہوتی۔ اس کا بھائی راستہ بھر خاموش رہتا۔ وہ اس کی آواز اس وقت سنتی جب وہ بھینس کو ٹخ ٹخ کر کے ہنکاتا یا گدھے کو ہاہا کر کے آگے بڑھاتا۔

اسے یاد ہے کہ اس کا باپ کھیت کے پاس کھڑا ہوتا مگر اس کا چہرہ اسے یاد نہیں۔ اس کی یادداشت میں پتلے پتلے دو پاؤں محفوظ رہ گئے ہیں جن کے گھٹنے آگے کو نکلے ہوتے تھے، کمر کے گرد جلابیہ بندھا ہوتا اور بڑا سا کدال ہاتھ میں ہوتا جو تساہل کے ساتھ ٹھیک ٹھیک زمین پر پڑتا ہوتا۔ اس کے دماغ میں رہٹ کی چرخ خوں گھومتی رہتی۔ پھر ایک دم وہ آواز بند ہو گئی۔ وہ بھینس کی طرف دیکھتی اور ٹخ ٹخ کر کے اسے چلانے کی کوشش کرتی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ کالا سر بے حس و حرکت کھڑا رہتا اور اس کی آنکھیں کسی جگہ جمی رہتیں۔

ذکیہ ٹخ ٹخ کرنے ہی والی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس جو بیٹھا ہے وہ بھینس نہیں ہے بلکہ کفروی ہے۔ وہ اس سے بہت ملتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اسی کی طرح تھے۔ اس کی آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں اور ان میں بھی غصہ بھرا رہتا تھا لیکن یہ غصہ دوسری قسم کا تھا۔ اس میں مایوسی اور دوسروں کے ہتک بھی شامل تھی۔

وہ اس کے ساتھ اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ گلی کے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں گلی کے دوسری طرف لوہے کی سلاخوں والے پھاٹک پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس کی طرف مڑا اور غصے بھری آواز میں سرگوشی کی۔

''لڑکی چلی گئی۔ ذکیہ وہ بھاگ گئی''۔

''بھاگ گئی؟'' اس نے شدید کرب کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں، چلی گئی پورے گاؤں میں اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔''

وہ گھبرایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے کفروی کو دیکھا۔ کفروی کی آنکھوں میں مایوسی کی گہری چھاپ تھی۔

''کفرالنین میں نفیسہ کا کہیں پتہ نہیں ہے ذکیہ۔'' اس نے کہا'' وہ غائب ہوگئی ہے۔اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا اور رونے کے انداز میں بولا'' وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ذکیہ' یا اللہ اب کیا ہوگا؟''

ذکیہ نے اپنی نظریں گلی میں گاڑ دیں پھر جذبات سے عاری انداز میں بولی۔'' ہم نے اسے بھی ایسے ہی کھو دیا جیسے جلال کو کھویا تھا''۔

اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور بڑبڑایا۔'' جلال کہیں نہیں گیا ذکیہ۔ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔''

''ہر روز تم یہی کہتے ہو کفروی۔تم جانتے ہو جلال مر چکا ہے تم مجھے تسلی دینے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہو۔''

''یہ تو کسی نے بھی ہمیں نہیں بتایا کہ وہ مر چکا ہے۔''

''ان میں سے بہت سے مر چکے ہیں کفروی۔ وہ کیسے بچا ہوگا۔''

''مگر کئی تو واپس آ گئے ہیں۔ ذرا صبر کرو اور اللہ سے دعا کرو وہ ضرور اسے واپس لائے گا۔''

''میں تو دعائیں مانگ مانگ کر تھک گئی۔'' وہ سسکی دباتے ہوئے بولی۔

''پھر دعا کرو۔ اللہ خیر وعافیت کے ساتھ اسے واپس لائے اور نفیسہ کو بھی لے آئے۔ وہ کہاں گئی ہوگی؟''

ان دونوں کی آوازیں درد سے کراہتے دو انسانوں کی آوازوں کی طرح اچانک خاموش ہوگئیں۔ان پر خاموشی چھا گئی ایسی خاموشی جو اردگرد پھیلے اندھیرے سے زیادہ گہری تھی۔ان کی آنکھیں لامحدود رات کی تاریکی میں جمی ہوئی تھیں۔کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا تھا۔ وہ ایسے بے حس وحرکت بیٹھے تھے جیسے مٹی کے دو جھونپڑے اندھیرے میں گڑے ہوں۔

MashalBooks.com

(2)

لوہے کا بڑا پھاٹک آہستہ آہستہ کھلتا ہے اور کفرالنین کا میئر باہر گلی میں آتا ہے۔ وہ بہت لمبا اور چوڑے چوڑے شانوں والا آدمی ہے جس کا چہرہ چپٹا بلکہ چوکور ہے۔ چہرے کا اوپر کا حصہ ماں پر گیا ہے۔ ملائم ریشمی بال اور چوڑے ماتھے کے نیچے سے جھانکتی نیلی آنکھیں۔ نچلا حصہ ملک کے جنوبی علاقے سے تعلق رکھتا ہے جو اسے باپ سے ملا ہے۔ چپٹی ناک پر بھاری بھاری کالی مونچھیں جن کے نیچے موٹے موٹے ہونٹ ہیں جن سے عیش پرستی کے ساتھ شہوانیت ٹپکتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے غرور اور تکبر ظاہر ہوتا ہے جیسے اس انگریز کی آنکھیں جسے حکمرانی کی عادت پڑ چکی ہو۔ اس کی آواز پھٹی ہوئی اور غیر مہذب ہے جیسے بالائی مصر کے کسان کی۔ لیکن اس کی آواز میں ایک قسم کی نرمی بھی ہے جو مصر اور ہندوستان جیسی نوآبادیوں میں رہنے والے لوگوں میں برسوں کا ظلم و تشدد برداشت کرتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھتا ہے۔ اس کی سیاہ عبا زمین تک لٹک رہی ہے۔ اس کے پیچھے گاؤں کی پولیس کا سربراہ اور مسجد کا امام ہے۔ وہ باہر آتے ہیں تو ان کی نظر دو سایوں پر پڑتی ہے جو گلی کے دوسری طرف اندھیرے میں بیٹھے ہیں۔ ان کے چہرے تو نظر نہیں آتے مگر وہ تینوں جانتے ہیں کہ وہ کفروی اور اس کی بہن ذکیہ ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہیں گے اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالیں گے۔ اگر وہاں دو کے بجائے ایک ہی سایہ ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کفروی کھیت میں رہ گیا ہے اور وہاں صبح سورج نکلنے تک کام کرے گا۔

یہ تینوں مغرب کی نماز کے لئے مسجد جاتے ہیں۔ واپسی پر وہ میئر کی چھت پر جا

بیٹھتے ہیں جہاں سے وہ دریا کا نظارہ کرتے ہیں یا پھر گاؤں کے حجام حاجی اسمٰعیل کی دکان پر چلے جاتے ہیں۔ دکان پر وہ حقہ پیتے ہیں اور دنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں۔

لیکن اس مرتبہ میئر نے حقہ پینے سے انکار کر دیا۔ اس نے جیب سے سگار نکالا اس کا سرا دانتوں سے کاٹ کر پھینکا اور ماچس سے اسے سلگایا۔ وہ سگار پی رہا تھا اور دوسرے اسے دیکھ رہے تھے۔

حاجی اسمٰعیل نے میئر کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ چپکے سے دوکان کے اندر گیا اور حشیش کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میئر کے ہاتھ میں سرکانے کی کوشش کی۔ میئر نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''نہیں۔ آج رات نہیں۔''

''کیا بات ہے صاحب؟'' اسمٰعیل نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

''تم نے وہ خبر نہیں سنی؟''

''کونسی خبر۔ یا حضرت؟''

''حکومت کے بارے میں خبر''

''کونسی حکومت جناب والا؟''

''حاجی اسمٰعیل تو پاگل تو نہیں ہوا ہے۔ ہماری کتنی حکومتیں ہیں؟''

''کئی حکومتیں ہیں جناب والا''

''کیا فضول بات کرتا ہے۔ ہماری ایک ہی حکومت ہے اور تو اسے جانتا ہے۔''

''آپ کس حکومت کی بات کر رہے ہیں؟ حکومت مصر کی یا حکومت کفرالنین کی؟''

''حکومتِ مصر کی''

''ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

اس پر پولیس کے سربراہ نے قہقہہ لگایا اور بولا ''اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم خود ہی حکومت ہیں۔''

اب شیخ حمزوی کے ہنسنے کی باری تھی۔ تمباکو سے لتھڑے اس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور اس کی تسبیح کے پیلے دانے تیزی کے ساتھ اس کی انگلیوں میں چل رہے تھے۔

لیکن میسٔر اس ہنسی میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے سگار منہ میں دبا کر ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور سامنے دریا کی پٹی اور دور تک پھیلے سرسبز کھیتوں کو دیکھنے لگا جو اب رات کے اندھیرے میں بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں ان کھیتوں کو کفرالنین اور کفرالدولہ کے درمیان پھیلا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گرمیوں میں جب اس علاقے میں جایا کرتا تھا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ کفرالنین میں آباد ہو جائے گا۔ اسے قاہرہ کی شہری زندگی زیادہ پسند تھی۔ پختہ سڑکوں پر جھلملاتی روشنیاں اور دریا کے کنارے کسینو کی روشنیاں پانی میں جگ مگ کرتی ہوئیں۔ نائٹ کلب لوگوں سے بھرے ہوئے۔ وہاں لوگ کھڑے ہیں پی رہے ہیں' عورتیں رقص کر رہی ہیں جسموں سے جسم مل رہے ہیں اور فضا میں ان کی پرفیوم کی خوشبو اور قہقہے بکھر رہے ہیں۔

اس وقت تک وہ کالج کا طالب علم تھا۔ لیکن اپنے بڑے بھائی کے برعکس اسے لیکچرز سے نفرت تھی' لیکچر روم سے نفرت تھی۔ وہ علم اور اپنے مستقبل کی باتوں سے نفرت کرتا تھا۔ سب سے زیادہ اس بات سے نفرت تھی کہ اس کا بھائی سیاست اور سیاسی گروہ بندیوں کے بارے میں بات کرتا تھا۔

اب تینوں خاموش تھے۔ اچانک اسمٰعیل کو صبح کا وہ اخبار یاد آیا جو وزن کرنے والی مشین کے ساتھ لکڑی کی بینچ پر بھول آیا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور اخبار اٹھا لایا۔ اس نے اخبار کھولا اور لالٹین کی روشنی میں اس کی بڑی بڑی سرخیاں پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کی توجہ اس تصویر کی طرف گئی جو صفحہ اول پر چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر صفحہ کے بیچ میں تھی۔ شکل جانی پہچانی تھی۔ پھر اس نے پہچان لیا کہ وہ تصویر میسٔر کے بڑے بھائی کی ہے۔ اس نے تصویر کے نیچے پڑھنے کی کوشش کی لیکن چھپائی بہت باریک تھی اس لئے وہ پڑھ نہیں سکا۔ وہ تھوڑا جھکا پھر میسٔر کے قریب جا کر نہایت آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

''آپ جس خبر کا ذکر کر رہے تھے اس کا تعلق آپ کے بھائی صاحب سے تو نہیں ہے؟''

میسٔر نے تھوڑا توقف کیا پھر بولا۔ ''ہاں''

اس پر اسمٰعیل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''کیا کوئی بری خبر ہے؟''

''نہیں، بری خبر نہیں ہے''

اب اسمٰعیل اپنی خوشی نہ چھپا سکا اور زور سے پوچھا۔ ''کیا وہ کسی اور بڑے

عہدے پر پہنچ گئے ہیں؟''

میسرؔ نے گاڑھا گاڑھا دھواں منہ سے نکالا اور بولا۔''ہاں' حاجی اسمٰعیل ایسا ہی ہے۔''

حاجی اسمٰعیل نے خوشی سے دونوں ہاتھ ملے اور دوسرے شخص کی طرف دیکھ کر بولا۔''پھر تو ہمیں اس خوشی میں شربت پینا چاہئے۔''

دوکان کے باہر بیٹھے لوگوں میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب اخبار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش کرنے لگا۔ حاجی اسمٰعیل دوکان کے اندر گیا اور شربت کی بوتل اور خالی گلاس لے آیا۔

لیکن میسرؔ کہیں اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ دن بھر وہ سوچتا رہا تھا کہ اخبار میں اپنے بھائی کی تصویر دیکھ کر اس کا دل کیوں بیٹھنے لگا تھا۔ وہ اپنے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ جب بھی کوئی اس قسم کی بات ہوتی تو اس کے منہ کا مزہ خراب ہو جاتا' حلق خشک ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی سینے میں جلن ہونے لگتی۔ ایک عجیب سا چبھتا ہوا درد پیٹ سے اٹھتا اور سارے جسم پر پھیلنے لگتا۔

پہلے پہل ایسا اس وقت ہوا تھا جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا۔ اسے یاد ہے کہ وہ اس وقت ایک دم غسل خانے کی طرف بھاگا تھا اور سارا کھایا الٹ دیا تھا۔ پھر واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح زرد ہو گیا تھا' ہونٹ سفید اور آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی۔ آنکھیں ایسی لگتیں جیسے ان کے اندر جان ہی نہیں ہے جیسے ان کی ساری جان کوئی لے گیا ہے۔ اور ان پر کالے کالے بادل چھا گئے ہیں۔

منہ اور چہرے کی کڑواہٹ دور کرنے کے لئے وہ بار بار منہ دھوتا اور دیر تک غسل خانے میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ آئینے کی طرف نظریں اٹھاتا تو اسے اپنے بھائی کا چہرہ نظر آتا۔ وہ اس کے گلابی گال اور چمک دار آنکھیں دیکھتا پھر اس کے کانوں میں بھائی کی فخریہ آواز آتی۔''میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں اس میں کامیاب ہوتا ہوں۔ تم ہمیشہ ناکام ہوتے ہو۔''

وہ منہ میں کلی بھر کر آئینے سے جھانکنے والے چہرے پر تھوک دیتا۔ پھر وہ اپنا سر اٹھاتا کندھے سیدھے کرتا اور زور سے کہتا۔''میں تم سے ہزار درجہ بہتر ہوں۔''

MashalBooks.com

غسل خانے سے نکلتے ہوئے اسے جو بھی دیکھتا وہ یہی کہہ سکتا تھا کہ دونوں بھائیوں میں وہ زیادہ کامیاب ہے۔اس کے گالوں پر سرخی واپس آ چکی ہوتی اور اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتیں۔منہ کی کڑواہٹ ختم ہوگئی ہوتی اور پھر اس کے قہقہے گونجنے لگتے۔ وہ اپنی ماں کو چھیڑتا جو آرام کرسی پر بیٹھی سویٹر بن رہی ہوتیں۔ان کے اون کا گولا وہ نیچے پھینک دیتا۔ماں کی غرور سے بھری نیلی آنکھیں غصے میں بھڑک اٹھتیں اور وہ انگریزی لہجے میں اسے ڈانٹتیں ''تمہارا بھائی تم سے کہیں اچھا ہے''۔اس کا اپنا غرور خاک میں مل جاتا۔ کبھی وہ سلائیاں ایک طرف رکھتی اور اخبار اٹھا کر اس میں چھپی ہوئی خبر کی طرف اشارہ کرتی۔''دیکھو۔تمہارا بھائی کتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے۔اور تم؟......''

اس کے قہقہے اچانک تھم جاتے جیسے اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔پھر وہ جواب دینے سے پہلے تھوک نگلتا۔پھر اسے خیال آتا کہ وہ اصل میں خوش نہیں ہے وہ تو زبردستی خوش ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔اپنے بھائی سے بہتر ہونے کا خیال محض ایک ڈرامہ ہے۔حقیقت اتنی تلخ ہے کہ اس نے اس کے جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ سچائی ٹھنڈے اور چپچپاتے اس پسینے کی طرح اس کے جسم کے ہر مسام سے پھوٹی پڑ رہی ہے جس پسینے میں وہ نہاتا جا رہا ہے۔اس کے منہ میں پھر کڑواہٹ گھلنے لگتی اور سینے میں پھر جلن ہونے لگتی۔وہ پھر غسل خانے کی طرف بھاگتا اور پیٹ میں رہا سہا بھی اگل دیتا۔

حاجی اسمٰعیل تانبے کے گلاس سے دوسری بار شربت پی رہا تھا کہ اس نے میسٹر کو حقارت سے زمین پر تھوکتے دیکھا اور اس کی نظریں غور کے ساتھ ان سب کے سروں کے اوپر دیکھنے لگیں۔جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ''میرے مقابلے میں تم سب حقیر فقیر ہو۔میں ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔میری ماں انگریز ہے۔اور میرا بھائی ان لوگوں میں شامل ہے جو ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔''

حاجی اسمٰعیل سکڑ کر بیٹھ گیا جیسی وہ اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کر لینا چاہتا ہو کہ اس پر میسٹر کی نظر ہی نہ پڑ سکے۔وہ تو میسٹر کو لطیفے سنانے والا تھا۔اس کے ساتھ مذاق کرنے والا تھا لیکن اب اس نے کچھ سوچا اور خاموش ہو گیا۔وہ کبھی تو اس تصویر کو دیکھتا جس میں میسٹر کا بھائی ملک کے صاحبِ اقتدار لوگوں میں بیٹھا ہوا تھا اور کبھی اپنی ٹوٹی پھوٹی دوکان کو دیکھتا جس کی ٹوٹی الماریاں گرد سے اٹی ہوئی تھیں اور زرد آلود ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں۔وہ اس

سے اپنے خیالات ہٹانا چاہتا تھا کہ اس کی نظر میئر کی قیمتی عبا پر پڑی پھر اس نے اپنا کھدر کا جلابیہ دیکھا اور سر نیہوڑا کے بیٹھ گیا۔

میئر کی نظر حاجی اسمٰعیل پر پڑی وہ شربت کا گلاس اپنے حلق سے اس طرح انڈیل رہا تھا جیسے کیسٹر آئل پی رہا ہو۔ اس نے قہقہہ لگایا اور اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا ''تم کسان شربت ایسے پیتے ہو جیسے ہم دوا پیتے ہیں۔''

میئر کی اس بے تکلفی اور مذاق نے حجام کا احساس کمتری دور کر دیا اور اس پر جو اداسی کا حملہ ہوا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اب وہ سوچ رہا تھا' دیکھو میئر میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم دونوں کے درمیان خوف کم ہو رہا ہے؟ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اس نے سوچا کہ اب اسے ہنسنا چاہئے تاکہ میئر اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کرتا رہے۔

''صاحب' ہم کسانوں کا کیا ہے۔ ہمیں تو میٹھے شربت اور کڑوی دوا میں تمیز کرنا بھی نہیں آتا۔'' اس نے مذاق کیا۔

میئر خاموش رہا جیسے وہ حجام کی بات پر غور کر رہا ہو۔ حاجی اسمٰعیل پریشان ہو گیا۔ کہیں میئر میری بات کو غلط تو نہیں سمجھا؟ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔'' جناب والا' میرا مطلب یہ ہے کہ کسانوں کے منہ میں تو ہر چیز کڑوی ہی ہو جاتی ہے۔''

میئر پھر بھی خاموش رہا۔ ضرور کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ حاجی اسمٰعیل نے سوچا کہ اس کے منہ سے بعض اوقات بہت غلط باتیں نکل جاتی ہیں۔ وہ بالکل احتیاط نہیں کرتا۔ اب جو اس نے کہا ہے کہ اس سے میئر یہ سمجھے گا کہ وہ کسانوں کی تکلیف دہ زندگی کا ذکر کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس سے وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتا ہے کہ اسمٰعیل حکومت کی شکایت کر رہا ہے کہ وہ کسانوں کی بھلائی کے لئے کام کرنے کا جو اعلان کرتی ہے وہ غلط ہے اور چونکہ کفرالنبین میں میئر ہی حکومت کا نمائندہ ہے اس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسانوں کو لوٹ رہا ہے اور ان سے جو محصول وغیرہ وصول کرتا ہے اور وہ اپنی عیاشی اور گلچھرے اڑانے پر صرف کر رہا ہے۔

اسمٰعیل کا سر چکرا گیا۔ اس نے اپنی حماقت کو کوسا۔ اسے کہاوت یاد آئی کہ ''اس نے سرمہ لگانے کے بجائے آنکھوں کو ہی اندھا کر دیا''

اب اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ میئر کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ لیکن

اسی وقت اس نے میئر کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھی ۔ وہ دریا کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک لڑکی جا رہی تھی ۔ اس نے سر پر مٹکا رکھا ہوا تھا جس سے اس کا جسم تیر کی طرح سیدھا اور اکڑا ہوا تھا۔ اس کا جسم جھومتا ہوا چل رہا تھا اور اس کی کالی آنکھوں میں وہ خود پسندی تھی جو میئر نے کفروی خاندان کی عورتوں میں دیکھی تھی ۔

میئر کا سر حاجی اسمٰعیل کے سر کے قریب آیا۔ ''یہ لڑکی نفیسہ کی طرح لگتی ہے۔''

حاجی اسمٰعیل نے فوراً جواب دیا۔ ''نفیسہ کی چھوٹی بہن ہے۔''

''اچھا' مجھے نہیں معلوم تھا کہ نفیسہ کی کوئی بہن بھی ہے۔''

''اسمٰعیل' سمجھ گیا کہ میئر کے دل میں کیا دھکڑ پکڑ ہو رہی ہے۔ اس نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔ ''ان میں سے ہر ایک دوسری سے بڑھ کر ہے۔''

میئر نے آنکھ ماری اور ہنسا ''مگر چھوٹی ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوتی ہے۔''

اسمٰعیل اب خوب زور سے ہنسا اس پر جو افسردگی طاری ہوئی تھی وہ بالکل دور ہو گئی ۔ اسے خیال آیا کہ بھائی کے بڑا وزیر بن جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ میئر کا رویہ تبدیل نہیں ہوگا۔ اب تو وہ میرے ساتھ ایسے ہی مذاق کر رہا ہے جیسے برابر کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں ۔

اس نے آنکھ مارتے ہوئے میئر کے کان میں سرگوشی کی ۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب والا' سب سے چھوٹی ہمیشہ زیادہ ذائقہ والی ہوتی ہے۔''

میئر خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں لمبے قد والی زینب پر لگی ہوئی تھیں جو دریا کے کنارے جا رہی تھی ۔ وہ اس کے گول گول مضبوط کولہے دیکھ رہا تھا جو لمبے جلابیہ میں سے ابھرے ہوئے تھے۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی نوکیلی چھاتیاں اوپر نیچے ہو رہی تھیں ۔ جلابیہ کے دامن کے نیچے سے دو گلابی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں ۔

میئر پیچھے مڑا اور پولیس افسر سے کہنے لگا ''خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کفروی اپنی لڑکیوں کو کیا کھلاتا ہے' ذرا دیکھو تو اس کی ایڑیوں سے خون ٹپکا پڑ رہا ہے''

پولیس افسر کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ وہ کافی دیر سے پریشان تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میئر اس سے ناراض ہے۔ اتنی دیر سے وہ حاجی اسمٰعیل سے ہی باتیں کئے جا رہا تھا۔ اب کچھ معاملہ ٹھیک ہوا تو اس کا اپنا موڈ بھی ٹھیک ہوگیا اور وہ خوشی خوشی باتیں کرنے لگا۔

''ظاہر ہے وہ چوری کرتا ہو گا۔ آپ اشارہ کیجئے پھر دیکھئے ہم کیسے اسے جیل پہنچاتے ہیں۔''

وہ افسرانہ شان سے کھڑا ہو گیا اور ڈرامائی انداز سے اپنا ہاتھ لہرایا۔ اب باقی دونوں بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شامل ہو گئے۔ شیخ حمزوی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ وہ منہ کھول کر ہنس رہا تھا اور اس کے گلے ہوئے دانتوں کی قطار منہ سے باہر نکل پڑ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں تسبیح پر تیز تیز چلنے لگی تھیں۔

میئر نے ہنسی کے یہ فوارے رکنے کا انتظار کیا پھر پولیس افسر سے کہا۔ ''نہیں شیخ زہران' کفروی چوری کرنے والا نہیں ہے۔''

اب شیخ حمزوی نے دخل دینا ضروری سمجھا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے قرآن یا حدیث سنا رہا ہو ''سارے ہی کسان چوری کرتے ہیں۔ بلھرزیا کے جراثیم کی طرح چوری ان کے خون میں شامل ہوتی ہے۔ وہ بیوقوف اور سادہ نظر آتے ہیں' وہ نمازیں بھی بہت پڑھتے ہیں' بڑے سجدے کرتے جیسے ان سے زیادہ عبادت گزار اور کوئی ہے ہی نہیں لیکن اندر سے وہ لعنتی' چالاک' ناپاک اور کافروں کے بچے ہی ہوتے ہیں۔ ایک آدمی میرے پیچھے نماز پڑھے گا لیکن مسجد سے نکلتے ہی وہ سیدھا کھیت پر جائے گا اور برابر کے کھیت سے چوری کرے گا اور رحم کئے بغیر کسی آدمی کے بھینسے کو زہر دیدے گا۔''

وہ خاموش ہوا اور میئر کی طرف دیکھا۔ اس یقین کے بعد کہ اس کی باتیں میئر پر اثر کر رہی ہیں اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''وہ تو قتل بھی کر سکتا ہے اور زنا کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے۔''

پولیس افسر نے اپنا دایاں پاؤں بائیں گھٹنے پر رکھا اور اپنے لباس کو اس طرح سنبھالا کہ اس کے نئے جوتے نمایاں ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گویا شیخ حمزوی پر یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کے شعبے میں دخل اندازی کر رہا ہے۔

''اگر قتل اور زنا کی بات ہے تو میرے پاس بڑی کہانیاں ہیں لیکن......'' اس نے مسکراتے ہوئے میئر کی طرف دیکھا'' حضور' آپ بتائیے ظاہر ہے آپ زیادہ جانتے ہیں......کیا مصر کے لوگ ایسے ہی ہیں جیسے کفرالنین کے لوگ؟''

شیخ حمزوی نے بلا وجہ دخل دیا۔ ''ہر جگہ لوگ بدکردار ہو گئے ہیں شیخ زہران...... چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی سچا مسلمان کہیں نہیں ملے گا۔ ان کا تو جیسے اب کوئی وجود ہی نہیں

رہا۔''

اس نے دیکھا کہ میئر کے ماتھے پر بل پڑ رہے ہیں تو جلدی سے بولا۔''ہاں اعلیٰ خاندانوں میں آپ کو اچھے اور شریف لوگ مل جائیں گے جیسے حضور میئر صاحب کا خاندان ہے۔''

اس نے جلدی سے قرآن کی کوئی آیت یاد کرنے کی کوشش کی جس سے وہ اپنی بات کی تصدیق کر سکے لیکن حقہ کے دھویں نے اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ خاموش نہیں رہا اور کہنے لگا۔''اللہ کا حکم ہے کہ ہر شخص کی نسل اور ذات کا پتہ لگانا چاہئے کیونکہ نسل اور خاندان کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ اثر انسان کی روح تک سرایت کر جاتا ہے۔''

میئر نے شیخ حمزوی کی طرف منہ کر کے اپنے موٹے ہونٹ پچکائے۔ عجیب آدمی ہے۔ کہاں زینب کی گلابی ایڑیوں کی بات ہو رہی تھی اور کہاں یہ شخص مذہب کی باتیں لے بیٹھا۔ وہ حاجی اسمٰعیل کی طرف دیکھ کر مسکرایا''تم گاؤں کے جراح اور حکیم ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ کفروی جیسے کالے کلوٹے انسان کے گھر یہ مکھن ملائی جیسی گوری گوری لڑکیاں کیسے پیدا ہو گئیں؟''

شیخ حمزوی نے پھر دخل دیا۔ وہ میئر کے ماتھے کے بل بھول چکا تھا۔''اللہ ایک برگزیدہ انسان کے بطن سے شیطان پیدا کر سکتا ہے۔''

میئر نے اسے نظر انداز کر دیا اور اسمٰعیل سے پھر مخاطب ہوا۔''تم نے نہیں بتایا' تمہارا کیا خیال ہے؟''

حجام ابھی تک جراح اور حکیم کے خطاب پر غور کر رہا تھا جو ابھی ابھی اسے میئر نے دیا تھا۔ اس کے لئے یہ ایسا ہی تھا جیسے اسے واقعی ڈاکٹر کی ڈگری مل گئی ہو۔ اور اپنے علاقے کے دوسرے ڈاکٹروں کے برابر ہو گیا ہو۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پلکیں جھکا کر سامنے دیکھنے لگا جیسے خیالوں میں گم ہو۔ اب اس کے چہرے پر واقعی ایسا تاثر تھا جیسے سچ مچ کا ڈاکٹر ہے اور وہ انسانوں کی زندگی کے راز جانتا ہے۔

''بخدا حضور والا' اللہ جانتا ہے کہ نفیسہ کی ماں جب پیٹ سے ہوگی تو وہ ملائی کے لئے تڑپتی ہوگی اسے ہر وقت ملائی کا خیال رہتا ہوگا۔ یا پھر کوئی گورا جن اس پر آ گیا ہو گا۔''

MashalBooks.com

یہ سن کر میسّر پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ہنس ہنس کے اس کا برا حال ہوگیا۔ اس نے سانس لینے کے لئے اپنا سر پیچھے کر لیا پھر پولیس افسر کی طرف دیکھا جیسے وہ اس سے مدد مانگ رہا ہو۔

پولیس افسر پھر خالص ڈرامائی انداز میں کھڑا ہوگیا اور بلند آواز میں بولا۔

''لڑکے۔ فوراً ہتھکڑیاں لاؤ۔ اس بدمعاش کو پکڑو اور جیل میں ڈال دو۔'' پھر اپنے جلابیہ کے گریبان میں تھوکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''یا اللہ' ہماری کسی بات سے وہ ناراض نہ ہو جائیں۔''

اب ہر شخص اس ہنسی میں شامل ہوگیا تھا۔ لیکن سب سے اونچی آواز شیخ حمزوی کی تھی جو سوچ رہا تھا کہ میسّر کو خوش کرنے کا یہی وقت ہے۔ اس کے لئے اسے خاص کوشش کرنا پڑے گی۔ اس نے جھک کر میسّر کے کان میں کہا۔'' حضور' سب جانتے ہیں کہ کفروی خاندان کی عورتوں کا دیدہ ہوائی ہے اور وہ بہت بے شرم اور بے حیا ہیں۔''

میسّر کھنکارا۔'' کیا ان کا دیدہ ہی ہوائی ہوگیا ہے یا کچھ بھی؟''

اس پر پھر قہقہوں کا طوفان ابل پڑا۔ یہ قہقہے دریا کے ساکت پانی تک پہنچ گئے جیسے کسی کو کسی کی پروا نہ ہو۔ اب وہ سب اپنی اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ اب میسّر کا مزاج بھی ٹھیک ہوگیا تھا۔ اخبار میں بھائی کی تصویر دیکھنے کے بعد اس کے دل پر جو بوجھ پڑ گیا تھا وہ اب اتر گیا تھا۔ اب اس سے توجہ ہٹانے کے لئے اسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے زور سے جماہی لی۔ اس کے سفید دانتوں کی قطار نمایاں ہوگئی۔ اس کے دانت لومڑی یا بھیڑیے کے سے تھے۔ اب جو وہ بولا تو گویا وہ حکم دے رہا تھا۔

''اچھا' اب چلو۔''

اور کھڑا ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی تینوں میں کھڑے ہوگئے۔

(3)

اس نے دریا کے کنارے پتھر اور سنگریزے اکٹھے کئے اور ان پر مٹی ڈال کر ہاتھ سے اسے ہموار کر دیا۔ پھر زمین پر ہاتھ رکھ کے وہ شہتوت کے درخت کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے گرم جسم سے تازہ تازہ مٹی چھو رہی تھی۔ درخت سے مرطوب ٹھنڈک اس کی دکھتی ہڈیوں اور درد کرتی پیٹھ میں اتر رہی تھی۔ اس نے اپنا ماتھا اور اپنا چہرہ پیڑ کی جڑ سے لگا دیا اور سوکھی زبان سے وہ رطوبت چاٹنے لگی۔

پیڑ کی گیلی جڑ نے اس کے دماغ میں پرانی یادیں جگا دیں۔ ایک بہت پرانی سنسنی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے نرم نرم سینے سے گرم گرم دودھ اسکے منہ میں آ رہا ہے۔ پسینے کا ایک قطرہ ماتھے سے ٹپک کر ناک پر آ گرا۔ اس نے آستین سے اسے صاف کیا پھر وہ آنکھیں پونچھنے لگی لیکن وہ خشک تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا ''امی' اللہ آپ پر رحم کرے۔''

اس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا۔ صبح کی روشنی اس کی سیاہ آنکھوں میں چمکی۔ اس نے کبھی اپنی آنکھ نیچی نہیں کی اور کبھی وہ زمین پر نظریں گاڑ کر نہیں چلی۔ اپنی پھوپھی ذکیہ کی طرح اس نے ہمیشہ فخر اور غصے کے ساتھ ہی دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بغاوت نہیں تھی۔ ان آنکھوں پر پریشانی کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے جیسے وہ کہیں کھو گئی ہے اور ڈرتی ہے کہ خدا جانے اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ اس کی نظریں آسمان کی وسعتوں میں گھومنے لگیں۔ وہ اس کی گہرائیوں میں ڈوبی جا رہی تھی۔ دور اسے افق نظر آ رہا تھا جہاں زمین اور آسمان مل رہے تھے۔ اس کے پیچھے سورج کی ٹکیہ آسمان پر بلند ہوئی اور اس نے کائنات پر اپنی نارنجی روشنی پھیلائی۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ

جاتی رات کی سردی کی وجہ سے ہے یا اس خوف سے کہ آگے کیا ہوگا۔ اس نے چادر اٹھائی اور روشنی سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اسکے سامنے دریا کا پانی ویسا ہی تھا اور اس کا کنارہ دور تک چلا جا رہا تھا جیسے وہ کہیں ختم نہیں ہوگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پیچھے بھی وہی سب کچھ تھا جو اس کے سامنے تھا کوئی بھی تو خوف نہیں تھا۔ وہی پانی اور دریا کا وہی کنارہ جو نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس لامحدود خلا میں کسی مقام پر وہ گاؤں ہے جسے وہ چھوڑ آئی ہے۔ اسے وہ ساری باتیں ایسے یاد آ رہی تھیں جیسے وہ وہاں پہنچ گئی ہے۔ جیسے وہ وہاں سے کہیں گئی ہی نہیں ہے۔ وہ مٹی کا جھونپڑہ جس میں وہ رہتی تھی اور جو ذکیہ پھوپھی کے گھر کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اور گھر کے سامنے گلی میں وہ بڑا سا لوہے کا پھاٹک جس کی سلاخیں اپنے پیچھے بہت بڑے محل کو للچائی ہوئی نظروں سے بچاتی تھیں۔

وہ پیٹ کے بل سرکتی ہوئی گرد سے بھری گلی میں چلتی پھرتی رہتی تھی۔ وہ سر اٹھاتی تو اسے وہ کالی سلاخیں لمبی لمبی ٹانگوں کی طرح دکھائی دیتیں اور اسے لگتا جیسے وہ اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہیں۔ جیسے وہ اسے اپنے نیچے کچل دینا چاہتی ہیں۔ وہ خوف سے چلاتی اور فوراً ہی دو مضبوط بازو اسے اپنی حفاظت میں لے لیتے۔ اسے اوپر اٹھا لیتے۔ وہ اپنا سر کالے کپڑوں میں چھپا لیتی۔ وہ کھردرے مگر جانے پہچانے کپڑے ہوتے اور ان سے آٹے یا خمیر کی مہک آ رہی ہوتی۔ وہ چھاتی کی طرف لپکتی تو اس کی ماں اس کے منہ میں کچھ رکھ دیتیں۔ وہ شہتوت ہوتا۔ پکا ہوا' رسیلا اور میٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے مگر وہ شہتوت کھاتی رہتی۔ شہتوت اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

بچپن سے ہی فولادی سلاخیں اسے ڈراتی تھیں۔ وہ سنتی کہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ان سلاخوں اور لوہے کے پھاٹک کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ کبھی اس پھاٹک کے قریب نہ جاتے۔ اس کے سامنے سے گزرتے تو گلی کے دوسری طرف سے گزرتے تاکہ اس کے قریب سے انہیں نہ گزرنا پڑے۔ پھاٹک کے سامنے وہ اپنی آوازیں بھی نیچی کر لیتے تھے۔ وہاں پہنچ کر ان کی آنکھوں سے غصہ اور بغاوت کے آثار بھی ختم ہو جاتے اور توکل اور قناعت ان کی جگہ لے لیتی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے وہ سر جھکا لیتے اور نظریں نیچی کر لیتے۔ اگر اس وقت کوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو اسے طیش یا بغاوت کا شائبہ تک نظر نہ آتا۔

جب اس نے چلنا شروع کر دیا تو وہ کھیت تک جانے لگی۔ وہ گدھے کے پیچھے

پیچھے چلتی یا پھر بھینس کی لمبی رسی کھینچتی چلی جاتی ۔ یہ دیکھتی رہتی کہ بھینس اس کے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں ۔ ہر روز وہ اپنے سر پر مٹی کا مٹکا اٹھاتی اور دریا کے اس کنارے پر جاتی جہاں دوسری لڑکیاں پانی بھر رہی ہوتیں ۔لیکن وہ لوہے کے پھاٹک کے سامنے سے جاتے ڈرتی تھی اس لئے وہ گلی کا پورا چکر لگا کر دوسری طرف سے دریا کی طرف نکلتی اور پھر پانی بھرتی ۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لوہے کے پھاٹک کے پیچھے بہت بڑا محل ہے جس کا مالک میسّر ہے ۔ اس محل کے اردگرد دور تک پھیلا ہوا باغ ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول اور طرح طرح کے پھل لگتے ہیں ۔لیکن نہ جانے کیوں وہ سوچتی تھی کہ اس پھاٹک کے پیچھے ایک دیو رہتا ہے' بہت ہی بھیانک دیو جس کی بیس فولادی ٹانگیں ہیں اور اگر اس نے احتیاط نہ کی تو وہ دیو اسے ٹانگوں میں لے کر کچل دے گا ۔

وہ بڑی ہوئی تو اس نے چکر لگا کر جانا بند کر دیا ۔ اب وہ سیدھے راستے سے ہی جاتی تھی ۔ حالانکہ اسے اس پھاٹک کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا ۔ اب وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اسے معلوم ہو گیا کہ پھاٹک کے پیچھے کوئی دیو نہیں رہتا بلکہ وہاں میسّر اور اس کے بیوی بچے رہتے ہیں ۔ پھر بھی اس کے سامنے جب بھی میسّر کا ذکر آتا اسے پھریری سی آ جاتی ۔ چند سال اور گزرنے کے بعد پھریری اب بھی آتی تھی لیکن اب وہ بدن کے اندر تک نہیں جاتی تھی ۔

لیکن ایک دن اس کے باپ نے اسے بتایا کہ کل صبح تیار ہو جانا ناشتے کے بعد تجھے میسّر کے گھر جانا ہے ۔ اس رات وہ ایک منٹ بھی نہ سو سکی ۔ اس وقت وہ بارہ برس کی تھی اور رات بھر اس کے دماغ میں یہی ہلچل مچی رہی کہ میسّر کے گھر کے کمرے کتنے بڑے بڑے ہوں گے ۔ محلے کے بچوں نے اسے بتایا تھا کہ میسّر کے گھر میں جو غسل خانے ہیں ان میں سفید سنگ مرمر لگا ہوا ہے ۔ انہوں نے بتایا تھا کہ میسّر ہر رات دودھ میں نہاتا ہے ۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں میسّر کی بیوی کو گھر میں ادھر ادھر چلتا پھرتا دیکھ رہی تھی ۔ اس کی جلد بالکل سفید تھی اور دودھیا رانیں بالکل ننگی تھیں ۔ کہتے ہیں ان کے بیٹے کا الگ اپنا کمرہ ہے جس میں بندوقیں' ٹینک' ہوائی جہاز بھرے ہوئے ہیں جنہیں وہ اڑاتا پھرتا ہے ۔ اس کی نظروں کے سامنے میسّر بھی بار بار آ رہا تھا ۔ اسی طرح جیسے اس نے ایک دن اسے دیکھا تھا ۔ سیاہ عبا پہنے اور اپنے ساتھ گاؤں کے کئی لوگوں کو لئے ۔ اسے یاد آیا کہ وہ جب بھی اسے دیکھتی تھی بھاگ کر کہیں چھپ جاتی تھی ۔

دوسرے دن آسمان پر سورج کی سرخ روشنی نمودار ہونے سے پہلے ہی وہ جاگ گئی۔ بال دھوئے' جھانوے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر صاف کیں' صاف ستھرا جلابیہ پہنا۔ سر پر کالی نقاب ڈالی اور شیخ زہران کا انتظار کرنے بیٹھ گئی جو اسے میسرؔ کے گھر لے جانے والا تھا۔لیکن جیسے ہی شیخ زہران نظر آیا وہ دوڑ کر تنور کے پیچھے چھپ گئی۔ وہ رو رہی تھی' چلا رہی تھی اور وہاں سے اٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سانس لینے کو رکی تو اس نے پولیس افسر کو کہتے سنا۔''ہمارے میسرؔ نہایت فیاض انسان ہیں اور ان کی بیگم نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ تجھے بیس پیاسترروزانہ ملیں گے۔تو تو بالکل ہی بیوقوف لڑکی ہے۔ اتنی بہت سی نعمتوں کو ٹھکرا رہی ہے۔تو کام کرنے کے بجائے بھوک اور غربت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے؟''

''میں اپنے باپ کے گھر میں کام کرتی ہوں شیخ زہران' میں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہوں۔''اس نے تنور کے پیچھے سے ہی سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔''میں کاہل نہیں ہوں۔مگر میں میسرؔ کے گھر جانا نہیں چاہتی۔''

پولیس افسر تنگ آ گیا اور اس نے اسے لے جانے کی کوشش ترک کر دی۔ ''ٹھیک ہے تم لوگوں کا جو جی چاہے کرو۔لگتا ہے تم اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں فائدہ سے اٹھانا نہیں چاہتے۔تمہاری تو قسمت میں ہی یہ لکھا ہے۔سینکڑوں لڑکیاں ایسی ہیں کہ اگر ذرا سا اشارہ بھی کیا جائے تو فوراً میسرؔ کے گھر کام کرنے کو تیار ہو جائیں گی۔مگر کفروی میسرؔ صاحب نے تیری لڑکی کو اس لئے چنا ہے کہ تو ان کے خیال میں ایماندار اور محنتی انسان ہے اور وہ تیرے اوپر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ذرا سوچ تو وہ سنیں گے تو انہیں کتنی تکلیف ہو گی کہ تیری بیٹی نے ان کے گھر جانے سے انکار کر دیا۔''

''میں تو تیار ہوں شیخ زہران' مگر آپ خود دیکھ رہے ہیں' لڑکی ہی نہیں مانتی۔'' کفروی بولا۔

''اس کا مطلب ہے تیرے گھر میں لڑکی فیصلہ کرتی ہے کہ کسے کیا کرنا ہے۔'' شیخ زہران غصے میں کھول رہا تھا۔

''نہیں نہیں' فیصلہ تو میں ہی کرتا ہوں مگر وہ بیوقوف نہیں مانتی تو میں کیا کروں۔؟''

''ہوں' تو کیا کرے؟ یہ سوال مرد کر رہا ہے؟'' شیخ زہران کا غصہ بڑھتا جا رہا

تھا۔ ''اسے مار۔ دیکھ کیا رہا ہے۔ جانتا نہیں عورت مار کھائے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔''

اب کفروی کو بھی طیش آ گیا۔ اس نے ڈانٹ لگائی ''نفیسہ باہر نکل کے آ۔ خیریت چاہتی ہے تو فوراً باہر آ جا۔'' نفیسہ نے اب بھی اس کی نہیں سنی۔ آخر وہ خود تنور کے اوپر پہنچا اور نفیسہ کے دو تین تھپڑ لگائے پھر اس کے بال پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اسے شیخ زہران کے حوالے کر دیا۔

اسکے کانوں میں زمین پر آہستہ آہستہ لکڑی کے پہیے چلنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو تھکا ہوا گدھا ایک گاڑی کھینچتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ اچانک گدھے نے سر اٹھایا اور لمبی سوگوار آواز میں رینکنا شروع کر دیا گاڑی اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اس نے گدھے کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے وہاں آنسو دکھائی دیئے۔ گاڑی پر بیٹھا آدمی اسے گھور رہا تھا اس لئے اس نے چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ لیکن اس آدمی کی شکل اس کے اپنے گاؤں کے کسی آدمی سے نہیں ملتی تھی اس لئے اسے تسلی ہوئی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ہی آواز دی۔ ''چاچا' آپ مجھے الرملہ تک لے چلیں گے؟'' اس کے ساتھ ہی وہ کھڑی بھی ہو گئی۔

اس آدمی نے اسے کھڑے دیکھا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اسے شک ہوا۔ لیکن اس لڑکی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ان آنکھوں میں اتنا غصہ اور اتنا غرور تھا کہ اس کا شک فوراً دور ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے بہت تھک گئی ہو لیکن اس نے اپنے آپ کو سیدھا رکھا ہوا تھا۔ گاڑی والے نے نہایت روکھے پن سے کہا...... ''بیٹھ جاؤ۔''

اس نے گاری کا بانس پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر چڑھ گئی۔ وہ اس آدمی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی نظریں سامنے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس شخص نے کنکھیوں سے اس کے پیٹ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''الرملہ اپنے میاں کے پاس جا رہی ہے؟''

اس نے پلکیں نہیں جھپکیں اور اسی انداز میں بولی۔ ''نہیں۔''

تھوڑی دیر وہ خاموش رہا اس کے بعد اس نے پھر حملہ کیا۔ ''اپنے میاں کو کفرالنین میں چھوڑ آئی ہے؟ اس نے اپنی نظریں راستے پر جمائے رکھیں اور پلک جھپکے بغیر جواب دیا۔ ''نہیں۔''

اب وہ سیدھا ہو کر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کے بڑے بڑے

کھردرے ہاتھ دیکھے جو اس کی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ کلائیاں ننگی تھیں۔ چوڑیاں تک نہیں تھیں ان میں۔ کسان کی بیٹی ہے جو کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر جب اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اسے ان آنکھوں میں کوئی نئی چیز نظر آئی۔ ایسی چیز جو سب کسان عورتوں کی آنکھوں میں نظر نہیں آتی۔ وہ صرف غصہ یا صرف غرور نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی تھا۔ ان دونوں سے زیادہ شدید اور ان دونوں سے زیادہ طاقت ور۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ میئر کے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ وہاں اس نے میئر کی بیٹی کو دیکھا جو غضب ناک نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس افسر کا ڈنڈا اس کی پیٹھ پر پڑا تھا اور وہ نیچے گر گیا تھا۔ اپنے بچپن میں وہ ہر وقت ان آنکھوں کے خواب ہی دیکھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خواہش نے اس کے ہوش و حواس پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے۔ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ یہ ایسی عجیب بات تھی' ایسی پاگل پن کی اور انہونی بات کہ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور تھوڑی دیر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے لڑکی نے کفرالنین یا الرملہ کی لڑکیوں کی طرح پلکیں نہیں جھکائیں اور نہ منہ دوسری طرف موڑا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں جو بات تھی وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ غصہ تھا' بغاوت تھی یا دونوں ہی تھے اس لئے اس نے راستے پر اپنی نظریں جما لیں۔ اس نے گدھے کی پیٹھ پر رسی کو ادھر سے ادھر کیا اور سوچنے لگا کہ یہ لڑکی بھاگی ہوئی نظر نہیں آتی اور ایسا بھی نہیں لگتا کہ وہ کسی سے ڈر رہی ہو۔

اس نے پھر چوری چوری اس لڑکی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس کے پیروں پر مٹی لگی تھی جو اب سوکھنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ اس نے پھر سوال کیا۔ ''کافی دور سے آ رہی ہو؟''

پگڈنڈی پر نظریں جمائے جمائے اس نے جواب دیا۔ ''ہاں''

اس کی تسلی نہیں ہوئی اس جواب سے اس لئے اس نے پھر پوچھا۔ ''رات بھر چلتی رہی ہو؟''

''ہاں''

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات بھر گرد آلود پگڈنڈیوں پر چلتی رہی ہے یا کھیتوں میں سے گزری ہے

MashalBooks.com

جہاں گیدڑ، بھیڑیے اور ڈاکو چھپے ہوتے ہیں۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سامنے پگڈنڈی کو ہی دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اس نے کچھ سوچ کر کہا ''رات میں چلنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔''

یہ بات اس نے اس انداز میں کہی جیسے وہ اسے ڈرانا چاہتا ہو۔ یہ کہہ کر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید وہ ڈر گئی ہو۔ لیکن وہ اسی طرف افق پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھی۔

''نہیں چچا، دن کے مقابلے میں رات زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔'' اس نے اسی طرح دور دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بچے کی طرح تھے جسے چھڑی سے پیٹا گیا ہو لیکن وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا ہو کہ اس کے چوٹ لگی ہے۔ وہ بالکل نہ رو رہا ہو۔ اسے اپنے سینے میں ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خوب روئے اور اس نے برسوں سے جو آنسو چھپا رکھے ہیں وہ خوب بہائے۔ وہ آنسو جو اس وقت سے اس نے اپنے سینے میں چھپا رکھے ہیں جب پولیس افسر نے چھڑی سے اسے خوب مارا تھا۔ اگر اس وقت وہ لڑکی اس کی طرف مڑ کر دیکھتی تو وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتا یا اگر وہ اس لڑکی کی آنکھوں میں تھوڑا سا بھی غم کا سایہ دیکھ لیتا یا وہ گاڑی کے ہچکولوں کے ساتھ جھولنے ہی لگتی تو اسے سکون سا ہوتا۔ لیکن اس نے پلکیں نہیں جھپکائیں اور نہ جھکولے لے کر وہ مسکرائی۔ اس نے تو مڑ کر اسے دیکھا بھی نہیں جیسے وہ اسے بالکل ہی بھول چکی ہو۔ کبھی وہ اس کی طرف دیکھتی تو لگتا کہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی ہے، کوئی بہت ہی اہم بات سوچ رہی ہے اور یہ شخص اس کے لئے مکھی کی بیٹ سے بھی زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ گاڑی والے نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تمباکو یا حشیش کا ایک ٹکڑا نکالا۔ ہوسکتا ہے وہ افیون ہی ہو۔ اس نے اسے منہ میں رکھا تو اسے کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی جلدی تھوک نگلا اور پھر سے کھانسنا شروع کر دیا جیسے وہ اپنے اندر سے وہ ساری بے عزتی باہر نکال پھینکنا چاہتا ہو جو برسوں سے اپنے دل میں لئے پھر رہا تھا۔ اس نے سر جھکا دیا جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کے لئے تو اصل احساس وہ بے عزتی کا احساس ہی ہے جو دن رات وہ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے۔

اس نے ہونٹ سختی کے ساتھ بند کئے اور غریب گدھے کو قمچی سے ایسے پیٹنا شروع کر دیا جیسے پولیس افسر کسی غریب لڑکے کو سڑک پر کھیلتا دیکھ کر پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اب

MashalBooks.com

وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد الرملہ پہنچ جائے اور اس نک چڑھی لڑکی سے اپنی جان چھڑائے۔

گاڑی پیچ دار پگڈنڈیوں پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ ایسے جھول رہی تھی کہ ڈر لگ رہا تھا کہیں اس کا کوئی پہیہ نہ نکل جائے۔ وہ بھاگتے ہوئے گدھے کی لمبی لمبی سانسوں کی آواز سن رہی تھی۔ کبھی لگتا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ گاڑی والے کی سانس ایک ہی رفتار سے چل رہی تھی۔ جیسے پہیوں کی دھک دھک' جو برابر گھومے جا رہے تھے۔ لڑکی کو اپنی پسلیوں اور اپنے پیٹ کے اندر بھی ایسی ہی دھک دھک سنائی دے رہی تھی جیسے وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ہوں۔

اس نے آسمان پر سورج کو اوپر آتے دیکھا۔ اس نے ہرے بھرے کھیتوں کو پیچھے جاتے اور دریا کے کنارے مٹی کے جھونپڑوں کو سامنے آتا دیکھا۔ وہ جھونپڑے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح چمٹے کھڑے تھے جیسے وہ مٹی کا ڈھیر ہوں۔ آہستہ آہستہ عورتیں نظر آنے لگیں جو سروں پر مٹکے رکھے دریا سے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف ہی آ رہی تھیں۔ اسے ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھروں میں بچے اٹھ گئے تھے اور گاؤں میں مکھیوں نے بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔ بھینسوں اور گایوں کی لمبی قطاریں بھی سامنے آنے لگیں جو دھول کے بادل اڑا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ مرد اور عورتیں تھیں جو آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ان کے کاندھوں پر کدال رکھے تھے اور وہ جمائیاں لے رہے تھے جیسے اس خیال سے ہی ان پر تھکن طاری ہونے لگی ہو کہ دن نکل آیا ہے اور شام تک انہیں محنت کرنا ہے۔

ایک پل کے لئے اسے محسوس ہوا کہ وہ تو ایسی جگہ پہنچ گئی ہے جہاں سے چلی تھی۔ وہ کفر النین پہنچ گئی ہے اس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لیکن اس کے ساتھ بیٹھے آدمی نے بیہودہ آواز میں اسے ڈانٹا۔ ''چلو اتر جاؤ یہاں''۔

''یہ الرملہ ہے چچا؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں'' گاڑی والے نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

اس نے گاڑی کے بانس کا سہارا لیا اور نیچے اترنے لگی۔ اس کے بوجھ سے گاڑی ایک طرف کو جھک گئی اور جیسے ہی اس کے پاؤں زمین پر لگے گاڑی سیدھی ہوگئی۔ اب گاڑی جیسے ہلکی ہوگئی تھی اس لئے تیزی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ گاڑی والے کا دل اب سکون سے دھڑک رہا تھا جیسے اس پر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے لڑکی کے قدموں کی

MashalBooks.com

آواز سنی اور گدھے پر قمچیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس کا جی چاہا کہ مڑ کر ایک بار اس لڑکی کو دیکھ لے مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے دور افق پر نظریں جمائیں اور گدھے کو پھر مارا۔ گدھے نے زور زور سے سانس لئے اور گاڑی پھر اسی رفتار سے چلنے لگی۔

نفیسہ نے گاڑی کو ہچکولے کھاتے دیکھا۔ اس نے گاڑی والے کی پیٹھ دیکھی۔ وہ دبلا پتلا آدمی تھا۔ اسے اپنا باپ یاد آ گیا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن اس کے پہیوں کی آواز آتی رہی۔ اس کے ساتھ گدھے کے ہانپنے کی آواز بھی آرہی تھی، کبھی کبھی اس آواز کے ساتھ کھانسی کی آواز بھی آتی تھی جیسے اس کا باپ جب حقہ پیتا تو زور زور سے کھانستا تھا۔

وہ مسجد کے پاس پہنچی تو دائیں کو مڑ گئی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وہ میدان تھا جو اسے ام صابر نے بتایا تھا۔ میدان کے پار کچا مکان تھا جس کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ دووازہ پر لکڑی کی ہی کنڈی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی پانی کا نل تھا۔ اس نے نل چلا کر پانی پیا اور ہاتھ منہ دھویا۔ پھر وہ دروازہ پر گئی اور آہستہ سے کنڈی کھٹ کھٹائی۔ اندر سے کسی عورت کی بازاری سی آواز آئی جیسے کفر النین کی ناچنے والی نفوسہ کی آواز۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' نفیسہ نے سرگوشی میں کہا۔

وہی بیہودہ آواز پھر آئی۔ ''میں کون؟''

''میں ہوں نفیسہ''

''کون نفیسہ؟'' اس عورت نے پھر کہا۔

اس نے اپنی ناک سے پسینہ کا قطرہ صاف کیا اور کہا۔ ''مجھے ام صابر چچی نے بھیجا ہے نفوسہ چچی۔'' اندر خاموشی چھا گئی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی اور دروازہ کے ساتھ اس کی سانسوں کی سرسراہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اب دروازہ خود بخود کھل گیا جیسے کسی ان دیکھے دیو نے کھول دیا ہو۔

وہ بت بنی کھڑی رہی۔ پھر اس نے اندر قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا پورا جسم کانپ رہا ہے۔

MashalBooks.com

(4)

مرغ کی بانگ سے پہلے ہی فتیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ یا اس نے محسوس نہیں کیا اس کی آنکھ تو پہلے ہی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا اس کا شوہر چت لیٹا ہے اور منہ کھولے خراٹے لے رہا ہے۔ اس کی سانس سے تمباکو کی بو آرہی تھی اور سینے سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے رات بھر اس میں بلغم بھرتا رہا ہو۔

اس نے اس کا کندھا ہلایا لیکن اس نے کروٹ لے لی اور اسکی طرف پیٹھ کر لی۔ وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا۔ مرغ کی بانگ خاموشی میں ایک بار پھر گونجی۔ اب اس نے اس کے کندھے پر زور سے تھپ تھپایا۔

''شیخ حمزوی نے آنکھیں کھول دیں مگر منہ کس کے بند کرلیا۔ وہ صبح ہی صبح اس عورت کے ساتھ جھگڑا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کچھ کہے بغیر ہی اٹھ بیٹھے۔ ان کی بیوی فتیحہ پہلی بیویوں سے بالکل مختلف تھی۔ پہلی بیویوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتیں یا ان کے ساتھ کوئی نامناسب بات کرلیتیں۔ یا کفر النین کے کسی مرد کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتیں۔ فتیحہ اب ان کا مقابلہ مرغ سے کر رہی تھی اور گویا کہہ رہی تھی کہ مرغا ان سے اچھا ہے جو اتنی صبح اٹھ جاتا ہے۔

لیکن انہیں اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کس کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے شادی کرلی تھی۔ اور پھر وہ ان کے ساتھ رہ رہی تھی حالانکہ حاجی اسمٰعیل کے تمام کشتے اور تمام طلائیں بے کار ثابت ہوچکی تھیں۔

پہلی بار انہوں نے فتیحہ کو دیکھا تھا' تو وہ حاجی اسمٰعیل کی دوکان کے باہر بیٹھے تھے۔ وہ سر پر مٹکا رکھے دریا سے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کا نازک بدن

دیکھا اور چپکے سے حاجی اسمٰعیل کے کان میں کہا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''فتحیہ' مسعود کی بیٹی۔'' حاجی اسمٰعیل نے جواب دیا۔

''اچھا...... اس کا باپ وہ غریب آدمی ہے...... پھر تو مجھے اپنا داماد بنا کر وہ بہت خوش ہوگا؟''

''شیخ حمزوی' آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''کیوں نہیں' میں نے تین شادیاں کی ہیں اور میرے کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا۔ مرنے سے پہلے مجھے بیٹا چاہئے۔''

''مگر وہ تو آپ کے پوتوں پوتیوں کے برابر ہے۔'' حاجی اسمٰعیل بولا۔'' پھر کیا پتہ پہلی بیویوں کی طرح اس کے بھی کوئی بچہ نہ ہو۔''

شیخ حمزوی نے سر جھکا لیا۔ مگر ان کی انگلیوں کے دانے کھٹا کھٹ گر رہے تھے جیسے وہ خود بخود چل رہے ہوں۔ حاجی اسمٰعیل انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔

''لگتا ہے اس لڑکی نے آپ کو پاگل کر دیا ہے۔''

شیخ حمزوی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرائے اور آنکھوں میں جوانی کی چمک بھر کر حجام کی طرف دیکھا۔ ''سچ ہے' اس کی نگاہوں نے میری روح تازی کر دی ہے' میں تو ایسی ہی لڑکی کے لئے مرتا رہا ہوں۔''

''لڑکی تو وہ ہے اور جوانی سے بھرپور بھی ہے۔ مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ آپ اسے اپنے قابو میں بھی رکھ سکیں گے؟ آپ سمجھتے ہیں، آپ کی عمر کا آدمی اسے قابو میں رکھ سکتا ہے؟''

''میں تو اسے بھی خوش کر دوں گا اور اس کے باپ کو بھی۔'' شیخ حمزوی نے تڑ سے جواب دیا'' آج کل تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی جیب میں کیا ہے۔''

''اگر عمر بڑھتی رہی اور اس نے آپ کو بیٹا نہ دیا تو آپ کیا کریں گے؟''

''اللہ بہت بڑا ہے حاجی اسمٰعیل' اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ مجھے ضرور طاقت بخشے گا۔''

حاجی اسمٰعیل نے زور کا قہقہہ لگایا'' یہ بات آپ کسی اور سے کہئے۔ مجھ سے نہیں کہہ سکتے۔ میرے سامنے تو آپ ہر وقت شکایت ہی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ آپ کو طاقت کیسے دے سکتا ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ......''

شیخ حمزوی نے اس کی بات کاٹ دی ''اللہ چاہے تو مردے میں جان ڈال سکتا ہے حاجی اسمٰعیل، پھر تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں ٹھیک ہوسکتا ہوں۔''

''مگر آپ میری بات کہاں مانتے ہیں۔ میں نے جو دوا آپ کو دی تھی اس کا استعمال بھی آپ نے نہیں کیا۔ آپ تو ڈاکٹروں کی بات مانتے ہیں اور انہیں خوب پیسے دیتے ہیں۔ شیخ صاحب اس بارے میں ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے۔ ان کی دوائیں بالکل بیکار ہیں۔ آپ میری بات کا اعتبار نہیں کرتے۔ اب آپ خود ہی اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔ اتنے پیسے بھی خرچ کر دیے اور ذرا سا بھی فائدہ نہیں ہوا۔ بتایے میں غلط کہہ رہا ہوں؟

''تم ٹھیک کہتے ہو حاجی اسمٰعیل لیکن انسان ٹھوکر کھا کر ہی سیکھتا ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں۔ سارے ڈاکٹر جاہل اور چور ہیں۔ اس گاؤں میں تم ہی ایسے ہو جو صحیح علاج کر سکتے ہو۔ آئندہ میں کسی اور سے علاج نہیں کراؤں گا۔ بس تم فتحیہ سے میری شادی کروا دو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ کیونکہ تم اس شخص کی مدد کرو گے جو اللہ کے گھر کی خدمت کرتا ہے اور اللہ کا کلام لوگوں تک پہنچاتا ہے۔''

حاجی اسمٰعیل بے ساختہ ہنس پڑا۔ ''اگر ہم اللہ کی رحمت کا انتظار کرتے تو میں اور میرے بچے اب تک مر چکے ہوتے۔''

''میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔'' شیخ حمزوی نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ہاں، میں جانتا ہوں آپ بہت سخی انسان ہیں اور آپ کا خاندان بھی بہت فیاض ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ آپ اللہ والے ہیں اس لئے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ باقی کام میں کر دوں گا۔ بس میں جو کہوں وہ کرتے جایئے۔ گرم پانی، نمک اور لیموں کا استعمال برابر جاری رکھئے۔ اپنے چراغ کا تیل ہر رات خرچ کر دیجئے دوسرے دن کے لئے بچا کر نہ رکھیئے۔ اس کے بعد تسبیح پر اللہ کے ننانوے ناموں کا ورد کیجئے۔ اس کا شکرادا کیجئے۔ پھر اپنی پہلی بیوی پر ۳۳ مرتبہ لعنت بھیجئے، کیونکہ جب پہلی بار آپ نے شادی کی تھی تو آپ کے اندر قوت مردانگی پوری موجود تھی۔ کیا خیال ہے شیخ صاحب؟''

شیخ حمزوی نے نہایت غم زدہ آواز میں جواب دیا۔ ''اس وقت میں گھوڑے کی طرف طاقت ور تھا۔''

''اس عورت نے آپ پر جادو کر دیا۔ میں جانتا ہوں اس کے لئے کس نے تعویذ تیار کیا تھا۔ وہ کفرالنین کا رہنے والا نہیں ہے۔لیکن میں اس کے جادو کا توڑ جانتا ہوں۔اب سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ میرے مشورے پر عمل کریں اللہ آپ پر اپنا کرم کرے گا۔''

شیخ حمزوی کی آواز اور بھی دھیمی ہوگئی۔''اچھا تو میں فتحیہ کے ساتھ سہاگ رات کب مناؤں گا؟''

''انشاءاللہ بہت جلد۔''

''کیا میرے بیٹا ہوسکتا ہے حاجی اسمٰعیل؟ مجھے تو ناممکن نظر آتا ہے۔''

''اللہ چاہے تو کوئی چیز بھی ناممکن نہیں رہتی۔آپ تو خود اللہ والے ہیں۔آپ کو تو زیادہ معلوم ہونا چاہئے آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

شیخ حمزوی کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے تیزی کے ساتھ گرنے لگے۔ ''الحمداللہ۔الحمداللہ......''

شیخ حمزوی نے دیوار کا سہارا لیا اور کھڑے ہو گئے۔الحمداللہ الحمداللہ کے ساتھ تسبیح کے دانے تیزی کے ساتھ گر رہے تھے۔انہوں نے اپنی کفتان ٹھیک کی اور جبہ اور دستار سنبھالی۔وہ گھر کے دروازے کی طرف بڑھے تو یوں لگا کہ ان کا دبلا پتلا جسم کسی بوجھ سے دہرا ہو رہا ہے۔انہوں نے فتحیہ کو آہستہ سے کراہتے سنا۔ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان دنوں فتحیہ کو کیا ہو گیا ہے۔وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔وہ پہلے کی طرح ان کے ساتھ جھگڑا بھی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی تھی۔اب وہ اپنی خالہ کے گھر جانے کی ضد بھی نہیں کرتی تھی۔ پہلے جب بھی وہ جانے کو کہتی شیخ صاحب اس سے ناراض ہو جاتے۔وہ اس کے گھر سے نکلنے کے ہی خلاف تھے۔انہوں نے فتحیہ کے باپ کو بھی سمجھایا تھا کہ شیخ حمزوی کی اہلیہ دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہے۔اس کا شوہر خدا کے کلام کی تبلیغ کرتا ہے اور گاؤں کے لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔ایسے شخص کی اہلیہ کا ہر ایک کے ساتھ ملنا جلنا ٹھیک نہیں ہے۔اسے تو اس گھر میں پورے عزت واحترام کے ساتھ رہنا چاہئے۔اس کے لئے گھر سے باہر نکلنے کے دو ہی مواقع ہیں۔ایک جب وہ اپنے والدین کے گھر سے اس گھر تک آئی اور دوسرا وہ جب وہ یہاں سے قبرستان لے جائی جائے گی۔اس کے علاوہ......

لیکن فتحیہ تنور کے پیچھے چھپ گئی تھی اور تمام کوششوں کے باوجود اس نے کسی کا بھی جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔

''اللہ نے تیری سن لی ہے۔ وہ تجھے کھیت کی چلچلاتی دھوپ سے، گرد وغبار اور جانوروں کے گوبر سے اور سوکھی روٹی اور اچار سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کے بجائے وہ تیرے سر پر سایہ دے رہا ہے۔ تو وہاں آرام سے رہے گی۔ تازہ روٹی اور گوشت کھائے گی۔ تو شیخ حمزوی کی اہلیہ بنے گی جو گاؤں کی جامع مسجد کے امام ہیں، جو اللہ والے ہیں اور جن کی عزت ہر جگہ کی جاتی ہے۔'' حاجی اسمٰعیل کا حلق پورا زور لگا کر چیخ رہا تھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ آس پاس کے سارے لوگ اس کی بات سن لیں اور جان لیں کہ کیا بات ہو رہی ہے۔

مگر فتحیہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی، وہ اسی طرح چھپی رہی۔

اب حاجی اسمٰعیل نے فتحیہ کے باپ کی طرف دیکھا اور غصہ میں سوال کیا۔

''اب کیا کیا جائے مسعود؟''

''آپ دیکھ رہے ہیں وہ نہیں مانتی۔''

''تمہارا مطلب ہے اس گھر میں لڑکی فیصلہ کرتی ہے۔''

''مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟'' باپ نے پریشان ہو کر کہا۔

''تم کیا کر سکتے ہو؟۔'' حاجی اسمٰعیل کو طیش آ گیا تھا۔ ''یہ مرد کہہ رہا ہے؟ مار واسے، میرے بھائی اسے خوب پیٹو۔ تم نہیں جانتے کہ عورت ڈنڈے سے ہی سیدھی ہوتی ہے؟''

مسعود پل بھر خاموش رہا پھر دہاڑا۔ ''فتحیہ نیچے آتی ہے یا نہیں؟''

کوئی جواب نہیں آیا تو وہ تنور پر چڑھ گیا۔ فتحیہ کی چوٹی پکڑ کر اسے خوب مارا۔ پھر اسے گھسیٹتا ہو نیچے لایا اور حاجی اسمٰعیل کے حوالے کر دیا پھر اسی روز فتحیہ کی شادی حمزوی کے ساتھ ہو گئی۔

شیخ حمزوی نے اپنا عصا زور سے پکڑا اور گھر کا دروازہ کھولا۔ فتحیہ نے کان کھڑے کر کے لاٹھی کی ٹک ٹک کو سنا جو باہر کی طرف جا رہی تھی۔ یہ آواز سننے کی اسے عادت پڑ چکی تھی۔ شادی کی رات سے اس کے کان یہی آواز سن رہے ہیں۔ وہ گدھے پر بیٹھ کر شیخ حمزوی کے گھر آئی تھی تو اس وقت بھی اس کے سر پر لپٹی موٹی چادر میں یہی آواز سوراخ کر رہی تھی۔ آج بھی وہ ٹک ٹک کی وہ آواز سن سکتی ہے جو گلی میں شیخ حمزوی کے

ساتھ چلتے ہوئے شادی کے دن اسے آ رہی تھی۔ وہ اس بوڑھی عوت کو نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس نے خود بھی اپنے آپ کو خوب چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس نے محسوس ضرور کیا۔ اس نے ایک جلن محسوس کی جو اس عورت کی کرخت انگلیاں اس کی رانوں میں چھوڑ گئی تھیں جو خود دیکھ رہی تھی۔ اس نے گرم گرم خون کی چپچپاہٹ بھی محسوس کی۔ اس نے صاف سفید تولیہ کو خون میں رنگا نہیں دیکھا اور نہ وہ زخم دیکھا جو اس عورت کے لمبے ناخنوں نے اس کے اندر لگا دیا تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے کنوار پن کا خون بہہ رہا ہے کیونکہ باہر عورتیں دف پر خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ وہ عورتوں کے خوش ہونے اور چلانے کی آوازیں سن رہی تھی اس نے چادر کے اندر ہاتھ کیا اور اپنے ماتھے اور ناک پر سے پسینہ پونچھنے کی کوشش کی لیکن پسینہ تھا کہ اس کے چہرے سے اس کی گردن پر اور گردن سے سینے اور پیٹھ پر بہا چلا جا رہا تھا۔ اس کے نیچے گدھے کی پیٹھ بھی پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ گدھے کی ریڑھ کی ہڈی اس کی رانوں کے درمیان دبی ہوئی تھی۔ وہ ہڈی کو اس زخم کے ساتھ لگتا محسوس کر رہی تھی جس میں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ اور طبلے کی ہر گیت کے ساتھ گدھے کی کمر اوپر نیچے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ جاتی۔ گرم گرم خون پسینے میں مل کر گدھے کی کھردری کھال پر گر رہا تھا جس سے اس کی رانیں گیلی ہوتی جا رہی تھیں۔

جب وہ اس گھر کے سامنے پہنچے جو اس بزرگ اور خدا ترس انسان کی ملکیت تھا جو اب اس کا شوہر بن چکا تھا تو انہوں نے اسے گدھے سے نیچے اتارا۔ اس کے لئے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور ان لوگوں کے بازوؤں میں گر گئی جو وہاں کھڑے تھے۔ اسے کپاس کی گٹھری کی طرح اٹھا کر اندر لے جایا گیا۔

سیلن اور بدبودار ہوا اس کے نتھنوں میں پہنچی۔ اسے احساس ہوا کہ اب وہ گلی سے گھر کے اندر داخل ہوگئی ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ راست باز اور خدا ترس لوگوں کے گھروں میں پاکیزگی اور نفاست کی خوشبو ہوتی ہے اس لئے اس نے اپنی ناک کو ہی برا بھلا کہا کہ وہ اللہ والے گھر میں بھی ایسے پاخانے کی بدبو سونگھ رہی ہے جسے کبھی صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے اندر کیا خرابی ہے لیکن اسے خیال تھا کہ اس کے بدن میں ہی کوئی ایسی چیز ہے جو ناپاک اور غلیظ ہے۔ ایک دن ام صابر اس کے گھر

آئی تھی اور اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے جسم کا ناپاک حصہ کاٹنے آئی ہے۔اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔اس وقت وہ چھ سال کی تھی۔

ام صابر اپنا کام کر کے چلی گئی تھی اور اسکی رانوں کے درمیان ایک زخم رہ گیا تھا۔اس زخم سے کئی دن خون رستا رہا تھا۔لیکن اس کے بعد اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں اب بھی کوئی ناپاک چیز موجود ہے ہر مہینے جب وہ کپڑوں سے ہوتی تو لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھتے جیسے اس کے اندر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہو۔

شیخ حمزوی سے اس کی شادی ہوگئی تب بھی ان دنوں میں وہ اس سے دور دور رہتے جیسے وہ کوڑھی ہو۔اگر غلطی سے ان کا ہاتھ اس کے بازو یا جسم کے کسی حصہ پر لگ جاتا تو وہ فوراً نعوذ باللہ کہہ کر الگ ہو جاتے۔پھر وہ غسل خانے میں جاتے۔پانچ مرتبہ اپنے ہاتھ دھوتے اور دوبارہ وضو کرتے کیونکہ اسے ہاتھ لگانے سے ان کا وضو ٹوٹ جاتا۔ان دنوں اسے قرآن پڑھنے یا اسے سننے کی بھی اجازت نہیں تھی۔پھر جیسے ہی وہ نہا لیتی اسے نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کی اجازت مل جاتی۔

ہر رات سونے سے پہلے شیخ حمزوی اسے جائے نماز پر بٹھاتے اور نماز پڑھنا سکھاتے۔وہ جو آیات تلاوت کرتے اس کے معنی اس کی سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ ان کے الفاظ بہت مشکل ہوتے۔وہ ان سے ان کا مطلب پوچھتی مگر وہ اسے ڈانٹتے اور کہتے کہ اللہ کا کلام زبانی یاد کرنے کے لئے ہے مطلب معلوم کرنے کے لئے نہیں۔چنانچہ اس نے انہیں حفظ کرنے کی کوشش کی۔شیخ حمزوی کی ہدایات اس کے کانوں میں گونجتی رہتیں۔

نماز پڑھنے کے خاص اصول وضوابط ہیں۔اس کا طریقہ ہے۔رکوع، قعود اور سجدہ، پھر بیٹھ کر التحیات پڑھنا۔اس کے علاوہ کچھ اور شرائط بھی ہیں جنہیں پورا کرنا ضروری ہے۔مردوں کو کمر سے نیچے گھٹنوں تک اپنا جسم ڈھانپنا چاہئے اور عورتوں کا ہاتھوں اور چہرہ کے سوا سارا جسم ڈھکا ہونا چاہئے۔تکبیر کے بعد آپ کو سیدھا کھڑا ہو جانا چاہئے۔اور اپنے سامنے دیکھنا چاہئے۔آپ کے پاؤں بالکل سیدھے ہونے چاہئیں۔مردوں کو تکبیر کے ساتھ اپنے ہاتھ کانوں تک لے جانا چاہئیں لیکن عورتوں کو اپنے ہاتھ صرف کاندھوں تک اٹھانا چاہئیں۔مردوں کو اپنے ہاتھ پیٹ سے سینے پر باندھنا چاہئیں۔پھر رکوع اور سجدے میں کیا پڑھنا چاہئے شیخ حمزوی اسے یاد کراتے۔وہ اسے یہ بھی بتاتے کہ کن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور کن باتوں سے نماز فسخ ہو جاتی ہے۔

MashalBooks.com

چنانچہ ہر شام فتحیہ نمازیں یاد کرتی۔ پھر نماز پڑھتی۔ اس کے بعد وہ آیتہ الکرسی اور دوسری دعائیں پڑھتی اس وقت تک اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے بھاری ہو جاتیں اور وہ سو جاتی۔

فتحیہ کے کان دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ گلی میں جاتے شیخ حمزوی کو ٹھک ٹھک سن رہی تھی۔ اگر شیخ صاحب کا پاؤں کسی چیز سے ٹکراتا تو فتحیہ کو اس کا بھی پتہ چل جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ دروازہ کے ساتھ کوئی مری ہوئی بلی یا خرگوش پڑا ہوتا یا کوئی پتھر رکھا ہوتا تو وہ اسے اپنی لاٹھی سے ہٹا دیتے۔ کبھی ان کا پاؤں اپنے کفتان میں پھنس جاتا اور وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے لڑکھڑا جاتے۔ ان کا جوتا سامنے پڑے غلاظت کے ڈھیر میں چلا جاتا۔ اس وقت غصے میں انکی تسبیح کے دانے اور تیزی کے ساتھ گرنے لگتے اور وہ لوگوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے۔

لیکن اس روز ان کا پاؤں ایک ایسے جسم سے ٹکرایا جو مردہ خرگوش تھا اور نہ مردہ بلی۔ وہ ہل رہا تھا' وہ زندہ تھا اور پھر بڑا بھی تھا۔ شیخ حمزوی ڈر گئے۔ انہیں خیال آیا کہ کوئی بھوت ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی انہیں رونے کی ہلکی سی آواز آئی۔ انہوں نے جھک کر دیکھا تو کمزور نظر کے باوجود انہیں ایک گلابی شکل دکھائی دی جس کی دو آنکھیں تھیں' بڑی بڑی کالی پلکیں تھیں اور کھلا ہوا منہ تھا جو جھٹکوں کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ کیا اللہ نے ان کی دعائیں سن لی ہیں؟ کیا حاجی اسمٰعیل کا تعویذ اپنا اثر دکھا رہا ہے؟ ایسا لگتا تھا جیسے یہ بچہ آسمان سے گرا ہو۔ بالکل حضرت عیسیٰ کی طرح جنہوں نے کنواری مریم کے بطن سے جنم لیا تھا اور اسی طرح پیڑ کے نیچے انہوں نے آرام کیا تھا۔

ان کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ اس کی ذات سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ الحمدللہ وہ بت بنے کھڑے رہے۔ ان کا لمبوترا چہرہ اور بھی لمبا دکھائی دے رہا تھا لیکن اب صاف نظر آنے لگا تھا۔ صبح کی زرد روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ان کی نظریں دھندلائی ہوتی تھیں اور ایک آنکھ کی پتلی پر سفید نشان تھا جو عجیب طرح چمک رہا تھا۔ عمر بھر تسبیح پھیر پھیر کے اس کے دانے گھس چکے تھے۔ لیکن آج پہلی بار شیخ حمزوی تسبیح پھیرنا بھول چکے تھے۔

اسی وقت پولیس افسر نے اپنی رات کی گشت ختم کی تھی اور وہ گھر واپس جا رہا تھا۔ اس نے شیخ حمزوی کو اپنے دروازے پر بت بنا کھڑے دیکھا۔ اس نے انہیں کبھی اس

MashalBooks.com

طرح کھڑا نہیں دیکھا تھا۔ اور ایسے منہ لٹکائے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے ان کے دو چہرے ہیں۔ اوپر کا چہرہ تو حمزوی کا ہی تھا لیکن نچلا چہرہ ان سے بالکل مشابہت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ وہ چہرہ تو کفرالنین کے کسی شخص بلکہ ساری دنیا کے کسی شخص سے بھی نہیں ملتا تھا' حالانکہ اس نے دنیا ہی کتنی دیکھی تھی۔ وہ انسان کا چہرہ تھا اور نہ کسی روح کا۔ وہ کسی دیو یا فرشتہ کا چہرہ ہوسکتا تھا یا پھر خدا کا چہرہ ہوسکتا تھا حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ خدا کا چہرہ کیسا ہوگا۔ وہ وہیں کھڑا ہوگیا۔ جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔ وہ عجیب شے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بھوت نما انسان جھکا اور اس نے اپنے پیروں میں سے کوئی چیز اٹھائی۔ اس کے اپنے ہاتھ لاٹھی پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے جو وہ گشت کے وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ قریب تھا کہ وہ لاٹھی اٹھا کر جھکے ہوئے جسم کے سر پر زور سے مارتا کہ اسے بھی گلابی چہرہ نظر آ گیا۔ اس چہرے کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے شیخ حمزوی کو کہتے سنا ''اللہ کی رحمت ہی ہمارا سہارا ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

''یہ کیا ہے شیخ حمزوی؟'' پولیس افسر زور سے چیخا۔

''آسمان سے فرشتہ اترا ہے۔'' شیخ حمزوی بڑبڑایا۔

''یہ شیطان کی اولاد بھی تو ہوسکتا ہے۔'' پولیس افسر بولا۔

شیخ حمزوی نے اسی انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں' یہ نعمت خداوندی ہے۔''

ابھی پولیس افسر بولنے بھی نہیں پایا تھا کہ دروازے میں سے فتحیہ کا سر نمودار ہوا۔ ''شیخ زہران آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا۔'' وہ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ ''یہ تحفہ ہے' یہ خدا کی رحمت ہے۔ صرف گناہ گار کو سزا ملنی چاہئے۔''

فتحیہ نے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھائے اور شیخ حمزوی کے ہاتھوں سے بچہ اچک لیا۔ شیخ حمزوی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوگیا۔ وہ اسی طرح وہاں کھڑے رہے۔ فتحیہ نے دروازہ بند کیا اور بچے کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ اسے اپنی چھاتیوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ان میں خون تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اس نے فوراً گریبان میں سے چھاتی نکالی اور بچے کے منہ میں دیدی۔ سفید سفید دودھ اس میں سے نکل رہا تھا۔ اس نے اپنی چادر بچے کے سر کے گرد خوب اچھی طرح لپیٹ دی۔

(5)

صبح کی نظر نہ آنے والی روشنی آسمان پر چھا رہی تھی تو شیخ حمزوی کی آواز ہوا میں گونجی۔ وہ آواز مٹی کے نیچے گھروں پر پھیلی، کچی دیواروں کے اندر داخل ہوئی، پھر تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں اتری جہاں گوبر اور غلاظت کے ڈھیر لگے تھے۔ اس کے بعد وہ پولیس افسر کے کانوں تک پہنچی جو اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن آج اس نے اپنے کپڑے نہیں اتارے تھے جیسے وہ ہر رات گشت سے واپس آنے کے بعد کپڑے اتار دیتا تھا۔ آج اس نے اپنی بیوی سے کچھ کھانے کو بھی نہیں مانگا تھا۔ اس نے اپنے چمڑے کے جوتے بھی اس طرح نہیں اتارے تھے جیسے وہ اپنے پاؤں سے بیڑیاں اتار کر پھینک رہا ہو اس کا ایک ایک جوتا دور کونے میں جا گرتا تھا۔

اس نے چٹائی پر آدھا لیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے جوتے ابھی تک پیروں میں تھے۔ وہ مونچھوں کے لمبے لمبے بال توڑنے لگا۔ جب بھی اسے کھیت میں یا دریا کے کنارے کوئی لاش پڑی ملتی اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا قاتل کون ہے تو وہ ایسا ہی کرتا۔ وہ سوچتا رہتا کہ کون شخص ہوسکتا ہے جس نے اس کے علاقے میں ایسی حرکت کی ہے۔

شیخ حمزوی کی آواز اس تک پہنچی تو اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ تھوڑے سے کھلے۔ جیسے وہ بتانا چاہتا ہو کہ کفرالنین میں ایک اہم واقعہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کی بیوی بول پڑی ''کفروی کی بیٹی نفیسہ بھاگ گئی۔ یہ بات اس نے جلدی سے کہی تھی اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ کو اس طرح جھٹکا دیا تھا جیسے اس کا شوہر جوتا اتارتا تو اپنے پاؤں کو جھٹکا دیتا تھا۔ اس کی پڑوسن نے رات اسے یہ خبر سنائی تھی۔ وہ رات بھر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ یہ بات اس کے سینے پر ایسے رکھی تھی جیسے وہ اس کا

MashalBooks.com

اپنا ہی مسئلہ ہو۔ اس خبر نے اسے پریشان بھی کیا تھا لیکن اسے ایک انجانی خوشی بھی ہوئی تھی۔ وہ رات بھر یہ سوچتی رہی تھی کہ صبح ہوتے ہی اپنے شوہر کو یہ خبر وہ خود سنائے گی۔ وہ بتائے گی کہ نفیسہ بھاگ گئی۔

شیخ زہران کے کانوں میں نفیسہ کے نام سے عجیب سی گونج پیدا ہوئی۔ اس کا دماغ ایک دم اس گلابی چہرے کے طرف چلا گیا جس کی بند آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اسے لگا کہ ایک پل کے لئے جیسے وہ بند آنکھیں کھل گئی ہیں اور لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانک رہی ہیں۔ یہ آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی ہیں۔ اس کے ہاتھ سے مونچھیں چھوٹ گئیں اور اس نے ایسے سانس لیا جیسے ڈوبتا ہوا آدمی پانی سے اوپر آنے کے بعد سانس لیتا ہے۔

''نفیسہ؟''

''ہاں نفیسہ'' بیوی نے کہا۔

فتیحہ ابھی تک دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ بچہ اس کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اس کا سر چادر کے نیچے تھا اور وہ دودھ پی رہی تھی۔ اگر اس کے کان دیوار کے ساتھ نہ لگے ہوتے تو اسے نفیسہ کے نام کی گونج سنائی نہ دیتی۔ اس نے ایک دم گہرا سانس لیا۔ جیسے وہ ڈوبنے سے بچ گئی ہو۔

''نفیسہ؟''

نفیسہ کا نام اندھیر کمروں میں گونجا' کچی دیواروں میں اس نے شگاف کیا۔ گوبر کے ڈھیروں میں اٹی تنگ گلیوں میں وہ اترا' ناہموار چھتوں پر پڑے کپاس' گوبر اور اپلوں پر سے ہوتا وہ مسجد کے مینار اور اوپر بنے ہلال تک اڑتا چلا تھا۔ اس سے پہلے وہ میئر کے گھر کی پکی دیواروں اور فولادی سلاخوں سے ٹکڑا رہا تھا۔ وہ میئر کے کانوں میں حمزوی کی اذان کی آواز کی طرح گونجا جیسے وہ اسے بلا رہا ہو اور وہ نیل کی گہری تہہ میں کائی کی طرح جا پڑا۔

میئر کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا طارق بیٹھا تھا۔ وہ حال ہی میں کالج میں داخل ہوا تھا اور گاؤں ان سے ملنے ملانے آیا ہوا تھا۔ اس نے یہ کہانی سنی تو اس کی آنکھوں میں وہی چمک آ گئی جو انیس سال کے لڑکوں میں کسی لڑکی کے جسم کا خیال کر کے آ جاتی ہے اور خاص طور پر

MashalBooks.com

اس وقت جب وہ ان کے لئے ممنوعہ بھی ہوں۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پچھلے ہفتے کالج کے غسل خانے میں ایک بچہ پڑا ملا تھا۔ اس سے ایک ہفتے پہلے ہم نے ایک لڑکی لڑکے کو لیکچر روم میں پیار کرتے ہوئے پکڑا۔ اب تو کفرالنین میں بھی یہ شروع ہو گیا ہے۔ کوئی عورت گاؤں کے شیخ کے گھر کے سامنے اپنا بچہ چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ ابو! اب تو لڑکیوں میں شرم وحیا ہی نہیں رہ گئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔'' میسّر نے جواب دیا ''عورتوں اور لڑکیوں نے جیسے شرم وحیا تو چھوڑ ہی دی ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی بیوی کی ننگی رانوں پر اچھلتی سی نظر ڈالی جو تنگ اسکرٹ پہنے بیٹھی تھی۔ بیوی نے غصے میں ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ لی اور بولی۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ مردوں کی شرم ختم ہوگئی ہے۔''

میسّر نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مرد تو ہمیشہ سے ہی بے شرم رہے ہیں۔ اب تو عورتیں بھی عزت لٹاتی پھر رہی ہیں۔ اصل تباہی کا سبب تو یہ ہے۔''

''تباہی کیسی؟ برابری کیوں نہیں؟ یا انصاف کیوں نہیں؟''

بیٹے نے اپنے لمبے گھنگریالے بالوں کو جھٹکا دیا اور غصے سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''نہیں امی، میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ لڑکیاں لڑکوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ لڑکیوں کے پاس ان کی سب سے قیمتی چیز شرم وحیا ہی تو ہوتی ہے۔''

میسّر کی بیوی نے اس پر طنزیہ قہقہہ لگایا بالکل ایسے جیسے کوٹھے کی کوئی دلالہ ایسے موقع پر قہقہہ لگاتی ہے ''سچ کہہ رہے ہو بیٹے؟ تو گویا اب تم بھی شیخ کی دستار باندھ کر اخلاق کا سبق دینے لگے۔ اس وقت تمہارا اخلاق اور آداب کہاں تھے جب تم نے پچھلے ہفتے میرے ہینڈ بیگ سے دس پاؤنڈ کا نوٹ چوری کیا تھا اور اس عورت کے گھر گئے تھے جسے میں پہلے ہی خوب جانتی ہوں! اس وقت تمہاری شرم وحیا کہاں تھی جب پچھلے سال تم نے نوکرانی سعدیہ کو پکڑ لیا تھا۔ اور میں نے مجبوراً اسے گھر سے نکال دیا تھا کہ کہیں اسکینڈل نہ بن جائے؟ تم جب گھر کی نوکرانیوں کی بے حرمتی کرتے ہو تو تمہارا اخلاق اور تمہاری شرم کہاں چلی جاتی ہے؟ اب تو حالت یہ ہو چکی ہے کہ میں گھر میں کسی لڑکی کو نوکر ہی نہیں رکھتی۔ مرد ہی رکھے جاتے ہیں اور پھر جب تم ٹیلی فون پر کھڑکی میں کھڑے ہو کر یا چھت پر چڑھ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو تو تمہاری شرم کدھر چلی جاتی ہے۔ یاد ہے ہمارے پڑوسی

مصدی نے تمہارے بارے میں کتنی بار شکایت کی ہے؟''

وہ بظاہر بیٹے سے بات کر رہی تھی مگر اس کی نظریں اپنے شوہر پر لگی ہوئی تھیں۔ بیٹے کو اندازہ ہو گیا کہ ماں باپ کے درمیان پھر جھگڑا ہونے والا ہے اس لئے اس نے جلدی سے پھر نفیسہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

''ابو آپ کا خیال ہے شیخ حمزوی بچے کو پال لیں گے؟''

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے'' میئر نے کہا۔ ''وہ اچھا آدمی ہے اور اس کے کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ اس کی بیوی بھی بچے کے لئے بہت بے چین تھی۔''

''پھر تو مسئلہ حل ہو گیا۔'' بیٹے نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''ابھی حل نہیں ہوا۔ کسان اس وقت تک خاموش نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ یہ معلوم نہیں کر لیں گے کہ اس بچے کا باپ کون ہے۔'' ماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اس حملے کے بعد وہ کھڑی ہو گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بیٹے نے نہیں دیکھا کہ باپ کی ٹھوڑی کے نیچے کھال لرزنے لگی ہے۔ میئر نے جلدی سے ٹھوڑی کھجانا شروع کر دی۔ اس کی نیلی آنکھیں ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ طویل خاموشی کے بعد وہ بولا ''سمجھ میں نہیں آتا کون آدمی ہو سکتا ہے اور پھر وہ کفرالنین کا ہی ہے یا کہیں اور کا۔ ویسے تو وہ یہیں کا ہو گا لیکن باہر سے بھی آ سکتا ہے۔''

'نفیسہ جیسی لڑکیاں باہر کے لوگوں کو کہاں جانتی ہیں۔'' بیٹے نے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔''

''آپ ان کسان لڑکیوں کو خوب جانتے ہیں۔ وہ اتنی سیدھی ہوتی ہیں۔''

''میرے خیال میں نفیسہ اتنی سیدھی بھی نہیں ہے۔ میں نے ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی جس کی آنکھوں میں اتنی بے حیائی ہو۔''

''ہاں، وہ تیز لڑکی تو ہے۔ لیکن وہ آدمی بھی بہت ہی چالاک معلوم ہوتا ہے۔''

میئر جلدی سے بول پڑا۔ ''اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ کفرالنین کا ہو گا۔ میں تمام آدمیوں کو جانتا ہوں میرے خیال میں کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے اور پھر ایسا کام کرنے کا حوصلہ تو کسی میں بھی نہیں ہو گا۔''

طارق لحہ بھر خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کفرالنین کے ان مردوں کے چہرے پھر گئے جنہیں وہ جانتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو کہتے سنا۔ ''تم اندازہ لگا سکتے

MashalBooks.com

ہو کون ہو سکتا ہے؟''

طارق کی نظروں کے سامنے پھر چہرے پھرنے لگے پھر اچانک ایک چہرہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یا پھر اس کی آنکھوں نے اتنے بہت سے چہروں میں اس چہرے کو پکڑ لیا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر کسی نے اس شخص کا نام لیا۔ ''الواؤ''۔ خدا جانے تمام چہروں میں سے یہی چہرہ اس کی نظروں میں کیوں آیا۔ اس نے نفیسہ کو الواؤ کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ الواؤ گاؤں کے مشرق میں رہتا تھا اور نفیسہ کا گھر اس سے دور مغربی حصے میں تھا۔ لیکن وہ جب بھی نفیسہ کے ساتھ کسی کے تعلق کا سوچتا اسی شخص کا چہرہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ وہ اس سے دو بدو صرف ایک بار ملا تھا۔ وہ اسے اکثر کاندھے پر کدال رکھے جاتا دیکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتا۔ کبھی کسی سے بات نہیں کرتا۔ کبھی کسی دوکان یا گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ راستے میں گزرتے ہوئے اگر کوئی مل جاتا' خواہ وہ پولیس افسر' امام مسجد یا میئر ہی ہوتا وہ سلام کرنے میں کبھی پہل نہ کرتا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی نے نفیسہ یا گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ اسے دیکھا ہے۔ اسے ہر روز کھیت میں ہل چلاتے یا کدال سے زمین کھودتے دیکھا جاتا تھا۔ جمعہ کے دن بھی جب سارا گاؤں شیخ حمزوی کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھ رہا ہوتا وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا ہوتا۔ مغرب کے بعد وہ اکثر دریا کے کنارے پانی بہتا دیکھتا رہتا یا پھر اونچے کھڑے پیڑوں کو تکتا رہتا۔ اگر اس کے قریب سے کوئی گزرتا اور سلام کرتا تو وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے وعلیکم السلام کہہ دیتا۔

طارق کے ہونٹ الواؤ کا نام لینے کے لئے لرزے۔ لیکن اگر کوئی پوچھ بیٹھتا کہ سارے گاؤں میں اسے الواؤ ہی ایسا کیوں نظر آیا تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس سے صرف ایک مرتبہ ملا تھا۔ لیکن اس ایک ملاقات میں اس نے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں زمین پر نہیں دیکھ رہی تھیں بلکہ اس کے آر پار دیکھ رہی تھیں اور ان میں وہ غرور تھا جو صرف نفیسہ کی آنکھوں میں تھا۔ اس وقت اسے وہ دن یاد آ گیا۔ ایک ثانیہ کے اندر اسے ان دونوں کے تعلق کا خیال آیا۔ تعلق نہیں ان کے درمیان گہرا رشتہ ہوگا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ رشتہ اس قسم کا ہوگا لیکن اسے یقین تھا کہ ان میں ضرور کوئی رشتہ ہے۔ یہ اس دن کی بات تھی پھر وہ اسے بھول بھال گیا۔

لیکن آج جب اس کے دماغ میں الواوٗ کا خیال آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ بعض چیزیں دماغ سے کبھی نہیں نکلتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں چاہے وہ خیال سمندر کے پانی کے ایک قطرے سے زیادہ بڑا نہ ہو یا وہ لامحدود وقت کے ایک مختصر سے لمحے میں ہی سامنے آیا ہو۔ چنانچہ اس کے باپ نے جب دوبارہ سوال کیا تو اس کے اندر سے آواز آئی ''الواوٗ''۔

اب اس کے باپ نے بھی الواوٗ کا نام لیا تو حیرت ہوئی کہ اس نے تو یہ نام زور سے نہیں لیا تھا۔ ابھی تو اسے اپنے دماغ میں الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا۔ اب اس کے باپ نے وہ نام لیا تو ہر چیز اس کی آنکھوں کے سامنے صاف ہو گئی۔ اب تک جو دھندلا واہمہ سا تھا وہ حقیقت بن گیا۔ اس کی آواز اس کے اندر سے اٹھی اور گونجتی ہوئی باہر نکلی۔

الواوٗ۔

میٹر نے بھی یہ نام زیادہ وضاحت سے لیا۔ اب وہ گویا پوری حقیقت بن گیا تھا۔

''الواوٗ'' اس نے کہا۔

لوہے کا پھاٹک کھلا اور تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ شیخ حمزوی، شیخ زہران اور حاجی اسمٰعیل۔ وہ آگے پیچھے قطار باندھے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہاں الواوٗ کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن وہ بھی چپکے چپکے الواوٗ الواوٗ ہی کہہ رہے تھے۔ پھر ان کی آوازیں پورے صحن میں گونج اٹھیں، سرخ اینٹوں کی اونچی دیوار پر چڑھ گئیں، ان کے گھروں میں پہنچ گئیں جہاں رات ک لالٹین جلانے سے پہلے یہ نام دہرایا گیا۔ وہ آوازیں چھتوں کے اوپر پھیل گئیں اور گلیوں اور سڑکوں پر ہوا کی طرح پھیلنے لگیں حتیٰ کہ سورج ڈوبنے سے پہلے سارے کرہ ارض پر رہی آوازیں گردش کر رہی تھیں۔

طارق چھت کے چھجے پر جھکا ہوا تھا۔ نیچے نیل کا پانی لال ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سورج دور افق میں ڈوب رہا ہے اور دریا کے کنارے بچے کھیل رہے ہیں۔ اس نے سنا کہ وہ بچے گھیرا بنا کر ناچ رہے ہیں اور گا رہے ہیں۔

اے ساربان اے ساربا
الواوٗ اور نفیسہ ہیں
نفیسہ اور الواوٗ ہیں
ہیں ٹوکری میں دونوں بند

اے ساربان' اے ساربان
ہے کیا نفیسہ کھیت میں
الواؤ اور نفیسہ ہیں
نفیسہ اور الواؤ ہیں
اے ساربان' اے ساربان

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ گھبرا کر اپنی ماں کی طرف مڑا جو اس کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''امی' کیا یہ سچ ہے وہ الواؤ ہی تھا؟''

''میں کیا جانوں؟'' ماں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ''اپنے باپ سے پوچھ۔''

MashalBooks.com

(6)

وہ جمعہ کا دن تھا اور سورج آگ کے گولے کی طرح کفروی کے سر پر چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سورج کی کرنوں کا لال لال رنگ بھرا ہوا تھا اور جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اس کا سر' گردن' سینہ اور رانیں پسینے میں تر تھیں۔ پسینہ اس کے ننگے پیروں کی طرف بہہ رہا تھا اور اسے سارا جسم چپ چپا تا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایسا گیلا گیلا ہو رہا تھا جیسے اس نے پیشاب کر دیا ہو۔ اس نے جلابیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنے جسم کو چھوا۔ اسے پسینے اور پیشاب میں فرق محسوس نہیں ہوا اور وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ اس کے اعصاب تنے ہوئے ہیں یا پرسکون ہیں۔ اسے تو ایسا لگا جیسے اسے اپنے ہاتھ پیروں پر قابو نہیں رہا ہے۔ اس کا جسم اس سے علیحدہ کوئی چیز بن چکا تھا جو اپنی مرضی سے حرکت کر رہا تھا۔ اپنی مرضی سے چل پھر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اس جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے جو کل تک اس کا ہی حصہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی روح جسم سے نکل کر کہیں اور اڑ رہی ہے اور پھر اس کے جسم میں کوئی اور روح داخل ہو گئی ہے۔

اس نے دیکھا کہ گرد میں بھرے پھٹی کھال والے اس کے پاؤں کھیت سے باہر آئے ہیں تو اسے حیرت ہوئی۔ اس کے پاؤں اپنے آپ کیسے چل رہے ہیں؟ اس نے پوری طاقت جمع کر کے ان پیروں کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کھیت سے باہر آ گئے اور اسے باڑے میں لے گئے جہاں اس وقت سورج کی آگ برساتی کرنیں نہیں پہنچ پائی ہیں۔

وہ باڑہ نہیں تھا بلکہ ایک سائبان تھا جو کھجور کے پتوں' مکئی کے ڈنڈوں اور بانسوں سے بنایا گیا تھا۔ اوپر مٹی کا لیپ کر دیا گیا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں مویشی اس

کے اندر باندھے جاتے تھے اور سردیوں کی راتوں میں کفروی اس کے اندر پناہ لیا کرتا تھا۔

بھینس پیر پھیلائے بیٹھی تھی جیسے وہ گرمیوں کی دوپہر میں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سوچتی آنکھیں اندھیری کچی دیواروں کو گھور رہی تھیں اور منہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی ان دیکھی چیز چبا رہی ہو۔ وہ جب بھی سانس اندر یا باہر لیتی تو سفید سفید جھاگ اس کے منہ کے اندر آتے جاتے نظر آتے۔

کفری کا جسم بھینس کے قریب جا کر گر گیا۔ اس کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں کچی دیواروں پر جم گئیں' اس نے اپنی پلکوں کے پٹھوں کو ڈھیلا چھوڑنے اور سونے کی کوشش کی لیکن وہ اسی طرح لگی رہیں اور کچی دیواروں کو دیکھتی رہیں۔ بھینس نے اسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر نمی کی تہہ سی تھی جیسے وہ آنسو جو ابھی پوری طرح بن نہیں پائے۔ اس نے اپنی گردن آگے بڑھائی حتیٰ کہ دونوں کے سر مل گئے۔ پھر اس نے کفروی کی گردن کو چاٹنا شروع کر دیا جیسے ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔ وہ پوچھنا چاہتی ہے تجھے کیا ہوا؟ اس نے اپنا سر اس کے سر پر رکھ دیا اپنی نم آنکھیں اس کی گردن سے صاف کیں اور اپنے ہونٹ اس کے کان کے پاس لے گیا۔ ''عزیزہ تجھے پتہ ہے' نفیسہ بھاگ گئی۔''

اب کفروی نے بھینس کو بتانا شروع کیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ لگتا تھا وہ اس کی باتیں سمجھ رہی ہے اور اسے جواب بھی دے رہی ہے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے کوئی نہ کوئی بھینس یا بھینسہ اس کے پاس رہا ہے کھیت میں یا گھر میں۔ اس نے ابھی چلنا بھی نہیں سیکھا تھا تو بھینس کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تھا وہ کونے میں بیٹھا رو رہا تھا اور بھینس اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ زور زور سے روتا' ایسا رونا جو بچے ہی جانتے ہیں کہ کیسے رویا جاتا ہے۔

جب اس نے گھٹنوں پر چلنا سیکھا تو سب سے پہلے وہ اس کی طرف ہی بڑھا تھا۔ اسے اب تک اپنے چہرے پر لگنے والے اس کے گیلے ہونٹ یاد ہیں۔ وہ دیکھتا کہ آہستہ آہستہ بھینس اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ پھر وہ اس کے قریب اس طرح آ کر کھڑی ہو گئی کہ اس کے تھن اس کے منہ کے اوپر آ گئے۔ دودھ سے بھرے کالے کالے تھن اس کے اوپر ہوتے اور اس کے نتھنوں میں دودھ کی خوشبو بھر جاتی۔ وہ گردن اوپر کرتا اور اپنا منہ

MashalBooks.com

تھن کے ساتھ لگا دیتا۔ پھر فوراً گرم گرم دودھ اس کے منہ میں بھرنے لگتا۔

اس نے بولنا شروع کیا تو سب سے پہلے اسی کا نام پکارا۔ اس کا نام عزیزہ ہے۔ وہ جب بھی اپنا نام سنتی وہ اپنا سر موڑ کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''کیا بات ہے کفروی؟'' ہر روز وہ نئے الفاظ سیکھتا اور ہر روز وہ اس طرح دیکھتی جیسے وہ بھی نئی بات کہہ رہی ہو۔ آہستہ آہستہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگے۔ ایک دن اس نے شکایت کی کہ وہ رہٹ میں جتی چکر لگا رہی تھی تو اس کے باپ نے اسے بھی ڈنڈے سے خوب پیٹا۔ اس روز اسے اپنے باپ پر بہت غصہ آیا اور اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس کے باپ نے اسی ڈنڈے سے اسے بھی مارا اور زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش کی لیکن اس نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور بھوکا ہی سو گیا۔

اس کی بیٹی نفیسہ چھوٹی تھی تو حیرت کرتی تھی کہ وہ بھینس کے ساتھ باتیں کر لیتا ہے۔ اس نے بتایا کہ بھینس بھی ہماری طرح باتیں کرتی ہے اور ہماری طرح سب سمجھتی ہے۔ نفیسہ بھینس سے بات کرنا نہیں سیکھ سکی لیکن کفروی اس سے باتیں کر رہا تھا تو وہ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ساری باتیں سمجھ رہی ہے۔ نفیسہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے باپ کی مونچھوں کے ساتھ کھیلتی اور باپ بھی اس کی ننھی ننھی انگلیاں اپنے منہ میں لے لیتا جیسے وہ انہیں کاٹ رہا ہو۔ وہ جب بھی اس کی انگلیاں اپنے منہ میں لیتا وہ کھل کھلا کر ہنستی اور اپنا ہاتھ کھینچ لیتی۔ لیکن ایک دن اس نے سچ مچ اس کی انگلی پر کاٹ لیا جیسے وہ اسے کھا جائے گا۔ وہ درد سے چلانے لگی اور ڈر کے مارے اس سے دور ہٹ گئی۔ اس کے بعد وہ اس سے ڈرنے لگی۔ خاص طور سے اس وقت بہت ڈر لگتا جب باپ کا چہرہ اچانک کالا ہو جاتا اور بھینس کی طرح لگنے لگتا۔ اسے بھینس سے بھی ڈر لگتا تھا۔ وہ اکثر بھینس کے ساتھ کھیلا کرتی۔ اس کی دم پکڑ کر کھینچتی لیکن کبھی کبھی بھینس کا چہرہ بدل جاتا بالکل اس کے باپ کی طرح۔ اس وقت اس کا منہ پرسکون اور شفقت بھرا نظر نہ آتا بلکہ ایسا لگتا جیسے وہ غصے میں بھری بیٹھی ہو۔ اس وقت اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایسا لگتا کہ ابھی وہ سینگ مار دے گی یا لات مارے گی۔ ایک بار اس نے اس کی ٹانگ پر کاٹ بھی لیا تھا۔

کفروی نے اپنا ماتھا بھینس کے دودھ سے بھرے تھنوں کے ساتھ رگڑا پھر اس نے خشکی سے چٹختا اپنا منہ کھولا اور کالا تھن اپنے منہ میں لے لیا۔ اسے اپنے پیٹ تک گرم گرم دودھ جاتا محسوس ہوا۔ اسے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ پھر اس نے دودھ کے

چند قطرے اپنی پلکوں پر بھی ڈالے۔ لیکن دودھ اس کے پیٹ کے نچلے اور رانوں کے بالائی حصے تک بہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی چیز بھر رہی ہے' کوئی چیز پھول رہی ہے' کھڑی ہو رہی ہے' کوئی ایسی چیز جو اس کے جسم کا حصہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ اسی طرح برقرار رہی۔ اس نے دیکھا کہ وہ چیز باہر نکلی ہے' اس کے جسم کی حدود کو توڑ کر اس کی مرضی کے خلاف باہر نکلی ہے۔ اسے اس پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ نرم نرم نتھنوں پر پہنچ گئی' نسوانی خوشبو میں سانس لیتی' جانی پہچانی نمی کو چاٹتی' اندرونی حدت میں سرایت کرتی وہ سکون کی کیفیت میں کھو گئی جیسے ابد میں یا جیسے موت میں کھو گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تازہ ہوا میں واپس آنے کی کوشش کی لیکن وہ روزن سختی کے ساتھ بند ہو گیا جیسے طاقت ور انگلیاں دم گھوٹنے پر تلی ہوں۔ اس شے نے مقابلہ کیا' جال میں پھنسے جانور کی طرح ہاتھ پاؤں مارے' پوری طاقت کے ساتھ وہ پھٹ پڑی مگر پھر تھک کر گر گئی جیسے تھکی پلکیں اپنے آپ کو گہری نیند کے حوالے کر دیتی ہیں۔

لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہولناک آواز میں کوئی چیخ رہا تھا۔ وہ کسی مرد یا عورت کی چیخ نہیں تھی' کوئی انسانی آواز نہیں تھی۔ وہ ایسی آواز بھی نہیں تھی جیسے کوئی کسی جانور کو مار رہا ہو وہ عجیب وغریب خوف ناک آواز تھی۔

یہ چیخ اس نے ایک بار پہلے بھی سنی تھی۔ بہت عرصے پہلے سنی تھی۔ اس وقت وہ کچے فرش پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اس کی ماں اکڑوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ چھلنی میں آٹا چھان رہی تھیں لیکن ان کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ پلک بھی نہیں جھپک رہی تھیں اور دوسری طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے بدن پر ان نگاہوں کو نرم ہاتھوں کی طرح محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اسے سہلا رہا ہو' پھر یکلخت اس نے ایک چیخ سنی۔ وہ آواز فضا کو چیرتی اوپر تک نکل گئی تھی۔ اس نے فوراً اپنی ماں کی آواز نہیں پہچانی لیکن اس کی نظریں خود بخود ماں کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کے چاروں طرف آٹا بکھرا ہوا تھا۔ ان کے اوپر بھی آٹا ہی تھا جس کا رنگ' لال ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' نظریں ابھی تک اس پر ہی جمی ہوئی تھیں لیکن ان نظروں میں وہ تاثر نہیں تھا جو اس سے پہلے تھا اور جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تو آنکھیں ہی کسی اور کی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں تو دروازے سے باہر چلی گئی ہیں اور جیسے ابھی واپس آ جائیں گی۔ اس نے اپنا رخ دروازہ کی طرف کر لیا۔

اس نے دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی جھریاں دیکھیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ اسے خوف ناک انداز میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں پھر آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ لیکن وہ اصل میں سو نہیں رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دو ہاتھوں نے اسے اوپر اٹھایا ہے اور وہ اسے لئے جا رہے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ آنکھیں کھول دے لیکن اسے ڈر لگا کہ وہی خوف ناک آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں گی اس لئے وہ خاموشی سے دو مضبوط بازوؤں میں پھنسا چلتا رہا۔ وہ اسے اٹھائے لئے جا رہے تھے۔ اس کا سر ایک سخت دیوار جیسے سینے کے ساتھ لگا ہوا تھا جس میں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے پاؤں ہوا میں لہرا رہے تھے اور کوئی انجانی مخلوق اونٹ کی طرح جھولتی ہوئی اسے اٹھا کر لئے جا رہی تھی۔

دوبارہ چیخ فضا کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔ وہ ایک دم اچھلا اور کچھ سوچے بغیر اس جانب دوڑا جدھر سے آواز آئی تھی۔ لگتا تھا آواز مکئی کے کھیت سے آئی ہے اور وہاں مکئی کے پودوں میں کچھ ہلچل بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب ہر طرف خاموشی تھی جیسے وہاں کچھ بھی نہیں ہوا جیسے کوئی آواز ہی نہیں آئی۔ خاموشی سورج کی آگ برساتی ان کرنوں کی طرح زمین پر بوجھ ڈال رہی تھی جو ہوا کی ذراسی لرزش سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹے دے رہی تھیں۔

قریب پہنچا تو مکئی کا کھیت اچانک اسی جگہ سے پھٹ گیا۔ اس شگاف میں اس نے دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی جھریاں دیکھیں جو نمودار ہوئیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ وہ ایسے غائب ہو گئیں جیسے زمین ان کے لئے پھٹ گئی ہو اور انہیں اپنے اندر چھپا لیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ پہچانتا وہ کیا چیز ہے زمین نے اسے اپنے اندر سمو لیا۔

اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ایڑیوں کو دیکھا اور اس جگہ کی طرف بڑھا جہاں کھیت میں شگاف پیدا ہوا تھا۔ اسے کسی بہت پرانے انجانے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ اس نے اپنے بڑھتے قدم روکنا چاہے اور پل بھر کو لگا کہ وہ واقعی رک گئے ہوں۔ لیکن پھر اس نے دیکھا کہ اس کے پیر تو اسی سست رفتار سے بڑھے جا رہے ہیں۔ اس چیز کو جاننے کے لئے جو آگے کہیں پوشیدہ ہے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے مکئی کے پودوں کو علیحدہ کیا۔ سامنے زمین پر لاش پڑی تھی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کے چاروں طرف زمین سرخ ہو رہی تھی۔ اسے اپنی ماں یاد آ گئیں۔ ان کی لاش بھی اسی طرح فرش پر پڑی تھی۔ ان کی بھی آنکھیں اسی طرح کھلی

ہوئی تھیں۔اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لئے اور نزدیک گیا تا کہ اچھی طرح دیکھ سکے لیکن مردوں کی طرح اس کے سر کے بال صاف تھے اور وہ اپنے بدن پر مردوں جیسا جلابیہ پہنے ہوئے تھی۔اس نے آنکھوں کو دیکھا تو وہ اس کی ماں کی آنکھیں نہیں تھیں بلکہ وہ تو کسی بھی ایسے انسان کی آنکھیں نہیں تھیں جسے وہ جانتا ہو۔ان اجنبی آنکھوں کو دیکھ کر وہ خوف سے پیچھے ہٹ گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس منظر سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپاتا پیچھے سے دو مضبوط بازو آگے بڑھے اور اسے دبوچ لیا۔ بہت سی آوازوں اور چیخوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا وہ پیچھے مڑا تو آوازیں بڑھ گئیں۔اس کے اردگرد چہرے ہی چہرے تھے اور آنکھیں اسے گھور رہی تھی کافی دیر کے بعد وہ چھوٹی آنکھوں کی جھریوں کو پہچان سکا وہ پولیس افسر شیخ زہران کی آنکھیں تھیں۔

MashalBooks.com

(7)

لگتا تھا ہر چیز بھاری اور سست قدموں سے حرکت کر رہی ہے۔ سورج کا لال گولا جیسے زمین کے کنارے سے نیچے گرنے سے پہلے سوچتے ہوئے اور دم گھونٹتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ گدھوں' گایوں اور بھینسوں کے ساتھ کسانوں کی سیاہ قطار تھکن بھری کاہلی کے ساتھ دھول میں اٹے راستے سے ہوتی سیال مادے کی طرح ان گلیوں میں بہنے لگی جو شام کے جھٹ پٹے میں گھرے جھونپڑوں کے باڑوں کی طرف جاتی تھیں۔ گندے دروازوں سے گوبر' کھاد' انسانی غلاظت اور گندھے ہوئے آٹے کی ملی جلی بو آ رہی تھی پھر رات ہونے سے پہلے ہی دریا کے کنارے ہر قسم کی چہل پہل ختم ہو گئی۔ اب انسان یا جانور کوئی بھی وہاں چلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن انسانی پیروں کی پانچ انگلیوں اور گدھوں' گایوں اور بھینسوں کے کھروں کے نشان ابھی نظر آ رہے تھے اور کچی زمین پر تازہ گوبر کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔

البتہ دریا کے کنارے پڑی لاش اب گرم نہیں تھی۔ دریا سے اٹھنے والی تازہ ہوا نرمی کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر رہی تھی اور اس نے اس کا پرانا گھسا پٹا لباس اٹھا دیا تھا اور اب اس شخص کی ننگی اور پھٹی ایڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں جو کبھی الواؤ کہلاتا تھا۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کے کپڑے اڑائے اور جسم کا نچلا حصہ کھل گیا۔ حاجی اسمٰعیل نے اپنی نیند بھری پلکیں اٹھا کر اوپر کو اٹھی وہ مضبوط مردانہ ٹانگ دیکھی جو بالوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں' وہ اب جاگ گیا تھا۔ ایکدم ایسے بیٹھ گیا جیسے اس کے سر پر کوئی پتھر پڑا ہو۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ سامنے دیکھتی تو بائیں آنکھ جیسے پیچھے دیکھتی اور جب اس کی دائیں آنکھ بائیں کو مڑتی تو بائیں آنکھ دائیں کو مڑ جاتی۔ وہ ماں کے پیٹ سے ہی بھینگی آنکھوں کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ اس کے لئے جیسے ہر چیز دو حصوں

MashalBooks.com

میں بٹی ہوئی تھی یا اکیلی چیز دو بن جاتی تھی۔ ایک آنکھ وہ چیز دیکھتی جو وہ دیکھنا چاہتا تو دوسری آنکھ اس کے قابو سے باہر ہو جاتی۔

وہ کھڑا ہوا' لاش کی طرف بڑھا اور کپڑا اٹھا کر اسے ڈھانپ دیا۔ اس کے ہاتھ بالوں بھری جلد اور اس کے نیچے پھولے پٹھوں سے چھو گئے تھے۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ وہ یکدم پیچھے ہٹا اور دریا کے کنارے وہاں پہنچ گیا جہاں پولیس افسر سو رہا تھا۔ پہلے وہ بھی وہیں لیٹا تھا۔ اس نے لیٹ کر پھر سے سونے کی کوشش کی لیکن جب بھی آنکھیں بند کرتا بالوں بھری ٹانگ اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ایک آنکھ ڈر کے مارے سامنے جمی ہوئی تھی تو دوسری آنکھ کی پتلی نیچے کہیں چھپ گئی تھی۔ اس کا ذہن اس زمانے میں چلا گیا جب وہ دس برس کا تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی یوسف اس سے زیادہ طاقت ور اور اس سے بڑا تھا۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر بال تھے اور اس کی رانیں ایسی تھیں جیسے جلد کے نیچے کوئی پھولی ہوئی چیز رکھی ہو۔ پہلی بار اس نے وہ رانیں دیکھی تھیں تو ڈر گیا تھا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن یوسف نے دروازہ پر اس کا راستہ روک لیا تھا۔ یوسف نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑ کر اسے اوندھا گرا دیا تھا اور پھر پیچھے سے اس کا جلابیہ اٹھا دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے اوپر ایک بھاری جسم کا بوجھ محسوس کیا تھا۔ اس کی ناک زمین کے ساتھ دب گئی تھی اور اس کے لئے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یوسف اٹھا تھا اور باہر چلا گیا تھا۔ وہ دن بھر اسی طرح وہاں پڑا رہا تھا اور جب اس کے باپ نے دوکان سے اسے آواز دی تھی تو ایسا بن گیا تھا جیسے سو رہا ہو۔ اس نے اپنے باپ کو ادھر آتے اور غصے میں اسے بار بار پکارتے سنا۔ اس نے جواب دینے کے لئے منہ بھی کھولا تھا مگر منہ سے کوئی آواز ہی نہیں نکلی تھی۔ پھر ایک بھاری گھونسا اس کے منہ پڑا تھا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکائے باپ کے ساتھ گلی کے نکڑ پر ان کی دوکان پر چلا گیا تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی الماریوں میں چائے' مسالے اور تمباکو کے ڈبے رکھے تھے۔

اس کے باپ نے اسے سکھایا تھا کہ پیاسٹر کیسے گنے جاتے ہیں اور پھر دراز میں رکھ کر انہیں تالا کیسے لگایا جاتا ہے۔ اس کے باپ نے اسے یہ بھی سکھایا کہ تمبا کو کیسے تولی جاتی ہے۔ ترازو کے ایک پلڑے میں وزن رکھا جاتا ہے اور دوسرے میں تمباکو اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ سوئی بالکل بیچ میں رہے کوئی پلڑا زیادہ نہ جھکے۔ شام کو دوکان بند کرنے سے پہلے وہ اسے اپنے پاس بٹھاتا اور انجیکشن لگانا اور پھوڑے میں چیرا لگانا سکھاتا۔

چھوٹی عید کے بعد اس کا باپ حج کرنے گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے لئے وہ دوکان، دانت نکالنے والے زنبور، تعویزوں کے لئے قرآن کی آیات، انجکشن کی سوئیاں، ختنہ کرنے کے لئے استرا اور آیوڈین کی شیشی چھوڑ گیا تھا مگر وہ شیشی کب کی خشک ہو چکی تھی۔

دریا کے کنارے لیٹے لیٹے اسے سر کے پیچھے درد محسوس ہوا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے سر پر کس کے باندھا اور سونے کی کوشش کی۔ اسی وقت اس نے بھوت کی طرح کسی شخص کو لاش کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے پولیس افسر کا کندھا تھپ تھپایا اور چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ ''شیخ زہران''

پولیس افسر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور چلایا۔ ''کون ہے؟''

کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے غور سے چاروں طرف دیکھا پھر لاش کے گرد چکر لگانا شروع کیا۔ وہ دریا کے کنارے اور مکئی کے کھیت کے پار نظریں دوڑاتا جاتا تھا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا تو وہ وہاں واپس آ گیا جہاں گاؤں کا حجام پلتھا مارے بیٹھا تھا۔ وہ یہاں سے بھی ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

''کیا تھا حاجی اسمٰعیل؟'' اس نے پوچھا۔

''میں قسم کھاتا ہوں میں نے آدمی دیکھا تھا۔''

''چل جانے دے۔ آرام سے سوجا۔ دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔''

''میں نے اسے لاش کے قریب دیکھا تھا۔''

''مگر لاش کون چوری کرے گا؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے اسے دیکھا تھا۔''

''تو پہچان سکتا ہے اسے؟''

''میں نے پوری طرح نہیں دیکھا تھا۔''

''الواؤ کا بھوت ہوگا جو اپنی لاش پر چکر لگا رہا ہوگا۔''

''بھوت؟ اس دنیا میں انسان ہی تو بھوت ہے۔''

اس نے اپنی ایک آنکھ سے پولیس افسر کو دیکھا اور نہایت بھولپن سے پوچھا ''کیا کسی بھوت نے الواؤ کو مارا ہے؟''

پولیس افسر نے جلدی سے جواب دیا۔ ''نہیں۔ اسے کفروی نے مارا ہے۔''

''کفروی تو چڑیا کا بچہ نہیں مار سکتا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔''

''عزت کا سوال ہو تو کوئی بھی قتل کر سکتا ہے۔''

''یہ بات آپ گاؤں کے لوگوں سے یا تفتیش کرنے والے افسر سے تو کہہ سکتے ہیں مجھ سے نہیں کہہ سکتے۔'' حاجی اسمٰعیل نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''میں جانتا ہوں اس بار آپ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر سچ سچ بتایئے اسے کس نے مارا ہے؟''

پولیس افسر نے ایک قہقہہ لگایا اور جمائی لیتے ہوئے کہا ''اللہ ہی جانتا ہے۔''

اسمٰعیل نے پھر اپنی ایک آنکھ سے اسے دیکھا۔ ''آپ سب کو اچھی طرح جانتے ہیں اور جس کا چاہئیں نام لے سکتے ہیں۔''

اب شیخ زہران نے بھولا منہ بنایا اور سوال کیا۔ ''تیرا اشارہ کس کی طرف ہے حاجی اسمٰعیل؟''

حاجی اسمٰعیل ہنسا۔ ''جو بھی ہو گا شہر سے افسر آ رہا ہے۔ کتے بھی اس کے ساتھ ہوں گے وہ خود ہی دیکھ لے گا''

''تمہارا خیال ہے کتے انسان سے زیادہ جانتے ہیں؟'' پولیس افسر نے طنز کیا۔ ''ہر ایک کہہ رہا ہے کفروی نے نفیسہ کی وجہ سے الواؤ کو قتل کیا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے لاش کے قریب جھکا ہوا بھی دیکھا ہے اس کے ہاتھ خون میں لت پت تھے۔''

حجام نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ واقعی شیطان کے باپ ہیں شیخ زہران''

''میں تو اس کا خادم ہوں وہ جو ہمیں حکم دیتا ہے'' اس نے بے پرواہی سے جماہی لی۔ ''بلکہ ہم سب اسی کے بندے ہیں۔''

''ہاں ہاں ہم خدا کے حکم کے ہی تابع ہیں۔''

''اصل بات تو یہ ہے کہ ہم سب خدا کے تابع فرمان ہیں۔ اس کے غلام ہیں خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ہم نماز پڑھتے ہیں تو خدا کے بندے ہوتے ہیں لیکن باقی اوقات میں ہم میئر کے غلام ہیں۔''

شیخ زہران نے حجام کے کان میں کھسر پھسر کی۔ ''تم جانتے ہو زینب کی وجہ سے

وہ رات بھر نہیں سو سکا میں نے زینب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مانتی ہی نہیں۔''

''کفروی اسے اکسا رہا ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے اسے شبہ تو نہیں ہوگیا ہے؟''

حجام بولا۔

پولیس افسر نے فوراً اس خیال کو رد کیا۔ ''نہیں نہیں' ایسا بالکل نہیں ہوسکتا۔ شبہ تو اس کو ہوتا ہے جس کے پاس دماغ ہو اور سوچ سکتا ہو۔ ان کسانوں کے پاس تو دماغ ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ بھینس برابر ہی ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نفیسہ کے جانے کے بعد کفروی کے گھر میں زینب کے سوا کام کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ میں اسے سمجھا رہا ہوں کہ میسرا اسے کام کرنے کے دس پاؤنڈ دے گا اور وہ ایسے عیش و آرام سے رہے گی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اسے صرف گھر کی صفائی وغیرہ کرنا ہوگی۔ وہ اپنا کام کرے اور چلی جائے۔ مگر وہ میری ایک نہیں سنتی۔ بہت ہی موٹے دماغ کی ہے۔''

''کفروی کی طرح اس کی بیٹی زینب بھی بہت ضدی ہے میں نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تو اڑیل ٹٹو ہے۔''

''حاجی اسمٰعیل بولا۔'' مگر کفرالنین میں اس جیسی خوبصورت اور باتمیز لڑکی بھی تو اور کوئی نہیں ہے۔''

شیخ زہران نے اپنی آواز اور دھیمی کی۔ ''عورتوں کے معاملے میں اس کا شوق بھی عجیب ہے۔ اگر اسے کوئی پسند آجائے تو پھر اسے بھولتا نہیں ہے۔ تم جانتے ہو وہ بھی خاصہ ضدی ہے۔ ایک بار کسی عورت پر اس کی نظر پڑ جائے پھر کچھ بھی ہو جائے وہ اسے ضرور حاصل کر کے رہتا ہے۔''

حاجی اسمٰعیل نے جماہی کے لئے بڑا سا منہ کھولا۔ ''ہاں صاحب'' کیوں نہ ہو۔ ان جیسے لوگ عرش معلیٰ پر رہتے ہیں ان کے لئے کوئی بھی چیز حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے۔''

''وہ تو زمین پر خدا بن کر چلتے ہیں۔''

''نہیں شیخ زہران وہ زمین پر نہیں چلتے ہیں کاروں میں سفر کرتے ہیں۔ زمین پر چلنا تو ہم لوگوں کا مقدر ہے۔''

''صرف زمین پر چلنا نہیں حاجی اسمٰعیل ہم تو سوتے بھی زمین پر ہیں۔''

اپنی عبا میں سر چھپانے سے پہلے دریا کے کنارے پڑی لاش پر ایک نظر اور ڈالی۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ ''کتنے شرم کی بات ہے ابھی الواؤ کے مرنے کی عمر تو نہیں تھی۔''

پولیس افسر نے اس کی بات سنی اور لمبا سانس لے کر بولا۔ ''ہم سب کی زندگیاں خدا کے ہاتھ میں ہیں حاجی اسمٰعیل۔''

''سچ کہتے ہیں آپ' یہ فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہی ہے کہ ہم میں سے کسے وہ کب دنیا سے اٹھالے۔''

اس طرح وہ یہ طے کر کے سو گئے کہ کفرالنین کے لوگوں کی زندگی اس خداوند کے ہاتھوں میں ہے جو ہر وقت وہاں موجود رہتا ہے...... انہوں نے کئی شامیں حجام کی دوکان میں یا دریائے نیل کی طرف کھلنے والی چھت پر اس کے ساتھ باتیں کرتے گزاری تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ زینب کو حاصل کرنے کے لئے مرا جا رہا ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ ضرور زینب کو حاصل کر لے گا کیونکہ تمام خداوندوں کی طرح اس نے ناممکن کا لفظ کبھی نہیں سنا۔

ان کے خراٹوں کی آواز دریا کے اس کنارے سے ابھر رہی تھی جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے۔ وہ آواز شیخ متولی تک بھی جا رہی تھی جو مکئی کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ متولی کھیت سے باہر نکلا اور لاش کی طرف بڑھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اپنے دائیں پاؤں پر زیادہ بوجھ ڈال رہا تھا۔ اس کا چلنے کا خاص انداز تھا جو کفرالنین کے لوگ خوب جانتے تھے۔ وہ لنگڑے کتے کی طرح چلتا۔ اس کے اندر یہ خرابی پیدائشی تھی۔ ایک پاؤں اس کا چھوٹا رہ گیا تھا۔

وہ دریا کے کنارے پر آیا۔ اس کے سر پر چاند کی روشنی پڑ رہی تھی اور اس کا سر جسم سے بڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھولے ہوئے گالوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور موٹے ہونٹ باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور منہ سے رال نکل کر لمبی داڑھی پر گر رہی تھی۔

اگر اس وقت گاؤں کے بچے اسے دیکھ لیتے تو اس کے پیچھے پاگل پاگل کہہ کر بھاگتے۔ کوئی اس کے پتھر مارتا اور کوئی اس کا جلابیہ پکڑ کر کھینچتا۔ لیکن وہ ان کی پروا کئے بغیر لنگڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہتا۔ لوگ اسے گلیوں میں بے کار گھومتا دیکھتے تھے۔ اس کے منہ سے رال نکل رہی ہوتی اور وہ خالی خالی آنکھوں سے سب کو دیکھتا ہوتا۔

شام کو لوگ اسے دریا کے کنارے قبرستان کے پاس بیٹھا دیکھتے۔ وہ زور زور سے اپنے جسم کو کھجاتا ہوتا اور ناخنوں میں دبا کر مارنے سے پہلے کوئی جوں چٹکی میں پکڑے

بیٹھا اسے دیکھ رہا ہوتا۔

گاؤں کی عورتیں اسکے پاس سے گزرتیں تو روٹی یا شہتوت وغیرہ اسکی جھولی میں ڈال دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی عورت اس کے پاس ٹھہر جاتی اور اس سے کہتی۔ ''ہمارے لئے دعا کرو شیخ متولی۔'' اس پر وہ جوں مارنا بھول جاتا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا۔ پھر عورت کے جسم کا جو بھی حصہ اس کے ہاتھ میں آجاتا اسے پکڑ لیتا۔ اسے زور سے دباتا اور الٹے سیدھے الفاظ منہ سے نکالتا۔ اس کے ہونٹوں سے رال برابر ٹپکتی رہتی۔

حاجی اسمٰعیل اسے مجذوب کہتا پولیس آفسر آوارہ اور بچے پاگل کہتے تھے۔ ویسے وہ شیخ عثمان کا بیٹا تھا۔ شیخ عثمان قبر پر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ شیخ عثمان مر گئے اور اپنے بیٹے کے لئے پھٹا ہوا کفتان اپنی دستار، روٹی کی چنگیر اور پرانا قرآن چھوڑ گئے تھے جس کے ورق پھٹے ہوئے تھے۔

اب وہ چلتے ہوئے اتنا نہیں لنگڑا رہا تھا جتنا وہ لوگوں کے سامنے لنگڑاتا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جو نظریں لوگوں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ چلتے ہوئے وہ ہوشیاری کے ساتھ اپنے پیچھے بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اب اس کا نچلا ہونٹ بھی نہیں لٹکا ہوا تھا اور رال بہنا بھی بند ہوگئی تھی۔ اس وقت اگر گاؤں کا کوئی آدمی اسے دیکھتا تو پہچان نہیں سکتا۔

وہ اس لاش کی طرف بڑھ رہا تھا جو دریا کے کنارے عبا میں لپٹی پڑی تھی۔ لاش سے تھوڑے فاصلے پر وہ پیٹ کے بل زمین پر گر گیا اور زمین پر گھسٹنا شروع کیا۔ لاش کے پیروں کے پاس پہنچ کر اس نے کپڑا اٹھایا اور اپنا سر عبا کے اندر کر دیا۔ پھر اوپر سرکتا چلا گیا۔

اس وقت اگر پولیس افسر کی آنکھ کھل جاتی تو اسے کوئی نئی چیز نظر نہ آتی۔ لاش اسی طرح عبا سے ڈھکی تھی اس کے اوپر تھوڑی سی حرکت تھی لیکن وہ حرکت ایسی تھی جیسے ہوا کی لرزش ہو۔ اس کے علاوہ کسی عورت مرد یا وہاں گھومنے والی روحوں کو کسی قسم کی تبدیلی دکھائی نہ دیتی۔ ظاہر ہے وہاں لاش ہی تو پڑی تھی جس کے اندر کسی قسم کی بھی زندگی نہیں رہ گئی تھی۔ اس لاش سے سوائے ان کیڑوں کے جو ہر جگہ گھس جاتے ہیں اور کسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔

لیکن متولی سالہا سال سے کیڑوں مکوڑوں کی طرح ہی ان مردوں کے درمیان

رہ رہا تھا۔ ہر شام وہ گاؤں کے آخری کنارے پر اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھتا اور سورج ڈوبنے کا انتظار کرنے لگتا۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا دریا کے کنارے سے اترتا اور قبرستان کی طرف چل دیتا۔ قبروں کے درمیان اپنا بستر بناتا۔ سونے سے پہلے وہ قبروں کے درمیان چکر لگاتا اور روٹی یا مٹھائی کے وہ ٹکڑے تلاش کرتا جو مردوں کے عزیز وہاں چھوڑ جاتے۔ انہیں کھانے کے بعد بھی وہ جاگتا رہتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ اس کے بعد اچانک وہ کھڑا ہو جاتا۔ اسے دور سے خوشبو آ جاتی۔ خوشبو نئی قبر اور نئے مردے کی ہوتی۔ یہ خوشبو وہ دور سے ہی پہچان لیتا تھا۔ پھر اس خوشبو کی طرف تیز تیز قدموں سے چل دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوشبو گرم گوشت اور خون کی ہے جو نئے مردہ میں ابھی تک باقی ہے۔

وہ اپنی تیز انگلیوں سے اس بلی کی طرح زمین کھودنا شروع کر دیتا جو دبا ہوا گوشت نکالنے کے لئے پاگلوں کی طرح اپنے پنجوں سے زمین کھودتی ہے۔ وہ اپنے تجربہ کار ہاتھوں سے لاش کا کفن اتارتا اسے اکٹھا کر کے الگ گڑھے میں دبا دیتا۔ اسے اچھی طرح مٹی سے ڈھک دیتا اور دوسری صبح لوگوں کے جاگنے سے پہلے اسے وہاں سے نکال لیتا۔

کفن اتارنے کے بعد وہ گرم گرم لاش کی طرف توجہ کرتا۔ اگر وہ عورت کی لاش ہوتی تو وہ اسکے اوپر سرکنا شروع کرتا حتیٰ کہ اس کی ٹھوڑی تک پہنچ جاتا اور اگر مرد کی لاش ہوتی تو وہ اسے الٹا کر دیتا۔

صبح کو متولی کفرالنین سے غائب ہو جاتا۔ کوئی خیال بھی نہیں کرتا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ لیکن کچھ فاصلے پر وہ رملہ یا باھوت کے ہفتے وار بازار میں بیٹھا نظر آتا۔ وہ مٹی میں لتھڑا سفید کپڑا بیچ رہا ہوتا جس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ چند گھنٹے قبل تک وہ کفرالنین کے قبرستان میں دفن کسی مردہ کا کفن تھا۔

(8)

گاؤں میں کار سے پہلے اس کے ہارن کی آواز داخل ہوئی اس کے بعد گردوغبار کا طوفان آیا اور کار کے پیچھے گاؤں کے بچے بھاگے اور کتوں نے کار کے ساتھ بھاگتے ہوئے بھونک بھونک کر برا حال کرلیا۔ کار میں سے کچھ لوگ نکلے جن میں سے ایک کے ساتھ مرد نرس اور دوسرے کے ساتھ ایک کتا تھا جو کھینچ کھینچ کر اپنا پٹہ توڑے لے رہا تھا۔ ایک گروہ نے ان لوگوں کو دھکے دے کر پیچھے کرنا شروع کیا جو تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ یہ گروہ بچوں کی ٹانگوں پر بید بھی برسا رہا تھا۔

سارا گاؤں دریا کنارے جمع ہو گیا تھا۔ لوگ جلابیہ پہنے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ عورتوں نے کالی چادروں میں اپنے آپ کو لپیٹ رکھا تھا۔ بچوں کو مکھیوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان کے کولہے ننگے تھے اور ناکیں بہہ رہی تھی۔ ہر شخص وہاں موجود تھا۔ صرف تین آدمی وہاں نہیں تھے۔ ذکیہ حسبِ معمول اپنے دروازے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ زینب تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔ ان کی غضب ناک نگاہیں گلی پر لگی ہوئی تھیں۔

کفروی بھی زمین پر ہی بیٹھا تھا مگر وہ گھر سے دور مکئی کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ جہاں وہ چھپا ہوا تھا وہاں وہ اپنی جانب آتی آوازیں سن رہا تھا۔ ان کے ساتھ کتے کی سوں سوں کی آواز بھی تھی۔ کتا بار بار بھونک بھی رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ انہیں اس کے چھپنے کی جگہ کا پتہ چل گیا ہے۔ اس لئے وہ کھیت سے باہر نکلا اور دریا کے کنارے کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔ بچوں نے اسے دیکھ لیا اور کفروی' کفروی چلانا شروع کر دیا۔ بچے اس کے پیچھے بھاگنے لگے مگر وہ ان سے زیادہ تیزی کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ پولیس والا اسے پکڑے یا اس کا کتا اسے دبوچ لیتا اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں بھاگ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ وہ صرف

MashalBooks.com

اپنے اور اس خطرے کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ رکھ رہا تھا جو اس کے پیچھے آ رہا تھا اور انجانے راستے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ جس وقت وہ بھینس کے پاس لیٹا تھا اس وقت سے دریا میں چھلانگ لگانے تک اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

اس نے دریا میں کسی کے چھلانگ لگانے کی آواز سنی اور محسوس کیا کہ کوئی اس کے پیچھے تیرتا ہوا تیزی کے ساتھ اس کے قریب آ رہا ہے۔ اس نے اور تیزی سے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیئے۔ وہ دوسرے کنارے کو غور سے دیکھ رہا تھا جیسے وہاں اسے پناہ مل جائے گی۔ وہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کنارے پر کفرالنین کے میئر کے نارنگیوں کے باغ ہیں۔

دریا کے کنارے کفرالنین کے لوگ جمع تھے۔ عام لوگ ذرا پیچھے کھڑے تھے۔ سامنے ضلع کا افسر' گاؤں کا پولیس افسر اور ضلعی ہیڈ کوارٹر سے آنے والے پولیس والے کھڑے تھے۔ وہ سب دریا میں تیرنے والوں کو غور سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ تیراکی کا مقابلہ دیکھ رہے ہوں اور بے چین ہوں کہ دیکھیں اس ریس میں کون جیتے گا۔ دونوں تیرنے والوں کے درمیان جب فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو گاؤں والوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگتے۔ وہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ یا اللہ کفروی نہ پکڑا جائے۔ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ان کا دل کہتا تھا کہ کفروی قاتل نہیں ہے۔ وہ مجرم ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ پولیس والوں سے اور ان کے کتوں سے نفرت کرتے تھے۔ وہ تمام افسروں اور اقتدار اور حکومت کے تمام نمائندوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہ حکومت سے کسانوں کی ابدی نفرت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ہمیشہ وہی مظلوم ہوتے ہیں' ہمیشہ ان کا ہی استحصال کیا جاتا ہے حالانکہ اکثر اوقات وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا رہا ہے۔

ضلعی افسر نہایت بے پروائی کے ساتھ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی گھڑی بھی دیکھ رہا تھا جیسے اسے کہیں اور ضروری کام سے جانا ہو۔ اور جلد سے جلد یہ کام مکمل کرنا چاہتا ہو۔ کتے کو بھی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دریا کے کنارے آرام سے لیٹا دھوپ سینک رہا تھا اور ہرے بھرے کھیتوں کا لطف لے رہا تھا جیسے وہ ایک عرصے سے ان قدرتی نظاروں سے محروم رہا ہو۔ صرف ایک شخص پریشان نظر آ رہا تھا اور وہ تھا گاؤں کا پولیس افسر۔ جیسے ہی دونوں تیرنے والوں کا فاصلہ کم ہوتا وہ چیختا ''شاباش بایومی۔ تھوڑی کوشش اور کر۔''

اس کی آواز بایومی کا حوصلہ اور بڑھاتی اور وہ خوب زور زور سے ہاتھ پاؤں چلانے لگتا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا اسے علم نہیں تھا۔ اسے اس جانور کو پکڑنے کا حکم دیا گیا تھا اور بس اس سے آگے اس کے دماغ نے سوچنے سے انکار کر دیا تھا جیسے بندوق سے نکلی گولی۔

کفروی کا ننگا بدن پانی سے باہر نکلا اور باغ کی طرف بھاگا۔ بایومی بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھی ننگا ہی تھا سوائے اس کے کہ اس نے ایک کچھا سا پہن رکھا تھا۔ وہ لمبا اور مضبوط ہاتھ پاؤں والا انسان تھا۔ اس کا چہرہ پتلا سا تھا اور ایسے لگتا تھا جیسے گتے کا بنا ہو۔ وہ خالص پولیس والے کا چہرہ تھا جس سے غم یا خوشی اور امید و مایوسی کے کسی جذبہ کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ وہ ایسا تاثر سے عاری چہرہ تھا جو کچھ بھی نہیں کہتا۔ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح سپاٹ چہرہ جس سے کسی جذبہ کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ جیسے اسے اتنا زیادہ کچلا گیا ہو کہ اس میں اب کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ یا جیسے دروازے پر لگی سیسے یا تانبے کی اس کنڈی کی طرح جو اندر موجود لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے لگائی گئی ہو کہ باہر سے کچھ لوگ ان کے آرام میں خلل ڈالنے آرہے ہیں۔ اس کا جسم بھی سخت اور تانبے کی طرح تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کسی تھکن کے بغیر مسلسل بھاگتے یا تیرتے رہتے۔ ایسا لگتا جیسے وہ انسانی اعضا ہی نہ ہوں' جیسے وہ گوشت پوست کے نہ ہوں بلکہ وہ فولاد کے روبوٹ ہوں۔

کفروی ایک پیڑ کے پیچھے چھپا تو اس نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک انجانے خوف سے لرز گیا جیسے اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی جو انسان ہے نہ شیطان' زندہ ہے نہ مردہ' کوئی ایسی شیطانی روح جو انسانی شکل کے باوجود انسان نہ ہو۔

برفیلے پانی کی طرح وہ خوف کے ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔ اب اسے اپنے جسم کا احساس بھی نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ پیڑ کے پیچھے چھپا ہوا ہے یا نارنگی کے پیڑوں کے درمیان چل رہا ہے۔ کیونکہ اس کا تعاقب کرنے والا ایک دہشت ناک سایہ تھا' وہ مشین کی طرح نہ تو تیز چل رہا تھا اور نہ وہ گھڑی کی سوئیوں کی طرح سزائے موت کے مقررہ وقت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ جب اس کے فولادی ہاتھوں نے کفروی کے بازو کو جکڑا تو اس کے منہ سے نکلا۔ ''لا الہ الا اللہ......

اس کے بعد چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ پھر وہ کچھ سن سکتا تھا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے لگا جیسے اس کی زندگی اچانک ختم ہوگئی۔ جیسے قسمت کا لکھا اس کے سامنے آ گیا ہو۔

اسے ہوش آیا اور اس نے دیکھنا اور سننا شروع کیا تو اس نے حیرت کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑے کمرے میں اکڑوں بیٹھا تھا اور لوگ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے پھر ارد گرد دیکھا تو کہ وہ سمجھ سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دم اسے لگا کہ کسی نے زور سے اس کے کاندھے میں انگلی چبھو دی ہے۔ پھر تیز آواز آئی۔ ''سنا نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتا؟''

کفروی نے منہ کھولا اور بولا۔ ''کسی نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟''

تیز چبھتی ہوئی آواز پھر فضا میں گونجی ''سو رہا ہے کیا؟'' سیدھا ہو کر بیٹھ اور صاحب بہادر کی بات کا جواب دے۔''

کفروی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ صاحب بہادر کون ہیں اور وہ کہاں ہے۔ ''یقیناً وہ کفرالنین میں تو نہیں ہے۔ اس نے سوچا وہ کسی اور گاؤں میں ہوگا' بلکہ ہو سکتا ہے کسی اور دنیا میں ہی ہو۔ وہ حیران ہوا کہ یہ لوگ اسے یہاں کیسے لائے۔ یا وہ یہاں کیسے آیا۔

اچانک اس نے ایک غضب ناک آواز سنی ''کیا نام ہے تیرا؟''

اس جواب دیا ''کفروی''

غضب ناک آواز پھر بولی۔ ''تیرے اوپر الواؤ کے قتل کا الزام ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو اپنے جرم کا اقبال کر لے۔ آنا کانی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کس بات کا اقبال کرلوں؟'' اس نے سوال کیا

''الواؤ کے قتل کا۔''

''میں نے الواؤ کو قتل نہیں کیا۔ الواؤ تو بہت اچھا آدمی تھا۔''

وہ آواز پھر آئی۔ ''تو نے سنا نہیں کہ اس نے تیری بیٹی نفیسہ کی عزت لوٹی تھی؟''

''میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ وہ الواؤ ہی تھا۔''

''یہ سننے کے بعد تو نے الواؤ کو قتل کرنے کا نہیں سوچا تھا؟''

''جی نہیں''

آواز نے سوال کیا ''کیوں نہیں؟''

''میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔''

''جس شخص کی عزت لٹ جائے اس کے لئے یہ قدرتی بات نہیں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم'' کفروی نے جواب دیا۔

اس آواز کو اور غصہ آ گیا۔ ''یہ تو قدرتی بات نہیں ہے۔''

''قدرتی کیا ہوتا ہے؟''

اسے پھر قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں۔ اس نے سوچا وہ کسی ایسی بات پر ہنس رہے ہوں گے جس کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

آواز نے پھر سوال شروع کر دیئے۔ ''اس جمعہ کو دوسرے لوگوں کی طرح جمعہ کی نماز پڑھنے کے بجائے تو کھیت میں کیوں بیٹھا رہا تھا؟''

''جب سے نفیسہ گئی ہے میں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے۔''

''کیوں؟''

''میں نماز پڑھنے جاتا تھا تو نفیسہ بھینس کا خیال رکھتی تھی۔''

''تجھے معلوم ہے کہ الواؤ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جاتا تھا؟''

''ہر ایک جانتا ہے الواؤ مسجد نہیں جاتا تھا۔''

''کیوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی ماں کے پردادا قبطی تھے۔ مگر اصل وجہ خدا ہی جانتا ہے۔'' آواز نے جیسے اسے اشارہ دیا۔ ''تو الواؤ کو ناپسند کرتا تھا؟''

''نہیں تو۔''

''کیا تیرا یہ خیال نہیں ہے کہ اس جیسے آدمی کو مذہب کے احکام کی پابندی کرنا چاہئے......''

کفروی جھٹ بولا۔ ''الواؤ اچھا آدمی تھا۔''

''کیا تو نہیں جانتا کہ نماز برائیوں سے بچاتی ہے؟''

''ہاں، شیخ حمزوی ہم سے یہی کہتے ہیں۔''

''الواؤ نے تیری بیٹی کی بے حرمتی کی اور اس طرح گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔''

''لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔''

''اس سب کے بعد بھی تو یہ کہتا ہے کہ تو نے اسے قتل کرنے کا نہیں سوچا؟''

''جی نہیں''

MashalBooks.com

''کیوں؟ تو نے اسے قتل کرنے کا کیوں نہیں سوچا؟''

''الواؤ اچھا آدمی تھا۔'' کفروی نے دہرایا۔

وہ آواز پھر گونجی۔ ''تجھے اپنی عزت کا خیال نہیں ہے؟ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کا خیال نہیں ہے؟''

کفروی پل بھر کو چپ رہا پھر بولا۔ ''ہے' عزت کا خیال ہے۔''

اب وہ آواز فاتحانہ انداز میں بولی۔ ''اسی لئے تو نے الواؤ کو قتل کیا؟''

''مگر میں نے تو اسے قتل نہیں کیا۔''

اب آواز اور غصے میں بھر گئی۔ ''پھر لوگوں نے تجھے اس کے پاس کیوں دیکھا؟''

کفروی خاموش رہا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

وہ آواز اسی طرح غصے میں بھری ہوئی تھی۔ ''تو پھر بھاگا کیوں تھا؟ تو نے چھپنے کی کوشش کیوں کی؟''

''مجھے کتے سے ڈر لگتا ہے۔''

''پتہ ہے کتے نے گاؤں کے تمام لوگوں میں صرف تجھے کیوں پکڑا؟''

''میں کیا جانوں یہ تو کتا ہی جانتا ہوگا۔''

اسے قہقہے کی آواز آئی اور اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟

اب وہ آواز زبردست طیش میں آ گئی تھی۔ ''دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر' تیرے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے جرم کا اقرار کر لے۔ جانتا ہے تیرا کیا حشر ہونے والا ہے؟''

''جی نہیں۔''

اس کے کانوں میں پھر قہقہے گونجے۔ اس کی آنکھوں سے حیرت اور الجھن ٹپک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فولادی انگلیاں اس کے بازو پر پھر جم گئیں۔ وہ اسے ایک لمبی اور اندھیری راہداری میں لئے جا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اشھدان لا الہ اللہ'' ......

MashalBooks.com

(9)

ذکیہ ابھی تک اپنی چوکھٹ پر زینب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں چپ تھیں اور دونوں کی نظریں گلی پر لگی ہوئی تھیں۔ دونوں کی نظروں سے غصہ اور بغاوت ٹپک رہی تھی۔ ان کے سامنے وہی فولادی پھاٹک کھڑا تھا جس پر لمبی لمبی سلاخیں تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ دریا کے کناروں اور اس میں بہنے والے پانی کا راستہ روک رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میٹر اس میں سے باہر نکلتا۔ اس کے اردگرد لوگ ہوتے۔ وہ نپے تلے قدموں سے آگے آگے چلتا۔ اس کی نظروں میں تکبر اور گھمنڈ بھرا ہوتا جو وہ اپنی نیلی آنکھوں سے آسمان کی طرف اڑاتا چلتا۔ وہ اس زمین پر بالکل نہیں دیکھتا جس پر وہ چل رہا ہوتا اور نہ ذکیہ اور زینب کو اپنی چوکھٹ پر بیٹھا دیکھتا۔ وہ کچھ اور ہی سوچتا ہوتا۔ ذکیہ اور زینب ٹکٹکی باندھے گلی کو دیکھتی رہتیں۔

ذکیہ کے ہاتھ سیاہ جلابیہ پر اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ بڑے بڑے تھے اور ان کی جلد کھردری اور چٹخی ہوئی تھی۔ اس کی ہتھیلی پر کدال کا نشان تھا جو زور سے پکڑ کر زمین پر چلاتی تھی۔ اس کے ناخن کالے تھے اور ان سے کھاد اور مٹی کی بو آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہاتھ اٹھاتی اور ماتھے سے پسینہ پونچھتی یا مچھر مکھی کو اڑاتی یا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ اس کے پاس بیٹھی زینب مکئی کے بھٹوں سے دانے نکالتی یا گوبر میں بھوسہ ملا کر گول گول اپلے بناتی...... وہ کسی وقت کھڑی ہو جاتی، مٹی کا مٹکا سر پر رکھتی اور پانی لینے دریا پر چلی جاتی۔ اس کا جسم لمبا اور نازک تھا۔ اس کی نظریں ہمیشہ سامنے دیکھتی رہتیں۔ چلتے ہوئے وہ آنے جانے والے لوگوں کو یا اردگرد کے گھروں اور دوکانوں کو بالکل نہیں دیکھتی۔ وہ راستے میں کسی کو دیکھ کر مسکراتی بھی نہیں تھی اور کوئی جانے والی عورت یا لڑکی مل جاتی تو اسے سلام بھی نہیں کرتی تھی۔ حاجی اسمٰعیل کی دوکان کے پاس سے گزرتی تو اپنی

چال تیز کر دیتی ۔ اسے اپنے بدن پر نیلی آنکھیں چبھتی محسوس ہوتیں ۔ اسے لگتا جیسے وہ نظریں اس کے کپڑوں کے اندر گھسی جا رہی ہیں اور اس کی ٹانگوں' اس کی گولائیوں' اس کی گول گول رانوں' اس کے پیٹ' اس کی نازک کمر' اس کے کولہوں اور اس کی سیدھی پیٹھ کر بھوکوں کی طرح کھائے جا رہی ہیں ۔

وہ چادر اٹھا کر چہرہ اور اپنا سینہ چھپا لیتی لیکن چھری کی طرح تیز نظریں اس پر ترس نہیں کھاتیں' رحم نہیں کرتیں وہ رحم کرنا جانتی ہی نہیں ہیں ۔ وہ نظریں اس کے کپڑوں کے اندر گھسی جاتیں ۔ وہ جب دریا کے کنارے کے اوپر چڑھتی اور جب نیچے اترتی تو نظریں اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو اپنی گرفت میں لئے رکھتیں ۔ وہ اس کے سارے بدن کو ننگا کر دیتیں ہیں ۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ۔ نظریں سامنے کئے' جوانی میں گال سرخ ہوتے ہیں بھرے بھرے ہونٹ تھرتھرا رہے ہوتے اس کا نازک جسم ہوا کی طرح اڑا چلا جاتا ۔

وہ گھر پہنچتی ہے تو پانی کا مٹکا سر سے اتارتی ہے' ایک طرف رکھتی ہے اور ذکیہ پھوپھی کے پاس بیٹھ جاتی ہے ۔ اس کا سانس ابھی تک پھولا ہوا ہے ۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے' سینہ اوپر نیچے ہو رہا ہے' ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے ہیں ۔ پسینے کے قطرے ٹپک کر اس کی گردن میں ابھی غائب نہیں ہوئے ہیں ۔

ذکیہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے ۔ پھر اس کے سوکھے ہونٹ کھلتے ہیں اور وہ اس سے سوال کرتی ہے ۔ ''کیا ہوا ہے تجھے ؟''

لیکن زینب کوئی جواب نہیں دیتی اس لئے ذکیہ پھر چپ ہو جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹ پھر کھلتے ہیں اور ایک ماتمی صدا سی نکلتی ہے ۔'' میرے بیٹے جلال تو کہاں ہے؟ تو زندہ بھی ہے یا نہیں ۔ یا اللہ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ وہ مر چکا ہے تو کم سے کم میرے دل کو تسلی تو ہو جائے ۔ اب وہ کفروی کو پکڑ کر لے گئے ۔ کیا خبر وہ بھی واپس آئے گا یا نہیں ۔ یا اللہ کیا جلال اور نفیسہ کافی نہیں تھے ۔ کیا کفروی کے ساتھ بھی یہ ہونا ضروری تھا؟ اب تو کوئی بھی نہیں بچا ۔ پورا گھر خالی ہو گیا ۔ زینب ابھی بچی ہے اور میں بوڑھی ہو گئی ہوں ۔ اب بھینس کا اور کھیت کا کون خیال رکھے گا ؟''

زینب نے چادر سے پسینہ پونچھا اور بولی ۔'' میں اب بڑی ہو گئی ہوں ۔ جب تک ابو واپس نہیں آئیں گے بھینس کا' کھیت کا اور سارے گھر کا خیال میں رکھوں گی ۔ پھر

ابوضرور واپس آئیں گے اور جلال اور نفیسہ بھی لوٹ آئیں گے''

''بیٹی' ایک بار جو چلا جاتا ہے پھر لوٹ کر نہیں آتا۔''

''اللہ میاں ہماری حالت جانتا ہے وہ ہماری ضرور مدد کرے گا''

ذکیہ نے آہستہ سے اس طرح کہا جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔''اب کوئی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ جو چلے جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔ کفروی بھی اب واپس نہیں آئے گا۔''

''نہیں' میرے ابوضرور آئیں گے۔ تم دیکھنا وہ آئیں گے۔'' زینب نے زور سے کہا۔''وہ انہیں بتائیں گے کہ انہوں نے کسی کو نہیں مارا اور وہ ان کا یقین کر لیں گے۔ سب جانتے ہیں میرے ابو بہت نرم دل انسان ہیں۔ وہ کسی کو نہیں مار سکتے۔''

بوڑھی عورت نے گہرا سانس لیا۔''یہاں کے لوگ اسے جانتے ہیں۔ مگر وہاں لوگ اسے نہیں جانتے۔ اگر جلال یہاں ہوتا تو وہ اس کے ساتھ چلا جاتا۔ وہ تو ہر ایک کی مدد کرتا تھا۔ غیر لوگوں تک کا کام کر دیتا تھا۔''

''اللہ ان کی مدد کرے۔''

''میری بچی' صرف اللہ کافی نہیں ہے۔''

زینب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اپنی پھوپھی کو دیکھا۔''خداوند کریم' ہم پر رحم کرے۔ اللہ سب کی مدد کرتا ہے۔ پھپھو۔ آپ وضو کر کے نماز کیوں نہیں پڑھ لیتیں۔ خدا سے دعا کیجئے وہ ضرور مدد کرے گا۔''

ذکیہ نے مایوسی کے عالم میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔''میں تو روز اللہ سے دعائیں مانگ رہی ہوں۔ نمازیں پڑھ رہی ہوں مگر ہماری مصیبتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔''

اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا' آواز پرسکون اور برف کی طرف سرد تھی۔ زینب کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ عجیب نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور سردی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے ذکیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''تمہیں کیا ہوا پھپھو؟ تمہارے ہاتھ تو برف ہو رہے ہیں؟''

ذکیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورتی رہی۔ زینب نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا اپنا ہاتھ تک کانپ گیا۔

''کیا ہوا پھپھو' خدا کے لئے کچھ تو بتایئے۔'' اس نے پوچھا۔

MashalBooks.com

ذکیہ اسی طرح بت بنی خلا میں گھورتی رہی۔ زینب کو اب ڈر لگا۔ اس نے خوف سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ ''کیا ہوا پھپھو' کیا ہوا؟ یا اللہ میری پھپھو کو کیا ہو گیا......''اس نے چیخنا شروع کر دیا۔

اچانک سارا گھر لوگوں کے سایوں سے بھر گیا۔ وہ اس کے گرد دروازے پر جمع ہو رہے تھے۔ اس فولادی پھاٹک پر اکٹھے ہو رہے تھے؟ جس پر ذکیہ کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ وہ گلی میں بھرتے چلے جا رہے تھے۔ ذکیہ زمین پر اوندھی لیٹی تھی اور سامنے والی فولادی سلاخیں اسے ابھی تک نظر آ رہی تھیں جو اس گلی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ فولادی ٹانگوں کی طرح اسے کچلنے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس نے زبان سے مٹی کو چکھا اور اس کے منہ میں چپ چپاہٹ سی بھر گئی۔ اس کی ناک اور آنکھیں مٹی سے بھر گئی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے چیخ ماری تاکہ اس کی ماں اسے بھینس کے ان پیروں کے نیچے سے اٹھا لے جو اس کی طرف ایسے بڑھ رہی تھیں جیسے ابھی اسے کچل دیں گی۔ اور اسی وقت اس کی ماں آ گئی تھی اور اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ یہ عجیب سا خواب تھا جو بار بار وہ دیکھتی تھی۔ کبھی وہ دیکھتی کہ وہ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی ہے اچانک وہ وہاں سے گرتی ہے اور دریا میں ڈوبنے لگتی ہے۔ پھر وہ دیکھتی ہے کہ پوری طاقت کے ساتھ وہ تیرتی جاتی ہے اور آخر دریا کے پار پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جب وہ پانی سے منہ باہر نکالتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ وہ ایک آہنی پھاٹک کے سامنے پڑی ہے۔ پھر وہ دیکھتی ہے کہ وہ اپنے شوہر عبدالمنعم کے ساتھ لیٹی ہے۔ ایک طرف منعم ہے اور دوسری طرف جلال۔ سانس لینے کی آواز پر وہ آنکھیں کھول دیتی ہے۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں میں سے دیکھتی ہے کہ کوئی شخص ہتھ گاڑی گھسیٹتا لئے جا رہا ہے۔ گاڑی میں گائے کے سری پائے اور اوجھڑی بھری ہے گاڑی سے خون بہہ کر زمین پر گر رہا ہے۔ وہ اجنبی اس کے قریب آ رہا ہے۔ اس کی نظریں اس پر گڑی ہیں۔ پھر وہ اجنبی اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور اس کے پیروں سے پازیب اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ نزدیک آتا ہے تو دیکھتی ہے کہ اس کی آنکھیں ام صابر کی سی ہیں اور وہ اس کی ایک ٹانگ دوسری سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر ام صاب کہیں سے استرا نکالتی ہے اور اس کا گلا کاٹنے لگتی ہے۔ وہ چیخنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ وہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے پاؤں زمین پر جم جاتے ہیں۔ پھر وہ دیکھتی ہے کہ جلال اس کے ساتھ سو رہا ہے۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی ہے

لیکن وہ اس سے دور ہو جاتا ہے پھر معاً ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اسے دبوچ لیتا ہے۔ وہ مڑ کر دیکھتی ہے تو اس کا شوہر سو رہا ہے۔ لیکن اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسے پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس کے سر اور سینے پر تھپڑ مار رہا ہے۔ پھر وہ اس کے پیٹ پر لات مارتا ہے اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ پھر چیخنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی آواز پھر نہیں نکلتی۔ وہ اسے دیکھتی ہے وہ اور بھی قریب آ گیا ہے اور اس کا جلابیہ کھینچ رہا ہے۔ پھر وہ ننگی ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنے بدن پر اس کی انگلیاں محسوس کرتی ہے جو اوپر سے نیچے تک سرک رہی ہیں۔ پھر اس کا بھاری جسم پوری طاقت کے ساتھ اسے دباتا ہے۔ وہ اتنی زور سے دباتا ہے کہ اس کے نیچے کی زمین ہلنے لگتی ہے اب وہ آنکھیں کھولتی ہے تو دیکھتی ہے کہ اس کے پاس اس کا شوہر نہیں لیٹا ہے بلکہ اس کا بھائی کفروی وہاں لیٹا ہے۔ وہ گلا پھاڑ کر چیختی ہے مگر لگتا ہے کہ اس کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ کفروی بستر میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اوپر اٹھاتی ہے مگر اب یہ سر اس کے بیٹے جلال کا ہے۔ وہ اپنی ہتھیلیوں سے اس کی آنکھیں صاف کرتی ہے پھر کونے میں رکھے گھڑے سے پانی لے کر اس کی ناک اور منہ دھوتی ہے۔ اس کے پاس پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہاں بچے کا پاخانہ بھی پڑا ہے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ سوکھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا بیٹا بھی سوکھتا چلا جاتا ہے۔ سوکھتے سوکھتے وہ خرگوش کے برابر ہو جاتا ہے۔ وہ گڑھا کھود کر اس میں اسے دبا دیتی ہے۔ اسی وقت اس کا شوہر کھیت سے واپس آ جاتا ہے اور اپنے بیٹے کو نہ پا کر اسے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اس کے ساتھ واقعی ہوتا آ رہا تھا کہ جب بھی اس کا کوئی بیٹا مرتا تو اس کا شوہر اسے خوب مارتا۔ اسی طرح جب بیٹی پیدا ہوتی تو اس کی پٹائی ہوتی۔ اس کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں لیکن صرف ایک ہی بچہ زندہ رہ سکا اور وہ تھا جلال۔ باقی سب کسی نہ کسی عمر میں مر گئے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کونسا بچہ کب مر جائے۔

اس نے چاروں طرف سے گھیرا کرنے والی نظروں کو دیکھا اور کہا ''جلال اکیلا بچہ تھا جو بڑا ہوا۔ مگر اب وہ بھی چلا گیا اور واپس نہیں آئے گا۔ کفروی بھی چلا گیا اور نفیسہ بھی۔ گھر خالی ہو گیا اور زینب ابھی بچی ہے۔ بچی ہے' میں بوڑھی اور بے کار ہو چکی ہوں۔ اب کھیت اور جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

اس نے بہت سی آوازوں کو ایک ہی سانس میں کہتے سنا۔ ''اللہ بہت بڑا ذکیہ'

اس سے دعا کرو۔ وہ انہیں حفاظت کے ساتھ واپس بھیج دے گا۔'' اوران کی طرف دیکھے بغیر ذکیہ نے جواب دیا۔ ''میں نے کتنی دعائیں مانگی ہیں' خدا کے آگے میں کتنا گڑگڑائی ہوں مگر لگتا ہے اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔''

اور ایک ہی آواز میں وہ سب چلائے۔ ''یا اللہ اس پر رحم کر۔ وہ نہیں جانتی کہ کیا کہہ رہی ہے۔ یا اللہ ہم سب پر رحم کرے۔ تو ہی قادرِ مطلق ہے۔ تیرا کرم نہ ہوتو ہم بالکل بے بس ہیں۔

MashalBooks.com

(10)

ذکیہ اسی جگہ زمین پر بیٹھی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرتی ہے پھر کھول دیتی ہے۔ اس کے بعد پھر بند کر لیتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرتی ہے تو لوہے کا بڑا پھاٹک اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے سے وہ دیکھتی ہے تو وہی آدمی ہتھ گاڑی میں جانوروں کے سری پائے اور اوجھڑی لئے جا رہا ہے۔ گاڑی سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آدمی اس کا پاؤں پکڑ کر کھینچتا ہے پھر بڑی سی چھری سے اسے ذبح کرنے لگتا ہے۔ وہ دہشت کے مارے آنکھیں کھولتی ہے اور اپنے گرد کھڑے چہرے دیکھتی ہے۔ ان چہروں میں وہ صرف زینب اور ام صابر کی حرکتیں دیکھتی ہے جو مٹی کے تیل کے چولہے پر ٹین کا برتن رکھے بیٹھی ہے۔ وہ اپنے آس پاس لوگوں کی طرح طرح کی حرکتیں کرتے دیکھتی ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ مختلف آوازیں نکال رہے ہیں۔ لیکن ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

چند عورتیں اور مرد چولہے پر رکھے برتن کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ برتن سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ وہ ایسے چکر لگا رہے ہیں جیسے ناچ رہے ہوں۔ ڈھول کی تھاپ پر ان کی چھاتیاں اور کولہے تھرک رہے ہیں اور ان کے لمبے کھلے بال لہرا رہے ہیں۔ ان کے منہ کھلے ہیں اور وہ بار بار دھرا رہے ہیں ''یا شیخ' عالم ارواح آپ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جس کسی پر بھی بدروح کا سایہ ہو اسے اس سے نجات دلائیے۔'' کچھ مرد بیٹھے ڈھول کی تھاپ کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ وہ سفید دستاریں پہنے ہیں جن کی لمبی دمیں پیچھے لٹک رہی ہیں۔

ام صابر عورتوں اور مردوں کے اس ہجوم میں برابر آ جا رہی تھی۔ اس نے سر پر کالا رومال (ملایہ) باندھا ہوا تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کا سینہ

سپاٹ اور کولہے چوڑے تھے جو لوگوں کے ساتھ ناچتے ہوئے تھرک رہے تھے۔ آگے سے وہ مرد نظر آتی پیچھے سے عورت معلوم ہوتی تھی۔ اپنی تیز تیز حرکتوں سے وہ نوجوان معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ مردوں کے ساتھ ناچتے ہوئے وہ ان کے کولھوں پر بھی ایسے ہی ہاتھ مارتی جیسے عورتوں کے کولھوں پر مارتی تھی۔ وہ ناچتی اور قہقہے لگاتی پھر اچانک اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کر کے چلانا شروع کر دیتی۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ گندی کہانیاں سناتی تو اسکا انداز وہی ہوتا جو قرآن کی آیتیں سناتے وقت ہوتا۔ اس کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا کیونکہ وہ پورے گاؤں کی دایہ تھی۔ لوگوں کے نزدیک وہ نہ عورت تھی نہ مرد۔ اس کی جنس کوئی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا کوئی خاندان' کوئی رشتے دار اور کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ ناچنے والی نفوسہ کے گھر کے قریب ایک تنگ سے گھر میں رہتی تھی۔ اس کا گھر مسجد کے پیچھے ایک خالی میدان کے ساتھ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس گاؤں میں کب آئی ہے' کہاں کی رہنے والی ہے اور کہاں پیدا ہوئی ہے۔ لوگ تو یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ وہ کبھی مرے گی بھی۔ وہ اسے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف دیکھتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتی دکھائی دیتی۔ کہیں وہ زچہ بچہ کو دیکھ رہی ہے تو کہیں لڑکوں کے ختنے کر رہی ہے یا لڑکیوں کے کانوں میں سوراخ کر رہی ہے۔ کہیں وہ چہلم کے بعد بیوہ عورتوں کو تسلی دے رہی ہے تو کہیں بچے کی پیدائش کے ایک ہفتے بعد گھر میں نمک چھڑک رہی ہے۔ وہ ہر گھر کی خوشی اور غمی میں شرکت کرتی نظر آتی۔ شادی میں وہ سب کے ساتھ مل کر ''یویو'' گانے گاتی' دلہن اور دوسری لڑکیوں اور عورتوں کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگاتی' شادی کی رات اپنی انگلیوں سے دلہن کا پردہ بکارت پھاڑتی یا پھر یہ چھپانے کے لئے سفید تولیہ پر خرگوش یا مرغ کا خون لگا دیتی کہ دلہن اب کنواری نہیں رہی۔ اور جب کسی کے لئے ماتم کا وقت آتا تو وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ سر پیٹ لیتی اور وہ ایسے بین کرتی کہ رشتے دار بھی حیران رہ جاتے۔ کوئی عورت مرتی تو اس کی میت کی غسل دینے کا کام بھی وہی کرتی۔ وہ عورتوں اور لڑکیوں کے ہر قسم کے مسائل حل کرنے میں مصروف رہتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ ملوخیہ کی شاخ سے بچہ گرانے کا کام کرتی یا نوزائیدہ بچے کا گلا گھونٹنا ہوتا تو بھی کر دیتی ورنہ بچے کی نال کاٹ کر اسے ریشمی دھاگے سے بند نہ کرتی۔ اس طرح بچے کے جسم کا سارا خون نکل جاتا اور وہ مر جاتا۔

کفرالنین کے رہنے والے اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ گاؤں کا کوئی گھر ایسا

MashalBooks.com

نہیں تھا جو اس کے بغیر گزارہ کر سکتا ہو۔ وہ ہر گھر کا لازمی حصہ تھی۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں ملاتی، شادیاں کراتی، لڑکے کو دلہن اور لڑکی کو دولہا فراہم کرتی، خاندانوں کی عزت کی حفاظت کرتی، نوجوان عورتوں کی عصمت بچاتی اور ایسی باتوں کو چھپاتی جن سے کسی گھرانے کی عزت خاک میں ملتی ہو یا کسی کی بدنامی ہوتی ہو۔ وہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتی، کسی پر جن بھوت آ جاتے تو انہیں اتارتی اور ان جگہوں کو تلاش کر لیتی جہاں کوئی تعویذ وغیرہ چھپا کر رکھا گیا ہوتا۔ جن دنوں وہ ان کاموں میں مصروف نہ ہوتی ان دنوں وہ ٹوکری میں مختلف چیزیں رکھے گھر گھر بیچتی پھرتی۔ وہ رومال، مٹھائیاں، خوشبوئیں اور نسوار فروخت کرتی یا پھر ہاتھ دیکھ کر لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بتاتی۔

ذکیہ کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر بیٹھ بھی جاتی۔ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں کبھی اٹھ رہی تھی اور کبھی بیٹھ رہی تھی۔ اسکے آس پاس لوگ بھی کبھی بیٹھ رہے تھے اور کبھی کھڑے ہو رہے تھے۔ ان کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ عورتوں کو ان کے سینے کی حرکت اور مردوں کو لمبی داڑھیوں سے پہچان رہی تھی۔

ان کے بدن سے مسلسل پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے پونچھنے کی کوشش کرتے لیکن ہر بار وہ ہاتھ گہرے سرخ رنگ میں رنگا واپس آتا۔ ام صابر نے اس پر سے جن اتارنے کے لئے مرغ ذبح کیا تھا اور وہ برابر اسکے اوپر مرغ کا خون چھڑک رہی تھی۔ ایک مرد نے بھی خون میں اپنے ہاتھ بھگوئے اور اس کے جسم پر چھڑکنا شروع کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ جلابیہ کے اندر اس کی چھاتیوں پر گیا ہے اور انہیں چپ چپا کر رہا ہے۔ پھر اور لوگوں نے اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خون لگانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ خون میں نہا گئی۔ ایک ہاتھ اس کی رانوں کے درمیان بھی اوپر تک گیا۔ اسے نہیں پتہ کہ وہ عورت کا ہاتھ تھا یا مرد کا مگر اس نے زور کی چیخ ماری اور تڑپنا شروع کر دیا۔ وہ سن رہی تھی کہ اس کے اردگرد لوگ وظیفے کی طرح کچھ پڑھ رہے تھے۔ ''یا شیخ''...... عالم ارواح آپ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس پر سے جن کا سایہ اتار دو۔'' اس کی چیخیں ڈھول کی تھاپ اور لوگوں کے شور میں کھو گئیں۔ ہر شے ایک دوسرے میں ضم ہو گئی تھی، پسینہ، خون، عورت، مرد اور ایک آدمی کا چہرہ دوسرے آدمی کے چہرے میں اس طرح مل گیا تھا کہ اب وہ کسی کو بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔ اور وہ نہیں بتا سکتی تھی کہ ام صابر

کون ہے وہ ناچنے والی نفوسہ کون شیخ متولی کون ہے اور زینب کون۔ اچانک زینب زیادہ لمبی ہوگئی' اس کا جسم زیادہ بھر گیا اور وہ نفوسہ کے بال۔ وہ پہلے سے زیادہ لمبے ہوگئے تھے اور چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سر کو آگے کر کے بالوں کو اپنے چہرے پر گرا لیتی اور اس کا ابھرا ہوا سینہ ان سے ڈھک جاتا۔ پھر وہ سر کو جھٹکا دے کر بال پیچھے کرتی' جس سے بال اس کے کولہوں تک پہنچ جاتے۔ اس کا جلابیہ آگے سے پھٹ گیا تھا اور وہ جب چھلانگ لگاتی تو وہ کھل جاتا جس سے اس کی نرم ملائم ٹانگیں اور رانیں ننگی ہو جاتیں۔ وہ جس چیز پر زور سے پاؤں مارتی اس میں شگاف پڑ جاتا اور وہ چیز اوپر کو اچھلتی۔ اب جلابیہ کے شگاف میں سے اس کا سینہ' اس کا پیٹ اور ناچتی ہوئی جلد نظر آ رہی تھی۔ اس کے آس پاس لوگ جھوم رہے تھے' ناچ رہے تھے۔ وہ گرتے تھے پھر سنبھل جاتے تھے۔ اب مردوں اور عورتوں نے اکٹھا گھیرا بنا لیا تھا اور ہو گھوم رہے تھے۔ ان کے بیچ میں نفوسہ اور شیخ متولی تھا۔ متولی جب بھی چکر لگاتا ہوا اس کے قریب آتا وہ اس کی ٹانگ' اس کی ران' اس کے پیٹ یا سینے پر ضرور ہاتھ مارتا۔ وہ اپنے بال پکڑ کا زور سے کھینچتی اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتی۔ شیخ متولی اور دوسرے لوگ بھی مجذوبوں کی طرح شور مچاتے۔

اب ذکیہ کو لگ رہا تھا کہ اس کا جسم اپنے آپ ہی جھوم رہا ہے یا کوئی اور ہستی اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کا جسم خود بخود ان لوگوں کے گھیرے میں داخل ہوگیا ہے۔ اس کا جسم دوسرے جسموں کے ساتھ مل کر اب جھوم رہا ہے اور ناچ رہا ہے۔ اس کے بالوں میں بندھا اونی موباف کھل گیا اور اس کے منہ پر بادل سے چھا گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک ہاتھ اس کے سینے کی طرف بڑھا ہے اور اسے زور سے نوچ لیا ہے۔ یہ درد سانپ کے کاٹنے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ اس نے منہ کھولا اور فلک شگاف چیخیں لگانے لگی۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنی پیدائش کے لمحے سے اپنے اندر جو چیخیں چھپا رکھی تھیں وہ اب باہر نکل رہی تھیں۔ اس وقت اس کے باپ نے اس کی ماں کو اس لئے مارا تھا کہ اس نے لڑکا پیدا نہیں کیا تھا۔ یہ آہ و زاری بہت دور گزرے زمانوں کی آہ و زاری تھی جب وہ گدھے کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور جلتی ریت اس کے پاؤں جلا رہی تھی۔ جب اس نے پہلی بار اچار کے ساتھ روٹی کھائی تھی اور مرچوں نے اس کے پیٹ میں آگ لگا دی تھی۔ جب ام صابر نے اس کی ٹانگیں چیری تھیں اور اس کے گوشت کا ایک حصہ کاٹ

لیا تھا۔ جب اس کا سینہ بھر گیا تھا ور جس مرد کو بھی موقع ملتا اسے نوچ لیتا تھا۔ جب اس کا شوہر عبدالمنعم اسے چھڑی سے پیٹتا تھا پھر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا تھا۔ جب اس کے بچے پیدا ہوتے تھے۔ وہ خون میں نہا جاتی تھی پھر وہ مر جاتے تھے تو انہیں دفن کرتی تھی۔ جب جلال نے فوجی وردی پہنی تھی اور پھر گھر واپس نہیں آیا تھا۔ جب نفیسہ بھاگ گئی تھی اور بچوں نے نفیسہ اور الواؤ کا گانا بنالیا تھا۔اور جب شہر سے کچھ لوگ آئے تھے جن کے ساتھ کتا بھی تھا اور وہ کفروی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔

اس کی چیخیں گزرے زمانوں تک جا رہی تھیں جن کی کوئی انتہا نہیں تھی اور لگتا تھا اس کے درد کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ لگتا تھا وہ درد اس کی زندگی جتنا لمبا ہے سارے دنوں اور ساری راتوں جتنا لمبا۔ یہ چیخیں اسی طرح جاری رہیں۔اس نے اپنے بال نوچ ڈالے' اپنے کپڑے پھاڑ لئے اور ناخنوں سے اپنا گوشت نوچ نوچ کر اپنے سارے بدن کو لہولہان کر لیا جیسے وہ اپنے آپ کو چیر پھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہو۔ ام صابر ہاتھوں میں خون بھر بھر کر اس پر چھڑکتی رہی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

''چیخ ذکیہ' زور سے چیخ' بدروح کو اپنے جسم سے بھگا دے'' ام صابر کہہ رہی تھی۔ زور زور سے چیخ۔ خوب چیخ۔

اب وہ سب گلا پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ ذکیہ' ام صابر' نفوسہ' شیخ متولی اور کفرالنین کے وہ سب لوگ جو وہاں جمع تھے حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے اندر دبا ہوا عمر بھر کا گرد وغبار نکال رہے تھے وہ غبار جو ان کے اندر اس وقت سے بھرا تھا جب پیدا ہوئے تھے' جب ان کے پیروں کو گرم ریت نے جلایا تھا۔ جب ان کے پیٹ میں مرچوں نے آگ لگائی تھی۔ جب ان کے بیٹوں' بیٹیوں اور دوسرے عزیزوں کو موت ان سے چھین کر لے گئی تھی۔

(11)

مگر جن ذکیہ کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی پیٹھ اور سینے پر سوار تھا۔ اب وہ بیٹھ گئی تھی مگر اس کے لئے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سینے پر اسے پنجے گاڑے بیٹھا دیکھ رہی تھی۔ وہ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے جلال دیکھتا تھا۔ اس نے سوچا اپنا دودھ اس کے منہ میں دیدے لیکن ابھی اس سے سوچا ہی تھا کہ اس کا چہرہ اچانک اس کے شوہر عبدالمنعم کا چہرہ بن گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دیا۔ لیکن اب اس چہرے کے نقوش بدل گئے۔ اب ان آنکھوں میں شکایت تھی۔ اب وہ چہرہ کفروی کا تھا۔ کفروی کی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ ڈر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اچانک کسی دروازے یا کھڑکی کے پیچھے بھاگ گیا۔ لیکن فوراً ہی واپس بھی آ گیا۔ اب اس کے پاس ہتھ گاڑی تھی جس میں سری پائے اور اوجھڑی رکھی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا اپنا جسم سکڑتا جا رہا ہے۔ اس نے بدروح کو بھگانے کے لئے جدلی سے اپنے جلابیہ کے گریبان میں تھوکا اور اپنی بھتیجی زینب کو آواز دی۔ ڈر کے مارے وہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ زینب آئی تو اس نے کہا ''زینب میری بچی' مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے' کھڑکی کی سلاخوں سے جن مجھے گھور رہے ہیں۔''

زنیب نے اپنے پیچھے دیکھا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ کہنے لگی ''مگر پھپھو' کھڑکی میں تو سلاخیں ہی نہیں ہیں۔''

ذکیہ نے کانپتی انگلی سے بڑے آہنی پھاٹک کی طرف اشارہ کیا ''وہ سامنے کھڑکی ہی تو ہے۔''

زنیب نے پھاٹک کو دیکھا اور اپنی پھوپھی کا کندھا تھپ تھپایا۔ ''وہ تو میٹر کا گھر

ہے ڈرتی کیوں ہو۔ سو جاؤ' بھینس کو میں کھیت میں لے جاتی ہوں' شام تک لوٹ آؤں گی۔''

ذکیہ زینب کا جلا بیہ پکڑ لیتی ہے''نہیں زینب' مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔''

''مگر کھیت کون جائے گا؟ اور میں وہاں نہ گئی تو ہمیں کھلائے گا کون؟'' ذکیہ کہتی ہے۔''جلال بھینس کو کھیت پر لے گیا ہے۔ تو میرے پاس بیٹھ' مجھے چھوڑ کر نہ جا۔''

زینب جلدی سے اپنے آنسو پونچھتی ہے اور کہتی ہے''جلال کھیت پر نہیں گیا ہے۔ کھیت کاٹنے کے لئے مجھے وہاں جانا چاہئے ورنہ ہم حکومت کا لگان نہیں دے سکیں گے اور حکومت ہماری زمین پر قبضہ کر لے گی۔ پھر ہمیں لوگوں سے بھیک مانگنا پڑے گی۔''

اتنے میں ایک آدمی کی آواز گھر میں گونجتی ہے۔''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذکیہ اور زینب کسی سے بھیک مانگیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

زینب مڑ کر دیکھتی ہے' حاجی اسمٰعیل دروازے میں کھڑا ہے۔ اس کی ایک آنکھ اسے دیکھ رہی ہے تو دوسری کسی اور طرف۔

وہ کہتی ہے''حاجی اسمٰعیل میں کھیت پر جا رہی ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں پھوپھی ذکیہ بیمار ہیں۔ وہ نہ کچھ کھا رہی ہیں نہ پی رہی ہیں۔ وہ سوئی بھی نہیں ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کیا دیکھ رہی ہیں اور نہ جانے کیسی کیسی آوازیں سن رہی ہیں۔ مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

''ذکیہ پر جن آ گئے ہیں' وہ اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک وہ میری بات نہیں مانے گی۔ اور جو میں کہوں وہ نہیں کرے گی۔''

''حاجی اسمٰعیل میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں' جس سے میری پھپھو ٹھیک ہو جائیں۔''

وہ اپنا بقچہ کھولتا ہے اور اس میں سے ایک کاغذ نکالتا ہے جس پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا ہے پھر وہ کاغذ ایک میلے سے کپڑے میں لپیٹ دیتا ہے۔ پھر وہ تعویز ذکیہ کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ پڑھتا بھی جاتا ہے۔ وہ پڑھتا جاتا ہے اور ذکیہ کے سر اور چہرے پر ہاتھ لگاتا جاتا ہے۔ پہلے وہ ہتھیلی لگاتا ہے پھر ہاتھ کی پشت۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ زینب کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اپنی پھوپھی کے پاس بیٹھی ہے۔ وہ کہتا ہے''زینب اس تعویز میں بڑی طاقت ہے اس کا ہدیہ

صرف پانچ پیاسترہے۔اب میں جو کہہ رہاں ہوں اسے غور سے سن لے۔اگلی جمعرات کوتو اپنی پھوپھی کے ساتھ بس میں بیٹھے گی اور قاہرہ میں باب الحدید جائے گی۔ وہاں سے تو سیدہ زینب کی مسجد جائے گی۔ وہاں ان کے یوم ولادت کی تقریبات ہورہی ہوں گی۔تم دونوں وہاں دعا کرنا اور لوگوں کے ساتھ مل کرخوشی منانا۔سب لوگوں کے ساتھ اللہ کا نام لینا اور رات مسجد میں ہی سیدہ زینب کے سائے تلے بسر کرنا۔ جمعہ کی صبح کو اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھانا اور کہنا۔ یا اللہ میری سن لے میری پھوپھی کے گناہ معاف کر دے۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے۔اس پر کرم فرما تو رحیم و کریم ہے۔اللہ تیری ضرور سن لے گا اور ایک بزرگ تیری پھوپھی کے پاس آئیں گے۔ وہ اس کے گلے سے تعویز اتارلیں گے اور پھر پہنا دیں گے۔ایسا کرتے ہوئے وہ اس سے کچھ کام کرنے کو کہیں گے۔ وہ جب یہ کام ختم کرلیں تو چاندی کے دس پیاسترانہیں دے دینا۔اس کے فوراً بعدتم دونوں وہاں سے چلی آنا اور اس نے جو کہا ہو وہ کرنا۔ دیر بالکل نہ لگانا۔ وہ جو کہے اسے غور سے سننا کیونکہ وہ اللہ کا حکم ہوگا۔اگرتم نے اس کا کہا نہ مانا تو تم دونوں پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔ پھر جن تیری پھوپھی کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔''

زینب اس کی طرف دیکھتی ہے اور جذبات سے بھری آواز میں کہتی ہے۔''اللہ آپ کی عمر دراز کرے حاجی اسمٰعیل' میں پھپھو کو لے کر وہاں ضرور جاؤں گی اور وہی کروں گی جو اللہ کا حکم ہوگا۔''

جمعرات کی شام کو ام صابر ان کے گھر آئی۔ اس نے نیل کے تازہ پانی سے ذکیہ کو نہلایا۔زینب نے اپنی چادر کے پلو میں وہ چند سکے باندھے جو پڑوسیوں نے بس اور ٹرام کے کرائے کے لئے انہیں دیئے تھے۔تعویز کے پانچ پیاستر بھی انہوں نے ہی دیئے اور دس پیاستران بزرگ کے لئے دیئے جو زینب کو یہ بتائیں گے کہ اللہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ ذکیہ نے منہ ہی منہ میں کہا ''اللہ بھی ہم سے پیسے مانگتا ہے۔حالانکہ وہ جانتا ہے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' زینب نے جواب دیا۔''اللہ کی عنایات کا کوئی حساب نہیں ہے اور اچھے لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ ہمارے گناہ معاف کر دے اور آپ کے اوپر سے بدروح کا سایہ اتر جائے۔''

(12)

ابھی سورج کی نارنجی کرنیں آسمان پر نمودار ہوئی تھیں، ابھی مرغ نے بانگ نہیں دی تھی اور ابھی شیخ حمزوی کی اذان کی آواز بھی نہیں گونجی تھی کہ لکڑی کا دروازہ زنگ آلود رہٹ کے پہیے کی آواز کے ساتھ کھلا۔ دو سائے باہر نکلے ان کے سر اور منہ کالی چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ زینب کا چہرہ صبح صادق کی روشنی میں ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے غصے کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ دبلی پتلی سوکھی ذکیہ تھی جس کی بڑی بڑی نم آلود آنکھیں چمک رہی تھیں۔

تھوڑی سی روشنی نمودار ہوئی اور دریا کی سطح پر ایک چمک سی پیدا ہوئی جس سے اس کی تھکی ہوئی لہریں اس بوڑھے چہرے کی جھریوں کی طرح واضح ہوئیں جو اپنی قسمت کے لکھے پر قناعت کئے بیٹھا ہو۔ ہوا کے من موجی جھونکے نے دریا کے اونچے کناروں سے مٹی اڑائی اور نشیب کی طرف دور ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے کھڑے مٹی کے گھروندوں کی ان چھتوں پر لے جا کر اسے بچھا دیا جن پر کپاس کے پودوں کی سوکھی چھڑیاں، گوبر کے اپلے، بھوسہ، اور سوکھا گوبر پڑا تھا۔ ان گھروندوں کی کھڑکیاں ان بے نور آنکھوں کی طرح تھیں جو کسی کو نہیں دیکھتیں۔ ان کے دروازے کھردری لکڑی کے تھے اور دیواریں مٹی اور گارے سے بنائی گئی تھیں۔

لیکن میئر کا محل اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی دیواریں اونچی اور اینٹوں کی تھیں، اس کے دروازے دہشت ناک انداز میں اوپر تک چلے گئے تھے۔ لوہے کی سلاخیں چھتوں کو چھو رہی تھیں، اس کی کھڑکیاں شیشے اور لکڑی کی تھیں، اس کی چھتیں مسجد کے میناروں سے بھی زیادہ بلند تھیں اور ان پر کہیں گوبر، اپلے اور کپاس کی چھڑیاں بھی نظر نہیں آ رہی

تھیں۔ کیونکہ وہ کنکریٹ کی تھیں اور ہر وقت صاف رکھی جاتی تھیں۔

وہ دونوں سامنے سڑک پر نظریں جمائے چلی جا رہی تھیں۔ وہ گرد سے بھری سڑک اور دریا کے کنارے پر نظریں جمائے چلی جا رہی تھیں۔ گرد اور مٹی میں ان کے چار پیروں کی پانچ پانچ انگلیوں کے نشان واضح تھے ایسی انگلیاں جن کے درمیان کافی خلا تھا۔

زینب کی انگلیوں کے نشان چھوٹے اور زیادہ واضح تھے کیونکہ اس کے پاؤں مضبوطی کے ساتھ پڑ رہے تھے۔ یہ انگلیاں مستقل اس کے کپڑوں سے الجھ رہی تھیں۔ وہ اپنے دائیں بائیں دریا کے پانی اور کھیتوں کی ہریالی کو دیکھتی جا رہی تھی جو حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مسجد سیدہ زینب کہاں ہوگی اور انہیں قاہرہ کی بس کہاں سے پکڑنا ہوگی۔ وہ بس جو انہیں باب الجدید لے جائے۔ ذکیہ نے ہانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنی بھتیجی کے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔ وہ اس کے سہارے چل رہی تھی۔ اس کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

جس جگہ سے دریا مڑتا تھا انہیں وہاں شہتوت کا ایک پیڑ کھڑا نظر آیا۔ پیڑ کے نیچے ایک بوڑھا آدمی اور ایک نوجوان عورت بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ٹوکری رکھی تھی۔ زینب نے وہاں ٹھہر کر ان سے بس کا پوچھا۔ بوڑھا بولا۔ ''بیٹی' یہاں انتظار کرو۔ ہم بھی الحدید ہی جا رہے ہیں۔''

''وہ دونوں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ بوڑھا مسلسل انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ پھر بولا۔ ''بیٹی' کیا تیری ماں بیمار ہے؟''

''یہ میری پھوپھی ہیں۔ میری ماں تو بہت پہلے مر چکی ہیں۔''

''اللہ ان پر اپنا کرم کرے۔ مرنا تو سب کو ہے مگر بیماری بہت بری چیز ہے۔ اللہ ان کی بیماری دور کرے۔''

زینب نے ساتھ بیٹھی نوجوان عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی نظریں دور افق پر جمی ہوئی تھیں جیسے اسے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ زینب نے بڑے میاں سے پوچھا ''چاچا' یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

''نہیں' یہ میری بیوی ہے۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''اس کی بھی طبیعت خراب ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا ہوا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ رات کو سوتی بھی نہیں اور اکیلی بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتی ہے۔ اسے

اندھیرے میں شکلیں نظر آتی ہیں اور راتوں کو اٹھ کر چیخیں مارتی ہے۔ میں اسے کئی پیروں فقیروں کے پاس لے گیا۔ انہوں نے اس کے لئے تعویذ دیئے۔ ہم نے اس کے جن اتارنے کے لئے ''زار'' بھی کرایا۔ میرے پاس جتنا پیسہ تھا سب خرچ کر دیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ شیخ عباس نے مشورہ دیا کہ عمرہ کے لئے میں اسے حجاز لے جاؤں اور اللہ کے گھر کے سامنے جا کر دعا کروں۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے گا۔ اور اس پر سے سایہ اترے گا۔ لیکن میں نے شیخ عباس کو بتایا کہ میں تو بہت غریب آدمی ہوں اور میرے پاس جو بھی پونجی تھی وہ اس کے تعویزوں وغیرہ پر صرف ہو چکی ہے۔ میرے پاس تو سفر خرچ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اسے السیدہ لے جاؤں۔ میں سیدہ زینب سے التجا کروں گا کہ وہ اس کے لئے اللہ سے دعا کریں کہ وہ اس کے گناہ معاف کر دے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اپنے ساتھ ایک ٹوکری انجیر لے جاؤں اور سیدہ کے مزار پر چڑھاؤں۔ خدا گواہ ہے میں نے اس سفر کے لئے در در بھیک مانگی ہے۔ اس سے میں نے انجیر کی یہ ٹوکری خریدی۔ اب میں السیدہ جا رہا ہوں۔ شاید اللہ ان کے طفیل میری سن لے۔''

''اللہ بہت بڑا ہے چچا میاں'' زینب بولی۔ ''وہ اسے اس حالت میں نہیں رہنے دے گا۔''

بڑے میاں نے نظر بھر کر ذکیہ کو دیکھا۔ وہ افق پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اسے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہی ہے۔ بڑے میاں نے سوال کیا۔ ''تم اسے السیدہ لئے جا رہی ہو۔ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو یہ کام کرے؟''

''اللہ کے سوا ہمارا اور کوئی نہیں ہے۔ ایک بھینس ہے جسے ہم ام سلیمان کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ وہ اسے چارہ ڈال دیا کرے گی۔ واپس آ کر ہم اس کا کام کر دیں گے۔''

''اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ سب کا بھلا کرے۔''

زینب نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ ''اے اللہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تجھے ہی پکارتے ہیں مشکل وقت میں تو ہی ہماری مدد کرے گا۔''

سورج کا گولا آسمان میں کافی اونچا ہو گیا تھا۔ زمین زیادہ گرم ہو گئی تھی اور ہوا

بند تھی۔ زینب نے پیڑ کے تنے سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک وہ بس کی آواز سے اٹھ گئی۔ بس قریب ہی آ کر رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی گرد کا ایک طوفان بھی اٹھا اور چاروں طرف چھا گیا۔ بس ایک طرف کو اتنی جھکی ہوئی تھی کہ اگر ذرا سا بھی اس جانب جھٹکا لگتا تو اسی طرف کو لڑھک جاتی۔ اس کا پچھلا حصہ دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔ اور اب بھی اس سے کالا کالا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ذکیہ زینب کا ہاتھ پکڑ کر بس پر سوار ہوئی۔ بڑے میاں نے بھی اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اوپر چڑھایا۔ وہ چاروں بھی انسانوں اور ٹوکریوں اور گٹھریوں کا حصہ بن گئے جو وہاں بھری ہوئی تھیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ گرم ہوا اور گرم گرم سانسوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس ہوا اور سانسوں میں گرد اور دھواں بھی ملا ہوا تھا۔ ذکیہ اور نوجوان عورت دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ فرش پر ہی بیٹھ گئیں۔ زینب اور بڑے میاں کھڑے رہے۔ بس اچانک چل پڑی جس سے زینب اپنے سارے بوجھ کے ساتھ پیچھے کھڑے بڑے میاں پر گر پڑی۔ بڑے میاں کا توازن جو بگڑا تو وہ دوسرے مسافروں پر گر پڑے۔ پل بھر میں کھڑے لوگ ان بیٹھے ہوئے لوگوں پر گر پڑے جنہوں نے بس کو ایک دوسرے پر رکھی ہوا کی تہوں اور گوشت کے واحد لوتھڑے میں تبدیل کر رکھا تھا۔ آخر بس نے اپنی رفتار آہستہ کر دی اور اب وہ دریا کے اونچے کنارے پر جا رہی تھی۔ جو مسافر گر پڑے تھے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بس کا ماحول ٹھیک ہو گیا۔ زینب اور بڑے میاں ساتھ ساتھ کھڑے رہے۔

بس اپنے بھاری بوجھ کے ساتھ چلتی رہی۔ کھڑکیوں کے شیشے مسلسل کھڑ کھڑ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی شیشے کا کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر باہر بھی گر جاتا۔ نشستیں اپنی جگہ سے ہل رہی تھیں اور ان کی وجہ سے بس میں کھڑ بڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر سے گزر رہی تھی جس پر بے شمار گڑھے تھے اس لئے کھڑ بڑ سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی بس پرزے پرزے ہو کر بکھر جائے گی۔ پہیوں کے درمیان مسلسل پانی گر رہا تھا۔ یہ پانی دراصل ایک بوڑھے مسافر کا پیشاب تھا۔ وہ بوڑھا اپنے مثانے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ بس کسی شرابی کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے سے دھویں کے بادل نکل رہے تھے اور ہر موڑ پر بس ایک طرف کو ایسے جھک جاتی کہ ڈر لگتا کہیں وہ دریا میں ہی نہ گر جائے مگر ڈرائیور آدھا کھڑا ہو کر پوری طاقت سے اسٹیرنگ کو گھماتا۔ بس اس تباہی سے بچ جاتی

MashalBooks.com

لیکن وہ کسی اور گڑھے میں اس زور سے گرتی کہ مسافروں کا دم نکل جاتا۔ ڈرائیور خاصہ تجربہ کار تھا وہ دریا اور گڑھوں سے بس کو اس طرح بچاتا کہ بس کے چاروں پہیئے بیک وقت دریا کے کنارے پر جم جاتے۔ اب ڈرائیور بیٹھ جاتا اور اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگتا۔ لگتا تھا اس کا بس چلے تو وہ چلتی بس میں ہی آنکھیں بند کر لے اور خواب خرگوش کے مشے لینے لگے۔ بس میں بیٹھے پگڑیاں باندھے' لمبے لمبے جبے پہنے مسافروں میں اس کا پیلا اور تجربہ کار چہرہ سب سے الگ نظر آ رہا تھا۔

ذکیہ آنکھیں بند کئے فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے گرد بیٹھے ایک دوسرے میں پھنسے لوگوں میں پریشان سی ہوگئی تھی۔ اس نے کبھی بس میں سفر نہیں کیا تھا' اتنی چھوٹی سی جگہ میں اتنے بہت سے لوگوں کو اس طرح پھنسے بھی نہیں دیکھا تھا اور اس طرح جھٹکے بھی نہیں کھائے تھے کہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس زور کا جھٹکا لگتا کہ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ اسے لگتا کہ زمین قلابازیاں کھا رہی ہے اور بس کی چھت پر چھلانگ لگا رہی ہے یا پھر بس الٹی چھلانگ رہی ہے۔ وہ بار بار اپنے جلابیہ کے گریبان میں تھوک رہی تھی اور کلمہ پڑھ رہی تھی جیسے یہ اس کا آخری سفر ہو اشھد ان لا الہ اللہ وہ اشھد ان محمد عبدہ ورسولہ۔ اسکے کانوں میں بس میں بیٹھے دوسرے لوگوں کی آوازیں بھی آتیں۔ وہ بھی اسی کلمہ کا ورد کر رہے تھے۔

ایک بار تو اسے ایسا لگا جیسے وہ مرگئی ہے اور مر کر پھر زندہ ہوئی ہے۔ بس دریا کنارے کنارے چلی جا رہی تھی۔ اس نے دریا کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے آس پاس لوگوں کے جسموں نے اسے ایسا گھیر رکھا تھا کہ وہ صرف بس کی چھت ہی دیکھ سکی جو ایسی کالی ہو رہی تھی جیسے اسے مسلسل دھواں لگتا رہا ہو۔

زینب نے اس کا کندھا ہلایا تو اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ بس رک گئی ہے۔

''ہمیں یہاں اترنا ہے'' اس نے زینب کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور نیچے اتر گئی۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو اس کا چہرہ اور بھی پیلا پڑ گیا اور آنکھیں زیادہ کالی ہوگئیں۔ وہاں دریا تھا نہ اس کا کنارہ' کچے گھر تھے نہ گرد بھری گلیاں۔ وہاں تو چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں' اونچی اونچی عمارتیں تھیں' کاریں تھیں جو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ ٹرامیں تھیں جن سے عجیب سی ٹن ٹن کی آواز نکل رہی تھی۔ لوگ بھی مختلف تھے۔ عورتیں اونچی ایڑی کے جوتے پہنے کھٹ کھٹ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے جو تنگ کپڑے پہن

رکھے تھے ان میں سے ان کی ٹانگیں اور سینہ آدھا کھلا نظر آ رہا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ سڑکوں پر اتنے دکھائی دے رہے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کتنے بہت سے ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب دوکانوں کی قطاریں تھیں۔ لوگ تیز تیز چل رہے تھے اور ایک شور سا مچا رہا تھا۔ انسانوں کی قطاریں ختم ہونے کو ہی نہیں آتی تھیں۔ اس نے زینب کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ساتھ چمٹی چل رہی تھی۔

''میرا سر چکرا رہا ہے زینب' سمجھ میں نہیں آتا میرا سر گھوم رہا ہے یا پھر آس پاس کی چیزیں گھوم رہی ہیں۔''

مگر زینب کا اپنا سر بھی چکرا رہا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں اردگرد حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑے میاں بھی زینب پر جھکے پڑ رہے تھے۔ نوجوان عورت نے انہیں زور سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ چاروں طرف لوگوں کے اس چلتے پھرتے ہجوم میں ایک دوسرے کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ حیرت سے ان کے منہ کھلے تھے اور آنکھیں بھاگتے دوڑتے لوگوں کے ساتھ ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

آخر انہوں نے ایک دوسرے کے پیچھے دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ وہ سڑک پر پاؤں رکھتے ڈر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جونہی ان کا پاؤں سڑک پر پڑا کسی بھی دوڑتی ہوئی کار کے نیچے آ جائیں گے۔ زینب نے ایک آدمی سے السیدہ کا پتہ معلوم کیا۔ اس آدمی نے ایک ستون کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں کھڑی ہو کر ٹرام کا انتظار کرو۔

وہ اس آدمی کی بتائی ہوئی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ وہاں لوگوں کا زبردست ہجوم تھا۔ زینب نے اوپر دیکھا تو بجلی کے تار اس کے سر پر یہاں سے وہاں تک تنے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بہت بڑی عمارت تھی اور تاروں کے پیچھے ایک بہت ہی بڑی تصویر تھی۔ جس میں ایک ننگی عورت چت لیٹی تھی اور اس کی ٹانگیں کھلی ہوئی تیں۔ تین آدمی اس پر پستول تانے کھڑے تھے۔

اس نے چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ ''بے شرم کہیں کے!''

ٹرام آئی تو دھکم پیل شروع ہو گئی۔ اترنے اور چڑھنے والے لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ پائیدان اتنا کمزور تھا کہ کسی وقت بھی اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ زینب لوہے کا ڈنڈا پکڑ اکر کھڑی ہو گئی اور ذکیہ کو اپنی طرف گھسیٹا۔ پھر نوجوان

عورت اوپر چڑھی اس کی بعد میاں آئے انہیں اپنی انجیروں کی ٹوکری کی فکر تھی۔ مگر جیسے ہی وہ اوپر چڑھے ٹوکری ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ٹرام کے پہیئے کے نیچے گر گئی۔ بڑے میاں نے اس کے ساتھ ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔ کوئی چیخا۔ اس کے بعد اور بھی بہت سی چیخیں سنائی دیں۔ انجیر ساری سڑک پر بکھر گئے تھے اور لوگوں کے پیروں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے سیٹی بجائی اور ٹرام چل پڑی۔

ذکیہ نے کچھ نہیں دیکھا کہ کیا ہوا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ٹرام چل رہی ہے یا رک گئی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ اسے چکر نہ آ جائے۔ اب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کا بدن ٹرام کی حرکت کے ساتھ ہل رہا تھا۔ زینب اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے سامنے چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے وہ لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہی تھی۔ اسے ایک طرف اونچی اونچی عمارتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے کئی عمارتوں پر وہی تصویر تھی جس میں ننگی عورت اپنی ٹانگیں کھولے لیٹی تھی اور اس کے سامنے تین آدمی پستول تانے کھڑے تھے۔ اسے لگا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے زینب سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''بڑے میاں'' زینب نے کہا۔ ''بڑے میاں ٹرام کے پہیوں میں گر گئے ہیں اور اب السیدہ جانے کے بجائے قصر اُلعینی ہسپتال چلے گئے ہیں۔''

ذکیہ نے کھڑکی سے باہر انگلی سے اشارہ کیا جیسے باہر کچھ ہو رہا ہو پھر آہستہ سے بولی۔ ''اللہ اکبر' یہاں ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے یا پھر تیری پھوپھی کا دماغ چل گیا ہے؟''

''اللہ آپ کو سلامت اور صحت مند رکھے۔ اس کا شکر ہے کہ آپ ٹھیک ہیں' السیدہ کی زیارت کے بعد انشاءاللہ آپ اور ٹھیک ہو جائیں گی۔''

'یا سیدہ اللہ آپ کے درجات بلند کرے۔'' ذکیہ نے زیرِ لب کہا۔

(13)

چھوٹی چھوٹی گلیوں اور ٹراموں سے بھری پڑی سڑک کی طرف سے آنے والے انسانوں کا جو ہجوم مسجد السیدہ کی جانب رواں دواں تھا ذکیہ اور زینب بھی اسی کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔ گوشت پوست کے یہ انسان مل کر گویا ایک ہی جسم بن گئے تھے۔ ان سب نے جلابیۓ پہن رکھے تھے۔ عورتوں نے کالی چادریں اوڑھ رکھی تھیں اس لئے انہیں مردوں سے الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ مجمع ایک جسم کی مانند تھا یہ سب لوگ ننگے پاؤں تھے۔ ان کے پیروں کی انگلیاں چپٹی تھیں ان کی ایڑیاں کالی اور پھٹی ہوئی تھیں اور ان کی ہتھیلیاں کھردری تھیں اور کدال اور ہل پکڑنے کی وجہ سے ان پر گٹے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے ہڈیوں سے بھرے اور پیلے تھے' آنکھیں کالی اور حیرت اور تکلیف سے پھٹی ہوئی یا غنودگی اور نیم بیہوشی کے عالم میں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ چل چل کر ہانپنے کی وجہ سے ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

ذکیہ نے زینب کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ ذرا سی بھی اس سے الگ ہوئی تو انسانوں کے اس سمندر میں کہیں کھو جائے گی۔ لیکن چلتے چلتے کچھ لوگ اچانک ان کے بیچ میں آ گئے اور ذکیہ زینب سے بچھڑ گئی۔ اب اسے زینب نظر نہیں آ رہی تھی مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنے آس پاس ہر چیز جانی پہچانی سی دکھائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ یہاں رہ چکی ہے۔ ان چیزوں کو وہ خوب پہچانتی ہے۔ لوگوں کے جسموں پر جو جلابیہ منڈھے ہوئے تھے وہ اس کے جلابیہ جیسے ہی تھے اور ان کے جسموں سے پسینے کی جو بو آ رہی تھی وہ بھی اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ ان کے چہرے' ان کے پاؤں' ان کے پیروں کی انگلیاں' ان کے چلنے اور دیکھنے کا انداز اس کی اپنی طرح ہی تھا۔ وہ انسانی جسموں کے اس

MashalBooks.com

ڈھیر کا حصہ تھی اور وہ ڈھیر اس کے جسم کا حصہ تھا۔ وہ اب بالکل خوف زدہ نہیں تھی اور اس نے زینب کو تلاش کرنا بند کر دیا تھا کیونکہ اب اسے ہر چہرہ زینب کا چہرا اور ہر آواز زینب کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ ان کا لہجہ اور آسمان کی طرف ان کے ہاتھ اٹھانے کا انداز اور ''یا اللہ تو ہم سب کی مدد کر'' کہنے کا طریقہ بھی زینب جیسا ہی تھا۔ وہ لوگ جس انداز سے کلمہ کا ورد کر رہے تھے اور وظیفے پڑھ رہے تھے ان سے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ سب زینب ہیں۔

ان میں بیمار تھے یا وہ لوگ تھے جن کی آنکھیں خراب تھیں۔ ان میں بوڑھے تھے' جوان تھے اور بچے تھے۔ ان میں مختلف فرقوں کے شیخ تھے' بھکاری تھے یا چور تھے۔ ان میں جادوگر تھے' نجومی تھے یا تعویذ گنڈہ کرنے والے تھے۔ ان میں خدا کے برگزیدہ لوگ بھی تھے اور شیطان صفت انسان بھی۔ ان سب کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور وہ زور سے کلمہ طیبہ یا وظائف کا ورد کر رہے تھے۔ ایک ہی سانس اور ایک ہی آواز میں وہ دعائیں مانگ رہے تھے۔

زینب نے بھی ذکیہ کو تلاش کرنا بند کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی اس ہجوم کا چہرہ ہی بن گیا تھا' اس اتھاہ سمندر کا ایک قطرہ' لاکھوں لباسوں میں سے ایک لباس' لامحدود کائنات کا ایک غیر مرئی ذرہ' ہوا میں لہراتے لاکھوں ہاتھوں میں سے دو ہاتھ۔ اور ہزاروں لاکھوں آوازوں میں سے ایک آواز جو ایک ہی دھن میں پکار رہی تھی' ایک ہی انداز میں آہ وزاری کر رہی تھی۔ ''یا اللہ ہماری سن لے۔ یا اللہ ہمیں معاف کر دے۔'' ذکیہ کی آواز ایک چیخ کی طرح اس کے دل سے نکل رہی تھی جیسے ذبح کی ہوئی گردن سے یا زخمی سینے سے آواز نکلتی ہے۔

زینب نے ''یا اللہ'' پکارا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جیسے کھڑے پانی پر چاندنی کا عکس۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسکے بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی جیسے اس کے اندر بخار بھرا ہو۔ جسم کا سرا خون اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کنوار پن کی چمک تھی۔ پہلی بار اس کا دل سارے انسانوں کے لئے دھڑک رہا تھا۔

جب وہ ''یا اللہ'' پکارتی تو اسے محسوس ہوتا کہ ہر پکار کے ساتھ اللہ اس کے قریب آتا جا رہا ہے۔ وہ اس کے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اس کی آواز سن رہا ہے۔

MashalBooks.com

اسے اپنے اوپر اس کی سانس سی محسوس ہو رہی تھی۔اس کا اپنا جسم اس کے اندر ضم ہو گیا تھا۔ وہ انجانے خوف سے لرز گئی' یہ خوف ایک گہرے صدمہ کی طرح تھا۔لیکن اس کے ساتھ ایک عجیب سی مسرت کا احساس بھی تھا۔ایک تسکین اور اطمینان کا احساس۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوشی سے خوب روئے' آنکھیں بند کرے اور اس میں کھو جائے۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس جسم سے اب وہ پورا پورا لطف اٹھائے جو ہر قسم کی بے چینی سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ایک ایسا لطف جو اس نے پہلے کبھی نہیں لیا تھا۔مگر اس کے اندر کہیں ایک ڈر' ایک افسردگی' ایک تھکن اور ایک پریشانی پھر بھی موجود تھی جو اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی تھی۔ حتیٰ کہ اسے آنکھیں تک بند نہیں کرنے دیتی تھی۔وہ وہاں نہ جانے کتنے گھنٹے سے آنکھیں پھاڑے اسی طرح بیٹھی تھی اور اس کے آس پاس لوگوں کا ہجوم رواں دواں تھا۔

یکلخت اس نے ایک آواز سنی۔کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا ''زینب۔''

اسے احساس ہوا جیسے یہ خدا کی آواز ہے۔وہ رات بھر اسے پکارتی رہی تھی اب وہ اسے بلا رہا تھا۔اس نے دھیرے سے کہا ''یا اللہ'' اور جواب آیا۔''زینب'' وہ اسکی جانب اس طرح متوجہ ہوئی جیسے خواب میں ہو۔وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر چل رہی ہے یا اڑ رہی ہے۔آہستہ آہستہ انسانوں کا ہجوم اور ان کی بے شمار آوازیں پیچھے رہ گئیں۔اب وہ تنہا تھی اور صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔''زینب'' اس نے دیکھا کہ گہری دھند یا بادلوں میں سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔وہ کسی مرد یا عورت کا چہرہ نہیں تھا۔وہ کسی بچے یا بوڑھے کا چہرہ بھی نہیں تھا۔وہ ایسا چہرہ تھا جس کی کوئی جنس نہیں تھی جیسے ام صابر کا چہرہ۔اس نے کالی چادر کے بجائے سر پر سفید دستار باندھ رکھی تھی جس نے اس کے آدھے ماتھے اور آنکھوں کو چھپا رکھا تھا۔چہرے پر نقش سے تھے جیسے چیچک اپنے نشان چھوڑ گئی ہو۔آنکھیں چھوٹی اور پلکوں کے بغیر تھیں۔بلکہ ایسا لگتا تھا کہ پپوٹے بھی نہیں ہیں۔صرف دو کالے سوراخ اسے دیکھ رہے تھے۔

''کیا تو زینب ہے' کفروی کی بیٹی؟''۔آواز نے اس سے سوال کیا۔

ڈر کے مارے اس کے منہ سے نکلا ''جی''۔اور اس کے بہت اندر کسی نے سوال کیا ''اتنے بہت سے لوگوں میں اس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟'' پھر اندر سے ہی آواز آئی ''اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔الحمد اللہ'' اس نے کہا۔

''تیری پھوپھی ذکیہ کہاں ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

اور اس کے اندر پھر آواز گونجی یہ تو میری پھوپھی ذکیہ کو بھی جانتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے!

اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ اس کی پھوپھی کدھر چلی گئیں۔ وہ اسے کہیں نظر نہ آئیں۔ لیکن اچانک اسے احساس ہوا کہ ذکیہ کا جسم تو اس کے ساتھ ہی چمٹا ہوا ہے اور وہ اس کے ساتھ لگی کانپ رہی ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں قرآن کی جو آیات تلاوت کر رہی ہے ان کی آواز بھی اس کے کانوں میں آ رہی ہے۔

وہ آدمی ذکیہ کے قریب آیا اور اپنا گٹھیلا اس کے جلابیہ کی طرف لے گیا پھر تیزی کے ساتھ اس کے گلے میں پڑا ہوا تعویذ اس نے اتار لیا۔ پھر اس نے کچھ پڑھا' توقف کیا اور دوبارہ وہ تعویز ذکیہ کے گلے میں ڈال دیا۔ ذکیہ یہ سارا عمل انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی وہ جھکے گی اور اس شخص کے پیروں سے لپٹ جائے گی۔ جیسے ہی اس نے وہ تعویز ڈالا ذکیہ نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور نہایت عقیدے کے ساتھ اسے بوسہ دیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ ذکیہ کے ہاتھوں میں ہی رہنے دیا اور زینب کی طرف متوجہ ہوا۔

''تیری پھوپھی بہت بیمار ہے۔ وہ بیمار ہے کیونکہ تو مسلسل اللہ کی نافرمانی کر رہی ہے اور وہ بھی تیری ہمت بڑھاتی ہے۔ لیکن اللہ رحیم و کریم ہے۔ تم دونوں اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلو گی تو وہ ضرور معاف کر دے گا۔ اگر وہ چاہئے تو اس کی بیماری بھی دور کر سکتا ہے۔ بے شک وغفور الرحیم ہے۔''

انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بیک زبان کہنا شروع کیا۔ ''ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں' تمام تعریفیں تیرے لئے ہی ہیں۔ تو بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تیرا فیضان سب کے لئے ہے۔ یا اللہ۔''

''تم دونوں آج رات سیدہ کے سائے میں گزارو گی'' اس شخص نے کہا۔'' کل صبح سورج نکلنے سے پہلے تم کفرالنین روانہ ہو جاؤ گی۔ وہاں جا کر تم نیل کے تازہ پانی سے نہاؤ گی اور نہاتے ہوئے کلمہ طیبہ پڑھتی جاؤ گی۔ کپڑے بدلنے کے بعد نماز پڑھو گی۔ اس کے بعد دس مرتبہ آیت الکرسی پڑھو گی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح زینب پھر نیل کے تازہ پانی سے غسل کرے گی اور تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھے گی۔ پھر فجر کی نماز پڑھے گی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا دروازہ کھولے گی اور سامنے منہ کر کے دس بار الحمد اللہ پڑھے گی۔

MashalBooks.com

اپنے سامنے وہ لوہے کا بڑا پھاٹک دیکھے گی۔ وہ اس پھاٹک پر جائے گی' اسے کھولے گی اور اندر داخل ہو جائے گی۔ پھر اس وقت تک اس دروازے سے باہر نہیں آئے گی جب تک اس کا مالک اسے اجازت نہ دے۔ وہ بہت معزز اور شریف آدمی ہے' ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس کے خاندان پر اللہ اور رسول پاک کا سایہ ہے۔ وہ نیک اور پرہیز گار لوگ ہیں۔ اس عرصے میں ذکیہ بھینس لے کر کھیت پر جائے گی' ہل جوتے گی اور ظہر کی نماز تک کام کرے گی۔ اذان کی آواز سنتے ہی وہ نماز ادا کرے گی۔ فرض کے ساتھ سنتیں بھی پڑھے گی۔ نماز کے بعد وہ دس بار الحمد اللہ کا ورد کرے گی پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر تیئیس مرتبہ کہے گی۔ ''یا اللہ معاف کر دے'' اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے ہاتھ منہ پر پھیرے گی اور کھڑی ہو جائے گی۔ انشاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

ذکیہ نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں زور سے بھینچا اور اپنے ہونٹ اس پر چپکا دیئے۔ وہ کہہ رہی تھی ''میں تیری شکر گزار ہوں اے اللہ میں تیری شکر گزار ہوں اے اللہ۔''

ادھر زینب بار بار الحمد اللہ کا ورد کر رہی تھی۔ وہ ایسی مبہوت ہو چکی تھی کہ حاجی اسمٰعیل نے ان بزرگ کو جو دس پیاستر دینے کی ہدایت کی تھی وہ بھی بھول گئی۔ مگر اس شخص نے خود ہی وہ پیسے مانگ لئے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چادر کی گرہ کھولی اور دس پیاستر نکال کر اس شخص کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ اس طرح چوما جیسے وہ نذرانہ اس نے خدا کو پیش کیا ہو۔ اس کے اندر کوئی آواز برابر کہتے جا رہی تھی۔ خدا کی پناہ۔ یہ شخص تو کفر النین کو بھی جانتا ہے۔ اسے ہمارا گھر بھی معلوم ہے اور اسے لوہے کے پھاٹک کا علم بھی ہے کہ وہ ہمارے گھرے کے سامنے ہے۔''

وہ اچانک جس طرح نمودار ہوا تھا اسی طرح پلک جھپکتے اس ہجوم میں غائب بھی ہو گیا۔ اب ذکیہ اور زینب حیرت اور کمتری کے احساس میں ڈوبی ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی وہاں کھڑی تھیں۔ وقفہ وقفہ کے بعد وہ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ لیتی تھیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ سچ تھا؟ وہ کوئی خواب یا ان کا خیال تو نہیں تھا۔ کیا انہوں نے واقعی خدا کی آواز سنی ہے؟ کیا انہوں نے خدا کو یا اس کے پیغمبر یا کسی ولی اللہ کو اپنی آنکھوں نے واقعی خدا کی آواز سنی ہے؟ کیا انہوں نے خدا کو یا اس کے پیغمبر یا کسی ولی اللہ کو اپنی آنکھوں

سے دیکھا ہے؟ ایسے ولی اللہ کو جسے خدا نے علم غیب سے نواز ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے گرد جو ایک فولادی شکنجہ کسا ہوا تھا اب وہ کھل گیا ہے۔ اب اس کا جسم ہلکا ہو گیا ہے۔ اب اسے اپنی بھتیجی کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پیروں میں طاقت آ گئی تھی۔ اب وہ خود چل سکتی تھی۔

زینب نے اپنی پھوپھی کو کسی سہارے کے بغیر چلتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی پھوپھی خود چلی رہی تھیں۔

''پھپھو، تم تو پہلے ہی ٹھیک ہو گئیں۔'' اس نے عقیدت بھری آواز میں کہا ''دیکھو تو اب خود ہی چل رہی ہو۔''

ذکیہ بولی۔''ہاں، اب میرا جسم بھاری نہیں لگ رہا ہے۔ یا اللہ بے شک تو بڑا رحیم و کریم ہے۔''

''اللہ اکبر۔'' زینب کے منہ سے نکلا۔''میں کہتی نہیں تھی کہ اللہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ ہمیں اسے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہئے اور صبر سے کام لینا چاہئے۔''

''ہاں میری بچی، تو ہمیشہ یہی کہتی تھی۔''

''میں نے ہمیشہ خدا کی نافرمانی کی۔ کبھی نماز نہیں پڑھی۔ اور پھپھو تم نے بھی تو یہی کیا۔''

''میں نے تو کبھی نماز پڑھنے سے انکار نہیں کیا۔ وہ تو شیطان مجھے بہکاتا تھا۔''

''انشاء اللہ۔ اب شیطان ہمیں نہیں بہکائے گا۔ بدروح کا سایہ تمہارے اوپر سے اتر جائے گا۔ اور ہم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلیں گے۔''

''تجھے یاد ہے جو شیخ نے کہا ہے؟ سب کچھ یاد ہے نا؟'' ذکیہ نے سوال کیا۔ ''میرا جسم اس وقت کانپ رہا تھا اس لئے مجھے ساری باتیں یاد نہیں ہیں۔ کہیں ہم کچھ بھول نہ جائیں۔''

''تم فکر نہ کرو۔ ایک ایک حرف میرے دل پر نقش ہو گیا ہے۔''

''خدا تجھے اس کا اجر دے گا۔'' ذکیہ بولی۔

(14)

چنانچہ اس روز سورج نکلنے سے پہلے زینب نے نیل کے تازہ پانی سے بھرا گھڑا سر سے اوپر اٹھایا اور اپنے جسم پر پانی ڈالا۔ اس نے اپنے بدن کو ملنا شروع کیا اور کلمہ کا ورد شروع کیا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ و اشھد ان محمد عبدہ و رسولہ'' (میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں) جسم کے ہر حصے پر پانی ڈالتے ہوئے وہ یہ کلمہ تین بار پڑھتی۔ اس نے اپنے لمبے کالے بال سکھائے۔ چوٹی باندھی اور صاف جلابیہ پہنا' سر کے گرد کالی چادر لپیٹی۔ ڈرتے اور جھجکتے قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر ایک دھکے کے ساتھ اسے کھولا۔

افق پر نارنجی روشنی نمودار ہونے لگی تھی لیکن ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس مقام پر اپنی نظریں جمائیں جہاں سے سورج طلوع ہونے والا تھا اور قرآن کی پہلی آیت دس مرتبہ پڑھی۔ پھر وہ آہنی پھاٹک کی طرف بڑھی۔ اسے اب بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن اس کے قدم کسی جھجھک کے بغیر اٹھ رہے تھے۔ پھاٹک کے سامنے پہنچی تو پورے بدن میں جھرجھری سی پھیل گئی۔ مگر یہ جھرجھری خوف یا شک وشبہ کی نہ تھی بلکہ انتہائی خوشی ومسرت کی جھرجھری تھی۔ اب وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اس کا جسم خوش گوار توقعات سے اکڑا ہوا تھا۔ جلابیہ کے نیچے اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور کالی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں کہ شاید وہاں سے کوئی اشارہ ہو' کوئی غیر متوقع واقعہ رونما ہو کیونکہ خدا کے حکم کی پاسداری کی جا رہی تھی۔

میئر نے اسے آتے دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس کے

MashalBooks.com

چہرے، اس کی آنکھوں، اور اس کی چال سے اس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ زینب ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ دیکھا۔ وہاں وہی تھی۔ اس نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''تجھے یہاں کس نے بھیجا ہے زینب؟''

''مجھے اللہ نے یہاں بھیجا ہے'' زینب کا جواب تھا۔

''مگر تو اتنی صبح کیوں آئی ہے؟''

''خدا کی یہی مرضی تھی۔'' زینب اس طرح بولی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

میٹر مسکرایا پھر اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے دانت صاف کئے، منہ دھویا پھر آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور مسکرایا۔ اس کے اندر سے قہقہے پھوٹے پڑ رہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''پورا شیطان ہے۔ بلکہ شیطان کا بھی باپ ہے تو حاجی اسمٰعیل۔ تجھ جیسا مکار اور چالاک اور کوئی نہیں ہوگا''

وہ باہر آیا اور اپنی گھڑی تلاش کرنے لگا۔ گھڑی تپائی پر رکھی تھی۔ اس کی سوئیاں چھ بجا رہی تھیں۔ وہ مسکرایا اور اپنے دل میں کہا ''اتنی صبح آج تک میرے پاس عورت نہیں آئی۔ مجھے پہلے چائے کی ایک پیالی پی لینا چاہئے تاکہ آنکھیں کھل جائیں۔''

زینب ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا اور ایسی آواز میں جس میں بچوں کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔ اس سے کہا۔ ''سنو زینب۔ میں چائے پینا چاہتا ہوں۔ تمہیں آتی ہے چائے بنانا؟''

''جی مالک، مجھے آتی ہے۔'' زینب نے اس آواز میں جواب دیا جس سے اس کی فرماں برداری اور مالک کو خوش کرنے کی خواہش جھلک رہی تھی۔

''میرے ساتھ آؤ میں تمہیں باورچی خانے کا راستہ دکھاؤں۔ تم چائے بناؤ اتنے میں میں تیار ہوتا ہوں۔''

زینب نے باورچی خانے میں سفید چینی کا واش بیسن، میٹل کا چمکتا نل، رنگین دیواریں اور آسانی کے ساتھ جلنے والا چولہا دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ جب پانی ابلنے پر کیتلی سے سیٹی کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑی۔ پھر وہ چاندی کے چمچوں، چھریوں اور چینی کے برتنوں میں جیسے کھو گئی۔ چائے کے کپ رنگ برنگے پھولوں اور تصویروں سے سجے ہوئے تھے۔ وہاں ہر چیز نئی تھی۔ ایسی چیز جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے یوں لگا

جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اللہ کے سامنے ہے۔ اس نے اللہ کی تسبیح وتمجید شروع کر دی۔ وہ جو چیز بھی ہاتھ میں لیتی اس کی انگلیاں لرزنے لگتیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا' اس کا سانس پھولا ہوا تھا جس سے سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

چائے کا ایک کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے اتنا بڑا جرم کر دیا تھا۔ دودھ جیسے سفید فرش پر چینی کے رنگین ٹکڑے شیشے کی طرح دمک رہے تھے۔ کپ ٹوٹنے کی جس وقت آواز آئی اس وقت میسّر گرم پانی سے غسل کا لطف لے رہا تھا۔ کپ ٹوٹنے کی آواز کے بعد اس نے زور سے آہ کی آواز بھی سنی۔ وہ مسکرایا اور اس کے ہاتھ نے سینے اور پیٹ پر صابن ملنا شروع کر دیا۔ ''یہ گنوار لڑکیاں بھی کتنی مزیدار ہوتی ہیں۔ ان کا کنوارا بدن اپنی آغوش میں لینے پر کیا لطف آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے گلاب کا تازہ کھلا ہوا پھول توڑ رہے ہوں۔ قاہرہ کی نفاست پسند عورتیں کتنی بری ہوتی ہیں' جیسے اس کی اپنی بیوی' کہ آنکھوں میں بالکل شرم وحیا نہیں ہوتی۔ میں جب اس کا جسم سہلاتا ہوں تو اس میں ذرا سی بھی تھرتھری پیدا نہیں ہوتی۔ اسے کتنا ہی زور سے بانہوں میں دباؤں حتیٰ کہ اسے کاٹ بھی لوں تب بھی اسے کچھ نہیں ہوتا۔

وہ گلابی رنگ کا ریشمی سلیپنگ سوٹ پہنے باہر آیا۔ اس نے دیکھا زینب ابھی تک دیوار کے ساتھ سکڑی کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ سینے پر رکھے ہیں' منہ کھلا ہے جیسے سانس لینا دشوار ہو رہا ہو اور نگاہیں چینی کے ٹکڑوں پر جمی ہیں۔ ان ٹکڑوں پر جو لمحہ بھر پہلے ایک نہایت خوبصورت کپ تھا جسے اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے صحت اور طمانیت پھوٹ پڑ رہی تھی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنی بیش قیمت چیز کو دیکھتا ہے۔ اس کے موٹے کالے بال دو چوٹیوں میں پیچھے پیٹھ پر لٹک رہے تھے۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا جسے سورج نے تانبہ بنا دیا تھا۔ اس کی حیا نے میسّر کے دل میں کھلبلی پیدا کر دی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ قدرتی طور پر لال تھے اور ان پر ہلکی سی نمی تھی جیسے صبح کی اوس۔ اس کی چھاتیاں گول تھیں اور سخت اور تھوڑی سی اوپر کو اٹھی ہوئیں۔ اس کے صحت مند خطوط صاف نظر آ رہے تھے۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ وہ اوپر نیچے ہو رہی تھیں جیسے اس کا تیز دھڑکتا

MashalBooks.com

دل نہیں بھی اپنے ساتھ دوڑا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں۔ ان میں آنسوؤں کی نمی تھی جیسے کوئی بچہ ڈرا کھڑا ہو۔

وہ اس کے پاس آیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا ''تم رو رہی ہو زینب؟''

اس نے سر جھکا لیا اور دھیرے سے بولی۔ ''وہ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔''

اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے۔ میٹر کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون ایک جگہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور پیار کے ساتھ باقی آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھ دیئے۔

''ڈرو نہیں زینب۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''کپ اور کپ کا مالک سب تمہارے ہیں۔''

وہ اسے اپنی بانہوں میں لینا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔ اگر اس وقت اس نے ایسا کیا تو وہ اور ڈر جائے گی۔ اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک وہ اپنے نئے ماحول اور ان سب چیزوں سے مانوس نہ ہو جائے۔ وہ تو ہر چیز پہلی بار دیکھ رہی ہے۔

ادھر ذکیہ بھینس کو کھیت پر لے گئی تھی اور اسے ہٹ کے ساتھ باندھ کر کدال سے زمین کھودنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنے کان کھڑے کرتی کہ کہیں ظہر کی اذان تو نہیں ہو رہی ہے۔ آخر جب حمزوی کی اذان کی آواز گونجی تو سورج اس کے سر پر آ گیا تھا اور پسینہ پانی کی طرح اسکے روئیں روئیں سے بہہ کر اس کی گردن، اس کی پیٹھ اور سینہ تک جا رہا تھا۔ وہ پسینہ اس کی ٹانگوں کے درمیان بھی بہہ رہا تھا۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں وہ اس کا پیشاب نہ ہو جسے وہ روک نہ سکی ہو۔ جوں ہی اذان ختم ہوئی اس نے اپنا کدال ایک طرف رکھا اور چشمے کے کنارے پہنچ گئی۔ اس نے وضو کیا پھر چشمے کے کنارے ہی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے فرض اور سنتیں دونوں ادا کیں۔ نماز کے بعد اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی دس مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا ''یا اللہ میرے گناہ معاف کر دے۔'' یہ دعا اس نے تیس مرتبہ مانگی۔ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد توقف کیا۔ اسے لگا کہ اس کے اندر ایک عجیب سا سرور اور سکون بھرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وہیں سو جائے۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو گئے اور وہ چشمے کے کنارے ہی

لیٹ کر گہری نیند سو گئی۔

دوپہر کی دھوپ کتنی تیز اور کتنی ہی گرم کیوں نہ ہو وہ میئر کے محل کی موٹی دیواروں کے اندر کبھی داخل نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی میئر کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا سارا جسم آگ میں پھنک رہا ہے۔ جیسے وہ ننگے بدن چل چلاتی دھوپ میں پڑا ہے۔ وہ ابھی تک ریشمی سلیپنگ سوٹ پہنے تھے اور آرام کرسی پر بیٹھا صبح سے وہ صفحہ الٹ دیا۔ پھر وہ بڑے لوگوں کی مصروفیات اور اہم تقریبات کی خبریں پڑھنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ رقاصہ جس کا نام طوبیٰ تھا اس نے طلاق لے لی ہے' ایکٹریس نوسا چوتھی شادی کر رہی ہے اور مغنی عبدالرحمٰن اپنڈکس کا آپریشن کرانے ہسپتال میں داخل ہوگیا ہے۔ اس نے کھیلوں کی خبریں پڑھنے کے لئے صفحہ الٹا مگر اس کی نظر بھر اپنے بھائی کی تصویر پر پڑی۔ آخر اس نے اس تصویر کا کیپشن پڑھا۔ مرکزی کابینہ میں تبدیلی کی گئی تھی اور اس کا بھائی اب زیادہ اہم وزیر بن گیا تھا۔ اس نے غصہ سے ہونٹ سکیڑے۔ مجھ سے زیادہ اسے اور کون جانتا ہے۔ ظاہر ہے میں اس کا بھائی ہوں۔ میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کتنا ست اور کوڑھ مغز انسان ہے' بالکل کولھو کے بیل کی طرح جو ایک ہی جگہ چکر لگا رہا ہو۔

اس کے ہاتھ سے اخبار گر گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں لیکن اچانک اسے یاد آیا کہ اسے اپنی بیوی کو ٹیلی فون کرنا ہے اور معلوم کرنا ہے کہ اس کے بیٹے کا امتحان کیسا رہا۔ ابھی وہ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے ہی والا تھا کہ اسے پانی گرنے کی آواز آئی۔ اسے یاد آیا کہ صبح اس کے گھر زینب آئی ہے۔ اس نے سارے گھر کی صفائی کر لی ہے اور اب وہ غسل خانہ صاف کر رہی ہے۔ اچانک اسے ایک خیال آیا کہ ابھی ابھی کیوں نہ غسل خانے جایا جائے اور اسی وقت قسمت آزما لی جائے؟ لیکن یہ خیال اس نے رد کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ زینب اپنی بہن نفیسہ کی طرح بھولی بھالی نہیں ہے۔ زینب کے ساتھ زیادہ احتیاط اور زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ زینب کے ساتھ وہ اتنی احتیاط کیوں کر رہا ہے۔ وہ اس سے کیوں ڈر رہا ہے؟ کیا وہ اس لئے اس سے ڈر رہا ہے کہ وہ نفیسہ کی بہن ہے؟ ٹھیک ہے نفیسہ کی بات ابھی تک چھپی ہوئی ہے لیکن کیا پتہ کسی کو پتہ ہی ہو۔ ہوسکتا ہے اس بار بات چھپی نہ رہے۔ اس نے اپنا ڈر دور بھگانے کی کوشش کی۔ کیسے پتہ چل سکتا ہے کسی کو؟ وہ تو ہر قسم کے قانون ہر قسم کے شبہات اور ہر طرح کے اخلاق و آداب سے ماورا ہے۔ کفر النین میں کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس پر شک کرے۔

انہیں اللہ پر تو شک ہوسکتا ہے اس پر نہیں ہوسکتا۔...... یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔

پھر اسے یاد آیا کہ کفرالنین میں تین آدمی ایسے ہیں جو اس کی ہر بات جانتے ہیں۔ گاؤں کا پولیس افسر، مسجد کا امام اور حجام۔ ان تینوں کے بغیر وہ گاؤں پر حکومت بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے مددگار اور اس کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ ان کے ذریعہ ہی وہ گاؤں کے لوگوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ مگر وہ اس کے راز جانتے ہیں۔ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا دل کہتا ہے کہ ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ذرا سا بھی چوکا تو وہ الٹا اسے دھوکا دیدیں گے۔ وہ ہر وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ اس نے انھیں باور کرایا ہوا ہے کہ وہ سوتے میں بھی جو سانس لیتے ہیں اس کی آواز بھی اسے پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر ان میں سے کسی نے ذرا سا بھی دھوکا دینے کی کوشش کی یا ذرا بھی دم ہلائی تو اس کی دم کاٹ دی جائے گی اور اس کے گلے کی بھی خیریت نہیں ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی تھوک نگلا۔ اس کے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سارا غصہ اس وقت تھوک دے۔ وہ ان تینوں سے نفرت کرتا تھا۔ انہیں سخت ناپسند کرتا تھا۔ سب سے زیادہ غصہ اسے اس بات پر تھا کہ اسے تینوں کی ضرورت تھی اور وہ ان تینوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی شامیں ان کے ساتھ باتیں کرنے اور ہنسنے کھیلنے میں گزارتا تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ اس کے دوست ہیں۔ دوست ہی نہیں واحد دوست ہیں۔

وہ آرام کرسی سے اٹھا اور غسل خانے میں جا کر واش بیسن میں اس نے تھوکا۔ پھر پانی سے غرارے کئے تاکہ منہ کی کڑواہٹ دور ہو جائے۔ وہ کھڑا آئینے میں اپنی شکل دیکھتا رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے پیچھے زینب باتھ ٹب کو رگڑ رگڑ کر چمکا رہی ہے۔ اس نے ٹب کو شیشے کی طرح چمکا دیا تھا۔ اس کا جلابیہ پانی میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی چھاتیاں اور رانیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی نظروں کے سامنے ننگی ہو گئی ہے۔ اسے لگا کہ گرم گرم خون اس کے پیٹ میں جمع ہو گیا ہے۔ وہ زینب کے جسم پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

زینب نے اپنا سر ٹب پر سے اٹھایا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے میئر کی نیلی آنکھیں اپنے جسم پر عجیب انداز سے گڑی دیکھیں۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ دیوار سے پناہ طلب کر رہی ہو۔ مگر پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پاؤں چکنے فرش پر پھسلا اور وہ گر گئی۔

وہ اٹھنے کے لئے فرش پر اپنے ہاتھ بھی رکھنے نہیں پائی تھی کہ میسّر کے ہاتھوں نے بڑھ کر اس کی کمر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ وہ اسے اٹھا رہا تھا۔ اسے اٹھائے ہوئے میسّر کی انگلیاں زینب کے ساتھ مس ہوئیں اور اس کے جسم میں گرم گرم خون دوڑ گیا پھر اس نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ چوری چوری اس کا سینہ سہلا رہا ہے۔

زینب نے گھٹی گھٹی چیخ ماری۔ یہ چیخ اس تکلیف کی وجہ سے بھی تھی جو میسّر کے ہاتھ اس کے سینے کو دبا کر اسے پہنچا رہے تھے اور اس خوف کی وجہ سے بھی تھی جو اس کے سارے بدن میں پھیل رہا تھا اور جس کے ساتھ اسے پہلی بار عجیب سے سرور کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے سینے پر سے بہت بھاری بوجھ اتر رہا ہو جیسے وہ آزاد ہو رہی ہو۔ اس کے ناتجربہ کار جسم پر سرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اپنا جسم اور اپنی روح اس کے حوالے کر دینا چاہئے۔ اسے اپنا عہد پورا کرنا چاہئے اور خوش ہونا چاہئے کہ اس نے اپنا عہد نبھایا ہے۔

میسّر کے ہاتھ اب اس کی ٹانگوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے اس کا جلابیہ اٹھالیا تھا اور وہ گھٹی ہوئی آواز میں سرگوشی کر رہا تھا۔ ''جلابیہ اتار دے زینب ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

اس نے جلابیہ اتارنے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا اس لئے اس نے اسے زور سے کھینچا جس پر وہ پھٹ گیا۔ زینب نے چیخ ماری ''میرا جلابیہ۔ میرے پاس یہی جلابیہ تھا۔''

میسّر نے باقی جلابیہ بھی تار تار کر دیا۔ اسے زور سے اپنے بازوؤں میں دبایا اور اس کے کان میں کہا ''میں تجھے ایسے ہزاروں جلابیئے لا دوں گا۔''

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور گرم پانی کا نل کھول دیا۔ اب زینب کے بدن پر گرم پانی پڑ رہا تھا۔ میسّر نے اپنے ہاتھوں سے مل مل کر زینب کو نہلایا۔ اس کے بدن پر سے صبح سے اب تک کی ساری گرد اس نے دھو ڈالی۔

پھر اس نے نرم نرم تولیہ سے اس کا جسم ایسے سکھایا جیسے ایک ماں اپنے بچے کا جسم پونچھتی ہے۔ تولیہ سے چنبیلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ زینب بالکل خاموش رہی۔ وہ اس وقت بھی خاموش رہی جب وہ اسے ہاتھوں میں اٹھا کر بستر تک لے گیا۔ پھر اس نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔

(15)

مرغ کی بانگ کے ساتھ ہی شیخ حمزوی نے آنکھیں کھول دیں۔ یا شاید ان کی آنکھیں پہلے ہی کھل گئی تھیں اور وہ وہی نظارہ دیکھ رہے تھے جو ہر روز دیکھا کرتے تھے اور اس حیرت میں غرق تھے جو سچی اور معصول حیرت نہیں تھی اور جس میں شک کی آمیزش تھی۔ وہ شک جو شیخ حمزوی کے دل و دماغ میں چبھن سی پیدا کر رہا تھا اور وہ شک جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ لیکن شک کی بھی اپنی خاصیت ہوتی ہے کیونکہ اکثر اوقات شک محسوس نہیں ہوتا بلکہ یقین کی حد کو چھونے لگتا ہے۔ وہ غیر متنازعہ حقیقت معلوم ہوتا ہے ایسا سچ خدا کا وجود۔

صبح کی پتلی لمبی انگلی کھڑکی کی درز میں سے اندر آئی اور اس نے فتیجہ کے چہرے کو چھوا۔ وہ اس کے چہرے کے نصف حصے پر پڑی جو حمزوی کی طرف تھا اور راکھ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں جیسے وہ سوتے میں بھی دیکھ رہی ہے۔ اس کی ناک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور ہونٹ اتنی زور سے بند تھے جیسے اسے خدشہ ہو کہ سوتے میں ان کے اندر کچھ چلا جائے گا۔ صبح کی مدہم روشنی میں اس کی ملائم گوری گردن نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ روشنی اس کے ملائم سینے تک جا رہی تھی جو ابھرا ہوا تھا اور جس کے اوپر سے کپڑا ہٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بچہ چمٹا ہوا تھا۔ بچے نے منہ اور ہاتھوں سے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے بچے کو اپنے ساتھ چمٹا رکھا تھا جیسے وہ ڈرتی ہو کہ کوئی طاقت بچے کو اس سے چھین کر نہ لے جائے۔

شیخ حمزوی کی نگاہیں اس چہرے پر لگی ہوئی تھیں جو آدھا ان کی طرف تھا۔ وہ حیرت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا چہرے کا یہ حصہ اس

حصے سے مختلف ہے۔ جس حصے تک روشنی نہیں پہنچ پا رہی ہے اور جدھر وہ چہرے کے جانے پہچانے نقوش دیکھ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ انہیں یقین تھا کہ صبح کی روشنی نے جس چہرے کے نقوش واضح کئے ہیں وہ ان کی بیوی فتحیہ کا چہرہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اس سے بالکل مشابہت نہیں رکھتا۔ ناک اس کی تھی' منہ بھی اسی کا تھا' گردن اور سینہ بھی اس کا تھا ہر چیز اسی کی تھی مگر کچھ تبدیل ہو گیا تھا' کوئی بہت ہی اہم چیز بدل گئی تھی جس کی وہ وضاحت نہیں کر سکتے۔ انھیں اس بات میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ وہاں جو عورت لیٹی ہے وہ فتحیہ ہے' وہ ان کی بیوی ہی ہے۔ انہیں اس پر پورا پورا یقین تھا وہی یقین جو اللہ کی ذات پر تھا اور یہی یقین انہیں پریشان کر رہا تھا۔

اس وقت جو بھی انہیں دیکھتا یہی کہتا کہ اس شخص کو کسی چیز کا بھی یقین نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں پوری کھلی تھیں لیکن ان کی جلد ہلکی سی لرز رہی تھی۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے اندر آئی اور ان کے چہرے پر پڑی۔ اس پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس روشنی نے چہرے کے نیچے ایسا سایہ کر دیا تھا کہ وہ ایک کے بجائے دو چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ اوپر کا چہرہ ان کا اصلی چہرہ تھا جسے کفر النین کا بچہ بچہ جانتا تھا لیکن نچلا چہرہ وہ تھا جسے کوئی نہیں جانتا تھا کوئی جان بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے کسی نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ چہرہ فرشتہ کا بھی ہو سکتا تھا اور شیطان کا بھی۔

وہاں لیٹے ہوئے شیخ حمزوی کو محسوس ہوا کہ وہ اللہ سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اتنے دور وہ پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ بعض اوقات تو وہ اپنے آپ کو اللہ کے بہت ہی قریب محسوس کرتے تھے جیسے جمعہ کی نماز کے وقت جب سارا گاؤں اور میئر بھی ان کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے اور کوئی ہونٹ' کوئی آنکھ اور کوئی ہاتھ بھی نہیں ہل رہا تھا' حتیٰ کہ قرآن کی تلاوت بھی تنہا وہ خود ہی کر رہے ہوتے تھے۔

اس وقت وہ اپنے آپ کو تمام لوگوں سے زیادہ اللہ کے نزدیک تصور کرتے تھے۔ ان لوگوں میں میئر بھی شامل تھا۔ اس وقت ان کے جسم میں ایک سرور انگیز جھرجھری سی پیدا ہوتی' وہی جھرجھری جو بچپن میں دوسرے بچوں کو اینٹیں مار کر بھگانے پر ان کے جسم میں پیدا ہوتی تھی۔ نماز کے دوران وہ دانستہ طور پر قاعدے رکوع اور سجدے میں کافی وقت لگاتے۔ اس وقت وہ اپنے پیچھے کھڑے میئر اور دوسرے لوگوں پر خاص توجہ رکھتے کہ اس طرح وہ ان کی ذرا ذرا سی حرکت کے غلام ہیں اور یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کب رکوع یا

MashalBooks.com

سجدے میں جاتے ہیں۔

لیکن وہ کتنا بھی وقت لگاتے آخر نماز چند منٹ کے اندر ہی ختم ہو جاتی اور سارے نمازی ادھرادھر بکھر جاتے۔ کچھ لوگ میئر کو درخواست دینے کی جلدی میں ان کے پیروں پر بھی چڑھ جاتے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اشٹام لگے سفید کاغذ پر درخواستیں لاتے تھے تاکہ مسجد میں میئر کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ یہ لوگ نماز کے فوراً بعد میئر کے پیچھے بھاگتے۔ اس وقت حمزوی دل ہی دل میں ان لوگوں کو برا بھلا کہتے جو دینوی معاملات میں ایسے اندھے ہوئے پھرتے ہیں کہ خدا کے گھر کی پروا بھی نہیں کرتے۔ وہ لاٹھی ٹیکتے تنہا اپنے گھر جاتے۔ ان کے ہاتھ میں زرد رنگ کی تسبیح کے دانے تیزی کے ساتھ گرتے ہوتے۔ جیسے ہی وہ اپنی بیوی فتیحہ کو دیکھتے تو ان کی انگلی تسبیح پر اور بھی تیزی کے ساتھ چلنے لگتی۔ پھر وہ بھاری آواز میں زور سے فتحیہ سے کوئی بات کرتے' ایسی آواز میں جس سے ان کی طاقت اور مردانگی کا اظہار ہوتا۔ اس کے بعد وہ زور سے کھنکاتے تاکہ پڑوسیوں کو اطلاع ہو جائے کہ گھر کا مرد واپس آ گیا ہے۔

''جب سے یہ بچہ گھر میں آیا ہے تم بالکل بہری اور اندھی ہوگئی ہو۔ تم جانتی ہو کہ یہ بچہ گناہ کا نتیجہ ہے پھر بھی تم نے اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے۔ میں نے رحم کھا کر اسے اٹھا لیا تھا لیکن اب تو جی چاہتا ہے اس حرام کی اولاد کو وہیں مرنے کے لئے چھوڑ دیتا تو بہتر ہوتا۔ جب سے یہ لعنت ہمارے گھر میں آئی ہے ایک کے بعد دوسری مصیبت ہمارے اوپر نازل ہو رہی ہے۔ لوگ میرے اوپر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ کفرالنین میں میری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ میرے دوستوں تک نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اور اب تو میئر بھی شام کو مجھے نہیں بلاتا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ اس بچے کے یتیم خانے بھیج دو۔ میں نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا مگر تم مانتی ہی نہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا تمہیں اس بچے سے اتنا پیار کیوں ہو گیا ہے۔''

یہ سوال کرنے تک ان کی آواز بھرا جاتی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بچے کے ساتھ وہ اتنی زیادہ محبت کیوں کرتی ہے۔ سوال کرتے ہوئے ان کے ہاتھ میں تسبیح اور بھی تیزی کے ساتھ چلنے لگتی جیسے وہ اس سوال کا جواب جانتے ہیں۔ لیکن اسے قبول کرنا نہیں چاہتے۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے جان بوجھ کر کسی حقیقت کو جھٹلایا جائے۔ انہیں اپنے یقین پر شبہ سا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یوں بھی لگتا تھا جیسے وہ پورا یقین بھی رکھتے ہیں۔

یقین اور شبہ ان کے جسم میں اس جھرجھری کی طرح اترتے چلے جاتے جو صبح کی روشنی کے ساتھ کھڑکی کی درز سے داخل ہونے والی ٹھنڈی ہوا ان کے جسم میں پیدا کرتی تھی۔ وہ فتیحہ کو دیکھتے۔ اس کی گوری گردن اور گول چھاتی کو دیکھتے جس کے ساتھ بچہ چمٹا ہوتا۔ پھر وہ سوال سانپ کے ٹھنڈے اور ملائم پیٹ کی طرح ان کے اوپر رینگنا شروع کر دیتا۔ ''اگر اس نے بچہ پیدا نہیں کیا ہے تو اس کی چھاتیوں سے دودھ کیسے اتر رہا ہے؟'' یہ سوال کرنے والے وہ پہلے آدمی نہیں تھے۔ یہی سوال انہوں نے کسی اور سے بھی سنا تھا۔ انہیں یاد نہیں کس نے کیا تھا یہ سوال۔ اب انہیں یاد آیا تو خیال آیا کہ کسی نے یونہی چلتے چلتے سرگوشی میں یہ سوال کر دیا تھا۔ وہ سرگوشی ان کے دل پر ایسی لگی تھی۔ جیسے تیز چھری۔ ''کیا فتیحہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے؟'' انہوں نے اس سے انکار کرنے کی کوشش کی کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس وقت تک اسے دودھ پلاتے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہر صبح وہ بچے کے لئے بھینس کا دودھ لیتی تھی۔ لیکن سرگوشی کرنے والی آواز اصرار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے' ایسا یقین جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

شیخ حمزوی کے کانوں میں یہ آواز اس وقت ضرور پڑتی جب وہ گلی یا سڑک سے گزرتے اور وہاں لوگ کھڑے ہوتے۔ انہیں دیکھتے ہی ان لوگوں کے سر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے اور وہ انہیں باتیں کرتے سنتے۔ وہ ان کے پاس گزرتے ہوئے السلام علیکم کہتے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو سلام کا جواب بھی نہ دیتے۔ اور جب وہ حجام کی دوکان کے سامنے سے گزرتے تو زیادہ زور سے السلام علیکم کہتے۔ دوکان پر میسٹر اور پولیس افسر بھی بیٹھے ہوتے۔ ان کے سلام کا جواب فوراً نہیں آتا۔ پھر بے دلی کے ساتھ وعلیکم السلام کی آواز آتی۔ یہ آواز بھی میسٹر حجام یا پولیس افسر کی نہ ہوتی۔ بلکہ کسی اور ہی شخص کی ہوتی۔ انہیں وہاں بیٹھنے کے لئے کوئی دعوت نہ دیتا۔ وہ سر نیچا کئے گھر چلے جاتے جہاں فتحیہ بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی ہوتی۔ ان کے جی میں آتی کہ بچہ اس کی گود سے چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر اس بچے کی طرف دیکھتے جو انہیں اپنا رقیب معلوم ہوتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کیسے نبٹا جائے۔

ایک رات وہ اس وقت تک جاگتے رہے جب فتحیہ سو نہ گئی۔ وہ چپکے چپکے بچے کے قریب گئے اور اسے فتحیہ کی گود سے چھیننے کی کوشش کی مگر فتحیہ نے سوتے میں بھی اسے اتنی زور سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ اسے کھینچ نہ سکے۔ بچہ حسب معمول اس کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا

تھا۔ بچہ کھینچنے سے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چیخ ماری ''شرم کرو شیخ حمزوی' تم تو خدا ترس انسان ہو۔ یہ معصوم بچہ ہی تو ہے۔''

''میں حرامی بچے کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا''

''تو میں اس کے ساتھ میں بھی گھر سے چلی جاؤں گی۔''

''تم اس کی ماں نہیں ہو تم یہ گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔'' ان کی آواز غصے میں کانپنے لگی۔

''میں اسے کسی کو نہیں دینے دوں گی۔ لوگ بڑے بے رحم ہیں۔ پھر اس بچے نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''گناہ کے اس بچے سے ہمارے اوپر مصیبتیں ہی نازل ہوتی رہیں گی۔'' شیخ حمزوی غصے میں بولے۔ ''تم دیکھ لو' جب سے یہ آیا ہے ہمارے گھر پر ہی نہیں سارے گاؤں پر تباہی نازل ہو رہی ہے۔ فصلوں کو کیڑا لگ گیا ہے اور میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اس کا اصل سبب یہی بچہ ہے۔ اب تو راستے میں کوئی مجھے سلام بھی نہیں کرتا۔ اور فتحیہ مجھے تو ڈر ہے میئر میری جگہ کسی اور کو پیش امام مقرر کر دے گا اور مجھے گاؤں سے ہی نکال دے گا۔ لوگوں نے اس کے دماغ میں ڈال دیا ہے کہ اب گاؤں کے لوگ میرے پیچھے نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں امام مسجد نے اپنے گھر میں حرامی بچہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے نماز قبول نہیں ہو سکتی۔ فتحیہ اگر میئر نے مجھے مسجد سے نکال دیا تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔''

''اللہ ہمیں دے گا۔ شیخ حمزوی۔ ہمارا رزق میئر نہیں اللہ ہے۔''

''اللہ ہمارے لئے آسمان سے من وسلویٰ نہیں برسائے گا۔''

''یہ بات تم کہہ رہے ہو شیخ حمزوی؟ تم ہی تو کہتے ہو کہ جو غریب اس کی عبادت کرتے ہیں اللہ ان کی ضرور سنتا ہے۔ اگر میئر نے ہمیں مسجد سے نکال دیا تو وہ ہماری کیوں نہیں سنے گا؟ تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں ہے شیخ؟ تم لوگوں کو سمجھاتے ہو خود اس کے رحم و کرم سے مایوس ہو گئے ہو۔ اٹھو شیخ حمزوی' وضو کر کے نماز پڑھو اور دعا کرو کہ وہ ہمارے اوپر' اور سارے گاؤں پر اپنی رحمت نازل کرے۔''

شیخ حمزوی نے وضو کیا اور نوافل ادا کئے۔ پھر قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھ گئے۔ بچہ سرکتا ہوا مصلے پاس آ گیا اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن شیخ حمزوی

کی آنکھوں میں اتنی نفرت بھری تھی کہ بچہ ڈر گیا اور چیختا ہوا فتحیہ کی طرف بھاگا۔ فتحیہ نے دوڑ کر اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ ''کیا ہوا میرے منے؟ تو اپنے باپ سے ڈر گیا؟ ان سے نہ ڈر بیٹے یہ تو تیرے باپ ہیں اور تجھ سے پیار کرتے ہیں۔ تو بڑا ہوگا تو یہ تجھے قرآن پڑھائیں گے اور ایک دن تو بھی ان کی طرح مسجد کا شیخ بن جائے گا۔ تو نماز پڑھایا کرے گا۔''

''تم خواب دیکھ رہی ہو فتحیہ۔ تم سمجھتی ہو یہاں کے لوگ ایک حرامی شخص کو اپنی مسجد کا امام بنالیں گے۔''

''لیکن اس میں بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں اس میں بچے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن لوگ یہ بات نہیں مانتے۔''

''کیوں؟ لوگ اس طرح کیوں نہیں سوچتے جیسے ہم سوچتے ہیں؟ ہم ان سے الگ تو نہیں ہیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن لوگ سمندر کی لہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کب ان میں طوفان آجائے۔ میرے سامنے وہ سب یہی کہتے ہیں کہ بچے کا کیا قصور ہے۔ لیکن جب وہ اکٹھے ہوتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں۔ یہ لوگ کافر ہیں فتحیہ۔ وہ خدا پر بھروسہ نہیں کرتے اور یہ سوچنے کی تکلیف بھی نہیں کرتے کہ دنیا یا آخرت میں انکے ساتھ کیا ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ وہ تو صرف میئر سے ڈرتے ہیں۔ ان کی روزی روٹی اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ چاہتے تو سب کو بھوکا ماردے۔ اگر وہ ناراض ہو جائے تو ان کے ٹیکس بڑھ جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے نوٹس پر نوٹس آنے لگتے ہیں کہ ''لگان ادا کرو ورنہ زمین ضبط کر لی جائے گی۔'' تم میئر کو نہیں جانتے وہ بہت ہی خطرناک انسان ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ کسی وجہ کے بغیر لوگوں کو جیل میں ڈال سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی کو بھی قتل کرنا آسان ہے۔''

''مگر خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ تم کیوں کہتے رہتے ہو کہ وہ بہت خداترس انسان ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھائی کرتا ہے؟ ہر جمعہ کے خطبے میں تم اللہ سے میئر کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہو اور اس کا شکر ادا کرتے ہو کہ اس نے گاؤں کو اتنا اچھا میئر عطا کیا ہے جو لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف کرتا ہے۔ کفرالنین کو اس سے اچھا میئر مل ہی نہیں سکتا؟ کیا

تم لوگوں کو بیوقوف بناتے ہو؟ شیخ حمزوی؟''

شیخ حمزوی نے جواب دینے سے پہلے کافی دیر سوچا۔ پھر بولے۔''گھر کی چار دیواری کے باہر جو کچھ ہو رہا ہے تم اسے نہیں جانتے۔ ان لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔ رسول اللہ کی حدیث ہے کہ''اس دنیا میں ایسے کام کرو جیسے تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔''فتیحہ جمعہ کا سارا خطبہ اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں ہی نہیں ہوتا۔ اس میں اس دنیا کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس پر میئر کی حکومت چلتی ہے۔ اگر ہم اسے ناراض کر لیں تو اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ اب رہی جنت کی بات تو مجھے یقین ہے اللہ مجھے وہاں ضرور بھیجے گا۔ کیا یہ مجاہدہ نہیں ہے کہ ایک بچے کو پناہ دینے پر مجھے میئر اور گاؤں کے پولیس افسر کا عتاب سہنا پڑ رہا ہے؟''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم نے ایک معصول بچے کو پناہ دی ہے اور اسے پیار محبت دے رہے ہو۔ اللہ اس کا اجر ضرور دے گا۔''

شیخ حمزوی کا یہ موڈ دیکھ کر فتیحہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور بچہ ان کی گود میں ڈال دیا اور بولی۔''شیخ حمزوی ذرا اس کی آنکھوں میں دیکھو۔ یہ تم سے محبت کرتا ہے بالکل ایسے جیسے بچہ اپنے باپ سے کرتا ہے۔ ذرا اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھو۔ ذرا دیکھو تو اس کا ہاتھ کتنا نرم ہے اور اس کی ننھی ننھی انگلیوں نے کس زور سے تمہارا انگوٹھا پکڑ لیا ہے جیسے کہہ رہا ہو بابا مجھے نہ چھوڑنا۔ میں بہت چھوٹا اور بہت کمزور ہوں۔ مجھے آپ کی مدد چاہئے۔''

اور بچے نے ہاتھ اٹھا کر شیخ حمزوی کا چہرہ چھوا۔ شیخ نے سر نیچا کر کے اپنے آپ کو بچے کے حوالے کر دیا بچہ ان کے چہرے' ان کی مونچھوں اور داڑھی سے کھیل رہا تھا۔

ایک دن بچے نے ان داڑھی کا بال توڑ لیا۔ شیخ نے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا تھپڑ مارا اور کہا''شرم کر''...... بچے نے بولنا شروع کیا تو سب سے پہلا لفظ جو بولا وہ امی تھا۔ شیخ نے اسے مصلے پر بٹھا کر قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔ بچہ اپنے ہاتھوں سے قرآن اٹھانے کی کوشش کرتا مگر وہ بہت بھاری تھا۔ ایک دن وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ شیخ حمزوی غصے میں پاگل ہو گئے انہوں نے جلدی سے جھک کر قرآن اٹھایا۔ اس کے بعد انہوں نے بچے کو مارا کہ اس نے اللہ کا کلام زمین پر پھینک دیا۔ فتیحہ نے بچے کی چیخیں سنیں تو وہ دوڑی دوڑی آئی۔ شیخ نے اسے ساری بات بتائی تو فتیحہ کو غصہ آ گیا۔''شیخ ابھی وہ بچہ ہے۔ اسے اچھائی برائی کا پتہ نہیں ہے۔''

MashalBooks.com

پھر ایک دن دوپہر کا وقت تھا اور خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ شیخ حمزوی فرش پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے وہ اونگھ گئے اور قرآن ان کی گود میں گر گیا۔ اتنے میں بچہ بھی گھٹنوں چلتا ادھر آ گیا۔ اس نے شیخ کو گود میں بیٹھنے کی کوشش کی اور قرآن کو گندا کر دیا۔ شیخ نے دیکھا تو غصے کے مارے ان کا برا حال ہو گیا۔ انہوں نے بچے کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ فتیحہ نے بچے کے رونے کی آواز سنی تو وہ بھاگی بھاگی آئی اور اسے جلدی سے گود میں اٹھا لیا۔ ''یہ کیوں رو رہا ہے کیا ہوا اسے؟''

شیخ نے اسے بچے کی حرکت بتائی تو فتیحہ چلائی۔ ''آپ نے اتنی زور سے اسے پھینکا ہے اگر اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا تو وہ مر گیا ہوتا۔''

''اچھا ہے یہ مر جائے۔ کم سے کم ہمیں روز روز کی مصیبتوں سے تو نجات مل جائے گی۔ میں تو عورتوں کی طرح گھر میں بند ہو کر رہ گیا ہوں۔ مجھ سے کوئی بھی ملنے نہیں آتا اور نہ کوئی مجھے اپنے پاس بلاتا ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو لوگ راستہ بدل لیتے ہیں کہ کہیں مجھے سلام نہ کرنا پڑ جائے۔''

اور پھر ایک جمعہ کو شیخ حمزوی نماز پڑھانے مسجد پہنچے تو دیکھا کہ تین آدمی مسجد کے دروازے پر ان کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ شیخ حمزوی غصے میں کانپنے لگے۔ ''میں اس مسجد کا امام ہوں۔ تم کون ہوتے ہو میرا راستہ روکنے والے؟''

''اب آپ اس مسجد کے امام نہیں ہیں۔ میئر نے آپ کی جگہ دوسرا امام مقرر کر دیا ہے۔'' ان میں سے ایک آدمی بولا۔

''مجھے اندر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' شیخ حمزوی چلائے۔ ''صرف اللہ ہی مجھے روک سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھے مگر ایک آدمی نے ان کا کفتان پکڑ کر پیچھے سے کھینچا۔ اس پر انہوں نے اپنی لاٹھی گھمائی اور زور سے اس کے سر پر ماری۔ وہ آدمی چکرا کر گر گیا۔ اب دونوں آدمی ان پر پل پڑے۔ ایک ان کے سر پر مکے مار رہا تھا تو دوسرا ان کے چہرے پر تھپڑ برسا رہا تھا۔ جو آدمی ان کے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا وہ طیش میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ اب اس کے سامنے شیخ حمزوی کا چہرہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے سامنے اپنے باپ کا چہرہ تھا۔ وہ باپ جو اسے بچپن میں اسی طرح تھپڑ مارا کرتا تھا۔ وہ مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ جو بچے اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے انہیں اللہ جہنم کی آگ میں جلاتا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جیسے اللہ کا چہرہ ہے جو کہہ رہا ہے

کہ اسے جہنم کی آگ ایسے جلائے گی کہ ایک بار اس کے جسم کی جلد جل کر بھسم ہو جائے گی تو دوبارہ وہ جلد واپس آجائے گی۔ پھر اس کو جلایا جائے گا اور پھر جلد اس کے جسم پر آجائے گی۔ اس طرح وہ ہمیشہ نارِ جہنم میں جلتا رہے گا۔'' اب وہ اور بھی زیادہ غصے میں شیخ کو مار رہا تھا۔

جو نمازی مسجد آرہے تھے وہ نماز بھول چکے تھے اور وہاں کھڑے ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے شیخ کو بچانے کی کوشش کی تو اس کے اپنے سر پر اس زور کا مکا پڑا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ سچ ہے بچانے والوں پر زیادہ ہی مار پڑتی ہے سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے اور شیخ کو پٹتے دیکھ رہے تھے۔

اس ہجوم میں کھڑے ایک شخص نے دوسرے کے کان میں کہا ''میئر نے شیخ حمزوی کو ہٹا دیا ہے اور دوسرا امام مقرر کر دیا ہے۔ چلو ہم تو نماز پڑھیں ہماری نماز تو قضا نہ ہو۔'' وہ مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی چلنے لگے۔ ہر ایک سوچ رہا تھا کہ یہ فیصلہ اوپر کیا گیا ہے اس لئے ہم کون ہوتے ہیں اس کی مخالفت کرنے والے۔ سارے شیخ ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ایک کے پیچھے نماز نہ پڑھی تو دوسرے کے پیچھے پڑھ لی۔ ہمارے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

صرف چند آدمی باہر رہ گئے۔ وہ نماز بھی بھول چکے تھے بلکہ وہ تو ہر چیز بھول چکے تھے۔ وہ تو صرف تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں تو اس سے بھی غرض نہیں تھی کہ کون مار رہا ہے' اور کون پٹ رہا ہے' انہیں صرف تماشے سے غرض تھی۔ انسان کو سب سے زیادہ مزا لڑائی دیکھنے میں آتا ہے خواہ وہ دو انسان لڑ رہے ہوں یا جانور۔ مرغوں اور بیلوں کی لڑائی انہیں اسی لئے اچھی لگتی ہے۔ بہت سے لوگ تو پیسے خرچ کر کے یہ لڑائی دیکھتے ہیں۔ اس طرح ان کے اپنے اندر جو لڑائی جاری ہے اس کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔

شیخ حمزوی کی دستار زمین پر گر گئی اور لوگوں کے پیروں میں آکر مسلی گئی۔ ان کی کفتان دھجی دھجی ہو چکی تھی اور ان کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن وہ برابر چیخ رہے تھے۔ ''بدمعاشو' کافرو' تمہیں خدا کا خوف بھی نہیں ہے۔ بزرگوں پر اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ پیش امام کی اس طرح بے حرمتی کرتے ہیں۔ ارے تم اس شخص کو مار رہے ہو جس نے ساری زندگی خدا کی عبادت میں گزاری ہے۔ جس نے خدا کے گھر کی دیکھ بھال کی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی' تم ڈوب نہیں مرتے۔''

MashalBooks.com

ایک آدمی قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ذرا دیکھو تو یہ خدا رسیدہ انسان ہے۔ اگر یہ نیک آدمی ہوتا تو اللہ اس کی مدد نہ کرتا۔ اللہ اپنے نیک آدمی کو پٹتا دیکھ رہا......''

''کون کہتا ہے یہ نیک آدمی ہے۔ یہ تو بالکل نیک آدمی نہیں ہے'' دوسرا بولا۔

ایک اور آدمی شیخ کی حمایت پر اتر آیا۔ ''نہیں' یہ بہت نیک انسان ہیں۔''

''تم کیسے جانتے ہو کہ یہ نیک انسان ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ نیک انسان نہیں ہیں۔'' دوسرا آدمی پھر بولا۔

ایک آدمی جو دور کھڑا تھا بول پڑا۔ ''ہم تم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیک آدمی ہیں یا نہیں۔''

''پھر کون کہہ سکتا ہے؟'' وہ آدمی بولا جو اس مار پٹائی میں شامل تھا۔

''میسٔر زیادہ جانتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔'' ایک شخص نے فیصلہ سنا دیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اس بات کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کی تردید کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہیں ایک چھوٹا سا لڑکا بھی کھڑا تھا وہ بول پڑا۔ ''میسٔر کو کیا پتہ؟'' لیکن اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے اس کے باپ نے اس کے منہ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ ''چپ کر بیوقوف۔ بڑے بول رہے ہوں تو بچوں کو دخل نہیں دینا چاہئے۔''

لیکن بچے کا سوال وہاں کھڑے ایک ایک شخص کے دماغ میں گونجتا رہا۔ ''تو کیا اللہ میاں نے میسٔر نے حکم دیا ہے؟ کیا اللہ نے اسی طرح میسٔر سے بات کی ہے جس طرح اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تھی؟ شاید اللہ اپنے ولیوں اور خدا رسیدہ لوگوں سے بات کرتا ہے۔ اور میسٔر خدا رسیدہ انسان ہے۔ وہ متقی اور پرہیز گار آدمی ہے۔''

اچانک اس آدمی کا سانس پھول گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کھڑے کھڑے اس کا سانس کیوں پھول گیا۔ اسے لگا کہ اس کے اندر جس آواز نے اس سے یہ بات کی تھی اس نے اسے ڈرا دیا ہے۔ وہ عجیب وغریب آواز تھی۔ اسی آواز نے کہا تھا کہ میسٔر متقی اور پرہیز گار آدمی ہے۔ لیکن پرہیز گار کا لفظ اس کے دماغ میں عجیب انداز سے گونجا جیسے کوئی پراسرار شیطانی آواز لگائی ہو۔ اسے لگا کہ اچانک ''پرہیز گار'' کا لفظ ''گناہ گار'' میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔ حالانکہ اس نے اپنے دل میں یہ بات کی

MashalBooks.com

تھی۔ لیکن اسے محسوس ہوا جیسے اس نے میسیٔر کی شان میں بہت بڑی گستاخی کر دی ہے۔ اس نے میسیٔر کو گناہ گار کہا ہے۔ اس نے جلدی سے ایسے ہاتھ ہلایا جیسے شیطان کو بھگا رہا ہو۔ **اعوذ با للہ من اشیطن الرجیم۔**

''ہاں یہ شیطان ہی ہے؟ اس کے قریب کھڑے کسی نے کہا۔'' ہمارے محترم شیخ کو اور کون مار سکتا ہے۔''

''مگر اب تو وہ مسجد کا شیخ نہیں ہے۔'' ہجوم میں کھڑا ایک لمبا آدمی بولا۔

''اس سے اللہ کا کیا تعلق ہے؟'' کسی نے پہلے آدمی کی بات کی تائید کی۔

چھوٹے قد کا ایک آدمی ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ اب اس نے سب کی خاموشی کا فائدہ اٹھایا اور آہستہ سے بولا'' مگر شیخ حمزوی کا قصور کیا ہے؟''

''تم نہیں جانتے ان کا کیا قصور ہے؟ تم اس گاؤں میں نہیں رہتے؟ ہماری فصل کو کیڑا لگ گیا ہے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ شیخ حمزوی نے جب سے اس بچے کو پناہ دی ہے ہمارے اوپر آفت ہی آفت نازل ہو رہی ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے کیسے نماز پڑھی جا سکتی ہے جو حرام کا بچہ اپنے گھر میں پال رہا ہو۔'

لمبا آدمی کہنا چاہتا تھا کہ اس میں بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے لیکن لوگوں کی غضب ناک نگاہیں دیکھ کر خاموش رہا۔ اسے اپنے باپ یاد آ گئے جو کہا کرتے تھے حرامی بچے اپنے ساتھ بری قسمتی لے کر آتے ہیں۔ اب اس نے اپنے باپ کی آواز میں آپ آپ کو کہتے سنا'' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی' حرامی بچے بدنصیبی لے کر ہی آتے ہیں۔'' پھر ایک بار اور اس نے تھوک نگلا۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔'' تو بزدل ہے۔'' مگر پھر اس نے اس آواز کو دبا دیا۔ اور ایک اور ہی آواز میں بولا۔'' اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے اوپر پے در پے مصیبتیں کیوں آتیں۔ جب سے شیخ حمزوی نے وہ بچہ پالا ہے اس وقت سے یہ سب ہو رہا ہے۔''

شیخ حمزوی خون میں لت پت گھر پہنچے۔ ان کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور سر ننگا تھا۔ کیونکہ ان کی دستار لوگوں کے پیروں میں مسلی گئی تھی۔ ان کے کپڑے تار تار تھے۔ اچانک فتیحہ کے دل نے اس سے کہا'' اس کے بچے کی خیریت نہیں ہے۔'' اس نے جلدی سے اسے اپنی چادر میں چھپا لیا۔'' اب ہمیں اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہئے۔''

''مگر میں تو کوئی اور جگہ نہیں جانتا۔'' شیخ حمزوی نے نہایت مایوسی اور بد دلی

کے ساتھ کہا۔ ''میرے لئے تو کسی اور جگہ جانے سے بہتر یہ ہے کہ یہیں مر جاؤں۔ کہیں بھی ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا۔''

''اللہ ہماری مدد کرے گا شیخ، تم سمجھتے ہو وہ ہمیں اس طرح مصیبت میں چھوڑ دے گا؟''

''مجھے کچھ نہیں معلوم'' شیخ غصے میں بولے۔ ''لگتا ہے اللہ نے ہماری طرف سے نظریں پھیر لی ہیں ہم نے اس بچے کو کیوں رکھا ہے۔''

''تم بھی وہی بات کر رہے ہو جو سارے گاؤں والے کر رہے ہیں۔'' فتیحہ چیخی۔

''کیوں؟ کیا میں ان کی طرح انسان نہیں ہوں؟ میں نے تو کبھی فرشتہ یا ولی اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے شیخ؟ اگر تم اس بچے کو نہیں چاہتے تو کل کا سورج نکلنے سے پہلے تم اسے اس گھر میں نہیں دیکھو گے۔ لیکن یاد رکھو اس کے ساتھ میں بھی اس گھر میں نہیں ہوں گی۔''

''جو تمہارا جی چاہے کرو فتیحہ۔'' شیخ حمزوی نے بجھی ہوئی آواز میں کہا ''اب تم چاہے اس کے ساتھ چلی جاؤ یا یہاں رہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

''میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتی'' فتیحہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مگر لوگ ہمیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ گاؤں میں کوئی بھی پریشانی کی بات ہو گی تو سب اس کا الزام اس بے چارے بچے پر ہی دھریں گے۔ شیخ حمزوی تمہیں بتاؤ۔ کپاس کو کیڑا لگا تو اس سے اس غریب کا کیا تعلق ہے؟ کیا اس نے کیڑوں سے کپاس کھانے کو کہا تھا؟ ان لوگوں سے زیادہ عقل تو بھینس کے پاس ہوتی ہے۔ مگر تم بھی سچ کہتے ہو۔ ہم کہاں جائیں گے۔ ہم تو کفر النین کے سوا اور کسی گاؤں کو بھی نہیں جانتے۔''

کئی دن گزر گئے فتیحہ وہ سوال بھی بھول گئی جو اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اب لوگ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ لوگ سارا واقعہ ہی بھول چکے ہیں یا پھر شیخ حمزوی کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہی کافی ہے۔ لیکن ایک دن زور کی ہوا چلی۔ ایک عورت کے چولہے سے چنگاری اڑی اور ہوا کے ساتھ اوپر اٹھتی چلی

گئی ۔ چنگاری بہت ہی چھوٹی سی تھی بالکل دیا سلائی کی تیلی کے سرے کے برابر۔ اگر وہ زمین پر گرتی تو اس کا پتہ بھی نہ چلتا۔ مگر وہ اڑتے اڑتے ایک چھت پر پہنچی جہاں بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ اس ڈھیر پر گر گئی۔ اگر اس وقت بھی تیز ہوا چل جاتی تو وہ چنگاری شاید بجھ ہی جاتی لیکن یکدم ہوا رک گئی اور بھوسے نے سلگنا شروع کر دیا۔ اب جو دوبارہ ہوا چلی تو وہ چنگاری شعلہ بن گئی اور بھوسے کے بعد کپاس کی سوکھی چھڑیوں اور سوکھے اپلوں نے آگ پکڑ لی۔ اب آس پاس کے کئی مکان آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ دہاڑ دہاڑ آگ جل رہی تھی۔

سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ اپنا منہ پیٹ رہی تھیں اور مرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ حجام چیخا۔ ''پانی کی بالٹیاں لاؤ۔'' مگر بالٹیوں کا پانی آگ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب ہر گھر میں اپنے بچوں کی گنتی کی جا رہی تھی اپنے مویشیوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ اپنا قیمتی سامان گھسیٹا جا رہا تھا۔ لوگوں نے دیواروں میں سوراخ بنا کر جو قیمتی چیزیں چھپا رکھی تھیں وہ بھی نکالی جا رہی تھیں۔

میئر کو ٹیلی فون پر اطلاع کر دی گئی تھی مگر پھر بھی گاؤں کا پولیس افسر میئر کے گھر کی طرف بھاگا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی ٹن ٹن کرتی وہاں پہنچ گئیں۔ اور بچے آگ کو بھول کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے لئے لال انجن اور اس کے ساتھ لگی سیڑھی زیادہ دلچسپ چیز تھی۔ ان کے پاؤں ننگے تھے اور جسم پر بھی ایک آدھ ہی کپڑا تھا۔ ان کی ناکیں بہہ رہی تھیں۔ اور ان کے منہ پر مکھیوں کے غول کے غول بھنک رہے تھے۔

لیکن دریا کی طرف درختوں کے پیچھے سورج ڈوبنے سے پہلے کفرالنین میں ہر چیز معمول پر آ چکی تھی۔ صرف کسی کسی چھت سے ابھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک گھر کے دروازے پر ایک ننھے بچے کی لاش پڑی تھی۔ دھویں میں اس کا دم گھٹ گیا تھا۔ ان گھروں میں جلی ہوئی کھڑکیاں اور دروازے ابھی تک کھڑے تھے۔ کچی زمین پر ابھی تک فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے پہیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ مگر کھیتوں سے واپس آنے والے مویشیوں اور انسانوں کے قدموں نے جلد ہی یہ نشان بھی مٹا دیے۔

فتحیہ اس رات بچے کو سینے کے ساتھ چمٹائے جاگتی رہی۔ اسے خطرہ کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے کان دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے کہ گاؤں والے کیا کہہ رہے ہیں۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اس لئے جب گاؤں میں کی جانے والی پہلی بات اس کے کان میں پڑی تو اسے حیرت نہیں ہوئی۔ ''اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو سارا گاؤں راکھ کا ڈھیر بن جاتا۔ جب سے حرامی بچہ ہمارے گاؤں میں آیا ہے ہمارے اوپر ایسے ہی عذاب نازل ہورہے ہیں۔ اب ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔''

اسے محسوس ہوا کہ اس کی چادر میں لپٹے بچے کی کمزور اور دھیمی نبض کے ساتھ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا کہ کہیں کوئی پڑوسی کواڑوں کی آواز نہ سن لے پھر وہ دریا کی طرف بھاگی۔ وہ دریا کے قریب پہنچنے ہی والی تھی کہ بہت سی آنکھوں نے اسے دیکھ لیا۔ آنکھیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ اس نے ایک غضب ناک آواز سنی۔ ''بچہ کہاں ہے؟''

''وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ گھر میں سو رہا ہے۔'' فتیجہ نے بچے کو چادر میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تو جھوٹ بول رہی ہے۔ فتیجہ بچہ تیرے پاس ہے۔'' اس ڈراؤنی آواز نے پھر کہا۔

''نہیں'' فتیجہ چلائی۔ ''وہ میرے پاس نہیں ہے۔'' فتیجہ نے یہ کہہ تو دیا لیکن اپنے اس جھوٹ پر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ڈر کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔

اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی چادر پکڑ کر کھینچ لی۔ اب بچہ سامنے آ گیا تھا' وہ اس کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

''یہ میرا بچہ ہے' اسے نہ چھینو۔'' وہ چیخ رہی تھی۔

''یہ حرامی بچہ ہے۔ اور ہم اللہ سے ڈرتے ہیں' ہم گناہوں سے نفرت کرتے ہیں۔''

ایک سخت اور بے رحم ہاتھ نے بچے کو اس سے چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن اب بچہ اور فتیجہ ایک ہو چکے تھے۔ اب کئی ہاتھ آگے بڑھے اور بچے کو اس سے جدا کرنے کے لئے زور مارا مگر اس کا سینہ اور بچہ یک جان ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہی جسم تھے۔

اب سورج کا گولا دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کفرالنین کے گھروں پر خاموش سائے کی طرح کالی رات اتر آئی تھی۔ ہر چیز سانس روکے کھڑی تھی۔ زندگی کی ساری چہل پہل بند ہوگئی تھی۔ دریا کے کنارے لوگ

MashalBooks.com

سیاہ روحوں کی طرح ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ فتیحہ کے سارے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اور اس کا گورا بدن چاندنی میں جل پری کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی اس کے بدن کی طرح بالکل سفید تھا۔ وہ ایک عزم کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ وحشی جانور کی طرح اپنے آس پاس کھڑے لوگوں سے لڑ رہی تھی۔ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ وہ اپنے کندھے اور اپنے کولہے بھی استعمال کر رہی تھی۔ اس مقابلے میں اس نے بچے کو سختی کے ساتھ سینے سے چمٹا رکھا تھا۔

ہر طرف سے اس پر ہاتھ جھپٹ رہے تھے۔ وہ ہاتھ بہت بڑے اور بہت سخت تھے۔ ان کی انگلیاں کھردری اور مضبوط تھیں۔ ناخن لمبے لمبے اور تیز تھے۔ لگتا تھا جیسے جانوروں کے کھر ہوں۔ وہ اس کی چھاتیوں میں چھبے اور گوشت نوچتے لے گئے۔ لوگوں کی حریص نظریں اس کے ننگے بدن پر اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے بھنے بکرے پر بھوکے لوگوں کی نظریں۔ ہر ایک زیادہ سے زیادہ کھا لینا چاہتا کہ کہیں کوئی دوسرا آدمی زیادہ حصہ نہ لے جائے۔ ان کے ہاتھ شیر یا چیتے کے پنجوں کی طرح اس کے جسم پر پڑ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں کسی بہت پرانی دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے اسے کھائے جا رہی تھیں۔ ان کے اندر وحشیانہ شہوانی خواہش بھری ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فتیحہ کا جسم گوشت کا لوتھڑا بن گیا اور آس پاس کی زمین خونم خون ہوگئی۔

لیکن تھوڑی دیر بعد سب کچھ پھر ویسا ہی ہو گیا۔ جیسے پہلے تھا۔ وہی خاموش رات تھی جس نے ساری چیزوں کو اپنے بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ وہی رات جو نیل کے پانی اور اس کے کنارے کے ساتھ پھیلی زمین پر دور تک پھیلتی چلی گئی تھی اور مٹی کے کچے گھروں' تنگ اور پیچیدہ گلیوں اور ان میں پڑے گندگی کے ڈھیروں کو سیاہ کر رہی تھی۔ کفر النین کے مرد اپنے اپنے گھر واپس پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنے جانوروں یا اپنی بیویوں کے پاس فرش پر لیٹے تھے' ایسے جیسے ان میں جان ہی نہ رہی ہو۔ جیسے ان میں احساسات اور جذبات ہی نہ رہے ہوں۔ صرف ایک شخص جاگ رہا تھا جا کا نام تھا شیخ حمزوی۔ اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سے اوپر تک رہا تھا۔ اس وقت تک اس نے اپنے کان دیوار کے ساتھ لگائے رکھے تھے جب تک گاؤں سے آنے والی ساری آوازیں بند نہیں ہو گئی تھیں اور گہرے اندھیرے نے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیا تھا۔ اور جب تک اس

اندھیرے نے اپنی سیاہ چادر گاؤں پر نہیں ڈال دی تھی جو موت کی طرح ہولناک اور بھیانک تھا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف چلا۔ کندھے سے دروازہ کھولا تاکہ کواڑوں کی آواز نہ ہو۔ وہ گلی میں احتیاط کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا چلا۔ وہ لاٹھی سے یہ ٹٹولتا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی اینٹ پتھر یا کوئی مری ہوئی بلی نہ پڑی ہو۔ وہ اسی طرح احتیاط کے ساتھ گلی سے گزرا کرتا تھا۔

وہ پیر گھسیٹتا جا رہا تھا تو اس کی لاٹھی کسی چیز سے ٹکرائی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اینٹ پتھر یا کوئی چھوٹا موٹا جانور نہیں ہے بلکہ ایسی بڑی چیز ہے جس کا خون ابھی تک گرم ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔ کسی سائے کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا حتیٰ کہ اس کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے گرنا بھی بند ہو گئے۔ اب اس کی نظریں اپنی بیوی کے ننگے بدن پر جمی ہوئی تھیں جو دریا کے اونچے کنارے پر پڑی تھی۔

فتیحہ دھیمی آواز میں کراہ رہی تھی۔ اس کا سینہ اب بھی سانس کے دباؤ کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ سانس جھٹکوں کے ساتھ آ رہا تھا۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ''فتیحہ' فتیحہ' میں حمزوی ہوں۔'' اس نے اس کے کان میں کہا۔

اس نے اپنی لال لال آنکھیں کھولیں' کچھ کہنے کے لئے ہونٹ بھی کھولے مگر منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ حمزوی نے دیکھا کوئی دور سے ادھر آ رہا ہے۔ اس نے اپنا کفتان اتارا اور ننگے بدن پر ڈال دیا۔ وہ شیخ نزدیک آیا تو اس نے پہچان تھا۔ وہ شیخ متولی تھا۔ اس نے جلدی سے کہا ''اس میں ابھی سانس باقی ہے۔ تم میرے ساتھ اسے اٹھا لو تاکہ پلنگ پر اس کا دم نکلے۔''

شیخ متولی فوراً نیچے جھکا اور فتیحہ کو اٹھانے لگا۔ لیکن ابھی اس نے فتیحہ کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ فتیحہ نے آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف نظریں گھما گھما کر دیکھنے لگی۔

''یہ کسی کو دیکھ رہی ہے۔'' شیخ متولی نے دھیرے سے کہا۔

''اسے ہوش نہیں ہے۔ اسے گھر لے چلو۔'' شیخ حمزوی نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے سرگوشی کی۔

لیکن انہوں نے اسے اٹھانے کی پھر کوشش کی تو فتیحہ کا جسم زمین سے چپک گیا

جیسے زمین نے اسے پکڑ لیا ہو۔ وہ جب بھی اٹھانے کی کوشش کرتے وہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف کسی کو تلاش کرتی۔

''یہ نہیں جائے گی۔ میں جانتا ہوں یہ کس کو تلاش کر رہی ہے۔'' شیخ متولی نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔'' اچانک اس کی نظر ایک چھوٹے سے سائے پر پڑی جو دریا کے کنارے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے ادھر گیا اور بچے کی خونم خون لاش اٹھا کر لے آیا۔ پھر اس نے احتیاط کے ساتھ وہ لاش فتیحہ کے سینے پر ڈال دی۔ اب جو انہوں نے فتیحہ کو اٹھایا تو وہ پتے کی طرح ہلکی تھی۔

وہ اسے گھر لے گئے اور صبح کو اسے اس طرح دفن کر دیا کہ بچہ اس کے سینے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ حمزوی نے اس کی قبر پر سبز ریشمی چادر ڈالی دی۔ اسے سے فارغ ہونے کے بعد متولی نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا پھر اس کے ہاتھ اس کی آنکھوں تک گئے تو وہ آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے اس سے پہلے اس کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ شاید بچپن میں وہ رویا ہو۔ اس کے بعد اسے بالکل یاد نہیں کہ وہ کبھی رویا بھی تھا۔

صرف خدا اور متولی ہی جانتا ہے کہ فتیحہ کی میت اور اس کا کفن دونوں قبر میں سلامت رہے۔

MashalBooks.com

(16)

اس نے دونوں ہاتھوں کی گرم گرم ہتھیلیاں زمین پر ٹکائیں اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں وہاں تک پھیلائے جہاں تک پھیلا سکتا تھا۔ وہ بہت دور سے آ رہا تھا اس کے پیروں میں درد ہونے لگا تھا۔ چلنے سے پیروں پر ورم آ گیا تھا اور ان کی کھال چیخ گئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ اس کی نظریں دریا کی پتلی دھجی پر لگی ہوئی تھیں جس کے دونوں کناروں کے ساتھ حد نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے کفرالنین کی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اس بو کو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے دوسری ہزاروں خوشبوؤں میں بھی وہ الگ پہچان سکتا تھا۔ وہ گاؤں کے نالے پر جمی گرد کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شہتوت کا وہ درخت تلاش کر رہا تھا جہاں دے ڈھلان شروع ہوتی ہے اور گڑھے تک جاتی ہے۔ وہ اس گوبر کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا جس میں آٹے کی بھوسی ملی ہوتی ہے، وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اپنی ماں کی چادر کو جو اس کے ساتھ چلتے ہوئے ہوا میں اڑتی رہتی ہے۔ وہ یاد کر رہا تھا اپنی ماں کے سینے کو جس کے ساتھ چمٹ کر وہ سویا کرتا تھا۔

کتنے ہی برس گزر گئے تھے اس نے یہ خوشبو نہیں سونگھی تھی۔ وہ اسے کفرالنین میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسے اس خوشبو کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک وہ اسے سونگھنے سے بالکل ہی محروم نہیں ہو گیا تھا اور جب تک اس نے فوجی وردی نہیں پہنی تھی اور جب تک وہ فوجی جوان نہیں بنا تھا۔ اس نے اتنی عمر اسی طرح گزار دی تھی کہ اسے خوشبو کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ جان ہی نہیں پایا تھا کہ اس کی زندگی میں اس خوشبو کا

MashalBooks.com

بھی ایک مقام ہے۔ ان دنوں وہ سوئیز سے چند میل دور ایک چھوٹے سے خیمے میں دوسری خوشبوؤں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ بوتھی ان گولیوں یا گولوں کی جو بندوق یا توپ سے داغے جاتے تھے، یہ بوتھی جلتے چمڑے کی، ڈیڑھ میں بند کھانوں کی یا وادی سینا کی ریت کی جب طیارے اپنا بوجھ وہاں خالی کرتے یا وہاں صحرائی آندھی آتی۔ لیکن ایک دن اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے نتھنوں میں پرانی خوشبو آئی۔ پہلے تو وہ اسے نہیں پہچانا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خوشی کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا، جیسے اس نے کوئی نشہ آور چیز کھالی یا پی لی ہو۔ بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور اپنی ماں کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔ وہ صبح سو کر اٹھا تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنے سرہانے وہ پارسل رکھ کر سویا تھا جو ماں نے بھیجا تھا۔ وہ چھوٹا سا بنڈل تھا اور اس کا ایک ساتھی اس کے لئے گاؤں سے لے کر آیا تھا۔ اسے کھولنے سے پہلے ہی وہ اسے اپنی ناک کے قریب لے گیا تھا، پھر اس نے اس خوشبو کو پہچانا تھا جس کے ساتھ اس نے ایک عمر گزاری تھی۔ اسے جانے بغیر ہی ایک عمر گزاری تھی۔

اس نے گہرا سانس لیا اور مٹیالے پانی پر بچھی جانی پہچانی مٹی کی خوشبو پہچاننے کی کوشش کی لیکن اس کی ناک جانی پہچانی خوشبو محسوس نہیں کر سکی۔ اس نے دور تک نظر ڈالی مگر اسے کوئی ایسی نشانی نظر نہیں آئی جس سے وہ جان سکتا کہ وہ کفر النین کے نزدیک ہے۔

اسے خیال آیا کہ ابھی اسے کافی فاصلہ اور طے کرنا ہے۔ وہ فاصلہ گھنٹوں کا بھی ہو سکتا ہے اور دنوں کا بھی۔ اس کی پلکیں اس کی مرضی کے خلاف ہی بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھلیں تو اس نے دیکھا کہ سورج سر پر آ گیا ہے۔ چند لمحے بعد اسے خیال آیا کہ وہ تو دو دن اور دو راتیں سوتا رہا ہے۔ اس نے ہتھیلی زمین پر رکھی اور اٹھ بیٹھا۔ اس کی ہتھیلی کھردری تھی اور اس پر رائفل پکڑنے کے نشان تھے۔ جب وہ پریڈ کرتا یا رائفل چلاتا تو اس کی ہتھیلی کا وہ نشان اس کے کام آتا جو ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے پڑ گیا تھا۔ اب وہ کھڑا ہوا تو اس کا جسم سانس کی طرح پتلا اور لمبا تھا مگر اس کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ چٹخے ہوئے پیروں میں سے خون اور پیپ رس رہی تھی۔ میلوں پیدل چلنے کی وجہ سے اس کے چٹخے پیروں کی درزوں میں کالی مٹی جم گئی تھی۔ سورج کی آگ برساتی کرنیں اس کے سر پر تھیں اور اس کا دماغ کھولا رہی تھیں۔ اور پیروں کے تلوؤں مین زمین گرم سوئی کی طرح

چھبھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے کیونکہ نہر سوئیز پانی کی ایک پٹی تھی اور اس کے پیروں کے نیچے کی سوئیاں سینائی کی وہ ریت تھی جو پسپا ہوتے ہوئے اسکے پیروں کو چھلنی کر رہی تھی۔

وہ ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لال لال دائرے سے ناچ رہے تھے۔ اس نے سر کا چکر دور کرنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ بجلی کے کڑک یا زلزے یا دونوں کی طرح ہولناک تھی' یوں لگا جیسے آسمان اور زمین ٹکرا گئے ہوں۔ وہ پلک جھپکتے ہی زمین پر گر گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر چھپا رکھا تھا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے سرکا تھا۔ وہ کسی خندق یا کسی گڑھے کی تلاش میں تھا جہاں چھپ سکے۔ وہ ریت کے دو ٹیلوں کے درمیان ساکت پڑا تھا۔ بالکل اس کی آدمی کی طرح جو مر گیا ہو یا برف میں جم گیا ہو۔

گڑگڑاہٹ کی آواز بند ہوگئی تھی اور اب پہلے سے بھی زیادہ گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور آسمان پر کسی اڑتی چیز کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی جہاز نہیں تھا' کوئی دھواں یا دھویں جیسے بادل نہیں تھے۔ کوئی شعلہ نہیں تھا۔ صرف سورج کا جلتا ہوا گولا اوپر سے اسے جھانک رہا تھا۔ اس نے آسمان پر سے نظریں ہٹائیں اور اپنے اردگرد دیکھا۔ پھر اس کی نظر دریا اور کھیتوں پر پڑی تو احساس ہوا کہ وہ ریگستان میں نہیں ہے۔ جنگ بند ہو چکی ہے اور وہ پیدل کفرالنین جا رہا ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ اس کے پاس بچے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اسے گڑھے میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ مکھیوں کے غول میں ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سوجے ہوئے پیروں کے ساتھ دور ہٹ گیا۔ وہ سب ہنس رہے تھے" پاگل ہے" پھر انہوں نے اس پر پتھر پھینکنا شروع کر دیے۔

وہ کفرالنین کے نزدیک پہنچا تو سورج دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے پیڑوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اندھیری رات آہستہ آہستہ کچے گھروں پر چھا رہی تھی اور کھیتوں سے کسان اور مویشی گھروں کو واپس آ رہے تھے تھکن کے مارے کسانوں کی کمر جھکی ہوئی تھی اور اپنے تھکے پیروں کے ساتھ مویشیوں کے پیچھے پیچھے گھسٹتے چلے آ رہے تھے۔

ذکیہ گھر پر ہی تھی۔ بھینس باڑے میں بندھی تھی۔ وہ دروازے پر اسی طرح

دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔اس کی نظریں سامنے لگی ہوئی تھیں۔اس کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ سو جائے یا جاگتی رہے۔اس کی آنکھیں کھلی رہیں یا بند ہو جائیں۔کیونکہ ہر رات اس کے لئے کالی چادر کی طرح آتی تھی۔اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے' وہ نہیں جانتی تھی کہ جو آدمی آیا ہے وہ اس کا بھائی کفروی ہے یا اس کا بیٹا جلال۔اس کا بیٹا جلال کسی طرح بھی کفروی سے نہیں ملتا تھا۔آخری بار اس نے اسے اس دن دیکھا تھا جب وہ جنگ پر گیا تھا۔ان دنوں وہ نوجوان اور بہت طاقت ور تھا۔اس کی کمر سیدھی تھی اور وہ اپنے سامنے دور تک سیدھا دیکھتا ہوا گیا تھا۔مگر کفروی کو آخری مرتبہ اس نے اس دن دیکھا تھا جب وہ اسے جیل لے گئے تھے۔وہ دو آدمیوں کے بیچ میں چل رہا تھا۔وہ بہت بوڑھا نظر آرہا تھا اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔اس نے اپنی نگاہیں زمین پر گاڑ رکھی تھیں۔اب وہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اچانک اس کے سامنے ان میں سے کون آ گیا ہے۔چہرہ تو جلال ہی کا تھا لیکن جھکی کمر اور جھکی نظریں کفروی کی تھیں۔

اس نے جلال کی سی آواز سنی۔مگر وہ بہت ہی کمزور اور دھیمی تھی۔

''اماں'...... مجھے پہچانا نہیں؟ میں جلال ہوں' سینائی سے واپس آ گیا ہوں۔''

وہ خالی خالی نظروں سے اسے اسی طرح دیکھتی رہی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی آنکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں۔یہ حقیقت ہے یا خواب؟ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے چھوا۔وہ جب راتوں کو اسکا چہرہ چھونے کی کوشش کرتی تھی تو وہ اچانک غائب ہو جاتا تھا۔اور اس کی انگلیاں اندھیرے کو پکڑتی رہ جاتی تھیں۔آج اس نے جس ہاتھ کو پکڑا وہ گرم گرم گوشت کا ہاتھ تھا۔بالکل جلال کا ہاتھ' اس نے اس ہاتھ کو اپنے چہرے کے قریب کیا۔اس میں وہی اس کے سینے اور اس کے دودھ کی خوشبو تھی۔ہاں' یہ اسی کی ہاتھ کی خوشبو ہے۔

''میرا بیٹا' میرا جلال' تو آ گیا؟''اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اپنا چہرہ اسکے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''ہاں اماں' میں ہی ہوں''اس نے سر نیچا کرتے ہوئے کہا۔ذکیہ نے اس کا سر' اس کے کاندھے اور اس کے بازو اور اس کے کھردرے ہاتھ چھو کر دیکھے وہ دیکھ رہی تھی کہ وہاں کوئی زخم تو نہیں ہے۔اس کے جسم کا کوئی حصہ کم تو نہیں ہے۔وہ صحیح سلامت تو واپس آیا ہے؟

''تو ٹھیک تو ہے بیٹے؟'' وہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں اماں' میں ٹھیک ہوں۔تم تو ٹھیک ہو؟''

''ماں بیٹے' میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''مگر تم ویسی معلوم نہیں ہوتیں جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔''اس نے غور سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چار برس ہو چکے ہیں بیٹے۔'' وہ بولی۔''اتنا زمانہ گزر گیا ہے اور تو بھی ویسا نہیں رہا جلال!''

''میں تو پیدل چل کر تھک گیا ہوں۔اتنی دور سے آ رہا ہوں۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ گرد بھری زمین پر ماں کے پاس ہی لیٹ گیا۔ ماں نے گرم پانی سے اس کے پاؤں دھوئے۔ پھر ان پر پٹی باندھی۔

اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ کچی چھت کو تک رہا تھا' ذکیہ اس کے پاس بیٹھی تھی'اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ایک بار اس کے ہونٹ تھوڑے سے کھلے جیسے وہ ساری کہانی سنانا چاہتی ہو کہ ان پر کیا بیتی' مگر پھر کچھ سوچ کر چپ رہی۔تھوڑی دیر بعد اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا''کفرودی ماموں کا کیا حال ہے؟''

وہ خاموش رہی تو پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔''وہ ٹھیک ہیں۔''

''اور نفیسہ اور زینب؟''

وہ ہچکچائی تھوڑا سوچا پھر دھیرے سے بولی۔''وہ بھی ٹھیک ہیں۔تم کچھ کھاؤ گے؟ تم نے تو شاید کئی دن سے نہیں کھایا ہوگا۔''

وہ اٹھی اور روٹی کی چنگیر' پنیر کا سوکھا ٹکڑا اور اچار اٹھا لائی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔''تیرے لئے حاجی اسمٰعیل کی دوکان سے تل کے لڈو لے آؤں۔''

جلال نے محسوس کیا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے اس لئے اس نے پریشانی کے ساتھ کہا''اماں یہاں بیٹھ جاؤ مجھے بھوک نہیں ہے' یہ بتاؤ یہاں کیا ہوا۔تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔تم بدلی بدلی نظر آ رہی ہو۔''

وہ اس سے اپنی نظریں چرا رہی تھی اور اندھیرے میں کچھ دیکھ رہی تھی۔تھوڑی دیر چپ رہی پھر ہونٹوں میں بولی۔''نفیسہ گھر سے بھاگ گئی۔''

MashalBooks.com

اس کے بعد پھر وہ چپ ہوگئی۔ یہ خاموشی اتنی جان لیوا تھی جیسے گاؤں پر چھائی تاریکی۔ چند منٹ بعد پھر اس کے ہونٹ کھلے اور اسی سرگوشی میں پھر بولی۔ ''اور کفروی جیل میں ہے۔''

اب اس نے اپنے ہونٹ اتنی زور سے بھینچ لئے جیسے اب وہ کبھی نہیں کھلیں گے۔ کافی دیر بعد اس نے جلال کی آواز سنی جو کہیں بہت اندر سے آ رہی تھی۔ ''اور زینب؟''

جلال کی آواز میں لرزش تھی' ایک جھجک تھی' ایک ہچکچاہٹ تھی' جیسے وہ معلوم بھی کرنا چاہتا ہو اور اس جواب سے بھی ڈرتا ہو جو اسے ملے گا۔ وہ سب کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن اس انکشاف سے ڈرتا ہے جو اس کے سامنے ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ کچھ ہوگیا ہے۔ اسکے اندر عجیب سے جذبات نے کھلبلی مچا دی تھی۔ کفروی اس کا ماموں تھا اور نفیسہ اس کی پھوپھی زاد بہن۔ مگر زینب اس کے لئے کوئی اور ہی ہستی تھی۔ وہ جب بھی زینب کی آواز سنتا تھا اس کے اندر کچھ ہل چل سی مچ جاتی تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا اسکے گھٹنے جواب دینے لگتے جیسے اس کے پٹھے کمزور پڑ گئے ہوں۔ اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جائے اور آنکھیں بند کر لے۔ کبھی وہ اس کی ننگی پنڈلیاں دیکھ لیتا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے سب کی نظروں سے بچا کر کہیں دور لے جائے اور اپنی بانہوں میں خوب زور سے بھینچ لے۔

اس کی ماں جانتی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے' وہ پہچان لیتی تھی کہ اس کی آواز کیوں کپکپا رہی ہے۔ وہ جان لیتی تھی کہ زینب جب کھیتوں میں ہوتی تو اس کی نظریں اسے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ وہ پہچان لیتی تھی کہ زینب کی آواز آتے ہی وہ اس کی چاہت میں تڑپنے لگتا ہے اور جب زینب اس کے پاس آ کر بیٹھتی ہے تو اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔

ایک رات وہ ماں کے ساتھ چٹائی پر لیٹا تھا تو ماں نے اسے لمبا سا سانس لیتے سنا۔ ''کیا بات ہے جلال؟'' ماں نے پوچھا۔

''اماں مجھے زینب اچھی لگتی ہے۔'' اس نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

''تو جنگ سے واپس آ جا۔ تیری شادی اسی سے کر دیں گے۔'' اس نے اس کے سر پر بچوں کی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

لیکن اب ذکیہ خاموش تھی۔ جلال نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ماں کی طرف

دیکھا۔اس وقت بہت اندھیرا تھا مگر اس نے دیکھ لیا کہ ماں کی نظریں سامنے لوہے کے اس پھاٹک پر لگی ہوئی ہیں جو گھر کے سامنے دوسری طرف کسی دیو کی طرح کھڑا ہے۔

اس نے ماں سے پھر سوال کیا۔اس بار وہ اپنی آواز کی لرزش نہ چھپا سکا۔

''زینب کہاں ہے؟اس کے باپ اور بہن چلے گئے تو اس نے کیا کیا؟''

''وہ میئر کے گھر کام کرتی ہے۔''

اب جلال نے سوال کیا تو اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا''اور رات کہاں رہتی ہے؟''

''رات کو تو وہ میرے پاس ہی رہتی ہے۔وہ اس وقت تنور کے اوپر سورہی ہے۔''

جلال نے مشکل سے تھوک نگلا۔اس کے جسم کی کپکپی کچھ کم ہوگئی۔وہ زمین پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا''اماں میرے لئے کوئی صاف جلابیہ ہے؟''

''ہاں ہاں ہے' تو نے فوج میں جانے سے پہلے جو جلابیہ بنایا تھا وہ میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔''

اسے لگا کہ وہ اپنی پرانی زندگی میں پھر واپس آرہا ہے۔''میرے لئے پانی گرم کردو میں نہانا چاہتا ہوں۔''اس نے کہا۔

(17)

گاؤں کا پولیس افسر جیسے ہی اس کمرے میں داخل ہوا جہاں میئر بیٹھا تھا اسے فوراً احساس ہو گیا کہ وہاں اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ زینب کے ساتھ جلال کی شادی کے بعد سے شیخ زہران اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے خدشے کا اظہار گاؤں کے حجام کے سامنے بھی کیا تھا لیکن حاجی اسمٰعیل نے اسے تسلی دی تھی۔ ''فکر نہ کرو' جلال بہت تھکا ماندہ اور پریشان حال جنگ سے واپس آیا ہے' وہ میئر کے منہ لگنے کی ہمت نہیں کرے گا بلکہ وہ تو خوش ہو گا کہ اس کی بیوی گاؤں کے سب سے بڑے آدمی کے گھر کام کرتی ہے۔''

''تم جلال کو نہیں جانتے' میں اسے جانتا ہوں۔'' شیخ زہران بولا۔ ''وہ ان احمق لوگوں میں سے ہے جو اپنی بیویوں پر کسی اور کی نظر برداشت نہیں کر سکتے۔ اور وہ تو زینب سے اس وقت سے پیار کرتا ہے جب وہ بچی تھی۔''

''اگر وہ احمق ہے تو اسے کسی بات کا شبہ نہیں ہو گا۔ عقل مند لوگ ایسی باتیں سوچا کرتے ہیں''۔ حاجی اسمٰعیل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''مگر اس نے اپنی بیوی کو میئر کے گھر بھیجنا بند کر دیا ہے۔'' شیخ زہران بولا۔

''اس جیسے بیوقوف لوگ ہی اپنی بیوی سے کام کرانے کے بجائے سوکھی روٹی کھانا پسند کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کسی کے گھر میں کام کرنا بے عزتی کی بات ہے۔''

''مگر وہ تو کسی کا گھر نہیں ہیں میئر کا گھر ہے۔'' شیخ زہران بولا۔

''احمق لوگ اس میں کوئی فرق نہیں کرتے شیخ زہران' ان کے لئے سب گھر

MashalBooks.com

برابر ہوتے ہیں۔''

''زینب میسّر کے گھر نہ گئی تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حجام نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اب تک زینب سے میسّر کا دل ہی بھر چکا ہو۔ اسے اس کی ضرورت ہی نہ رہی ہو۔ تم تو جانتے ہو اس کا دل جلد ہی بھر جاتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی اس کے پاس زیادہ دن نہیں رہتی۔''

شیخ زہران کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور وہ دن آ گیا جب میسّر نے اسے بلایا اور حکم دیا۔ ''جاؤ' زینب کو لے کر آؤ۔''

اب شیخ زہران اور حاجی اسمٰعیل دوکان کے سامنے حقہ پی رہے تھے اور اس بارے میں سوچ رہے تھے۔

''تم جلال کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔'' شیخ زہران کہہ رہا تھا۔ ''یہ سچ ہے کہ وہ کفرالنین کے باقی دیہاتیوں کی طرح بیوقوف ہے۔ لیکن کیا پتہ اس نے فوج کی نوکری میں مصر جا کر بہت کچھ سیکھ لیا ہو۔ یاد رکھو وہ اس عرصے میں فوجیوں کے ساتھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے اب اسے تعویذ گنڈوں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا''

''گاؤں کے مرد بزدل ہیں' ذرا ڈراؤ اسے شیخ زہران' تم تو ان لوگوں سے نبٹنا خوب جانتے ہو۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر جلال جیسے آدمی سے نبٹنے کے لئے ہمیں طاقت سے کام نہیں لینا چاہئے۔ تم اسے نہیں جانتے' وہ کفروی نہیں ہے۔ وہ تو سارے گاؤں میں ہنگامہ کر دے گا۔ حالات ویسے ہی خراب ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں نے بھی باتیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ چیزوں کی قیمتیں برابر بڑھ رہی ہیں اور کسانوں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگ رہے ہیں۔ میسّر کو بھی اب لوگوں نے برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔''

''مگر تم پہلے اسے سمجھا کر دیکھ چکے ہو۔ اب تو تمہیں طاقت سے ہی کام لینا پڑے گا۔''

شیخ زہران کافی دیر خاموش رہا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو' حاجی اسمٰعیل پہلے تو انتظار کرتا رہا پھر خود ہی بول پڑا۔

''کیا سوچ رہے ہو شیخ زہران؟''

''میں کوئی آسان طریقہ سوچ رہا ہوں۔سختی کرنا اچھا نہیں ہوگا۔'' شیخ زہران نے جواب دیا۔

حاجی اسمٰعیل کچھ کہنے سے پہلے کافی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔''تم جلال سے ڈرتے ہو؟''

گاؤں کے پولیس افسر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔''جلال سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔مگر اس بار مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے مگر مجھے ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے حاجی اسمٰعیل' لوگ بدل گئے ہیں۔ جو لوگ پہلے تمہاری طرف دیکھتے تھی ڈرتے تھے اب وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں' میں کہیں سے گزرتا ہوں تو کوئی سر بھی نہیں جھکاتا۔کل کی ہی بات ہے ایک کسان نے لگان دینے سے ایک تو انکار کیا اوپر سے وہ چیخا کہ ہم سال بھر محنت کرتے ہیں پھر بھی حکومت کے قرض دار رہتے ہیں۔ میں نے پہلے کبھی کسی سے ایسی بات نہیں سنی۔ کسان اب زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔نہیں سوکھی روٹی اور سڑے ہوئے اچار کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ بھوک انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ پھر اسے حکومت یا خدا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بھوک انسان کو کافر بنا دیتی ہے' حاجی اسمٰعیل۔''

''وہ تو ہمیشہ کے بھوکے ہیں' اور کسان تو ہمیشہ سے سوکھی روٹی اور اچار کھاتے چلے آرہے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ جانتے ہی نہیں۔'' حاجی اسمٰعیل پل بھر چپ رہا پھر ایک دم ایسے بولا جیسے اسے کوئی نئی بات سوجھی ہو۔''شیخ زہران۔اسے ڈرانے کے بجائے کیا لالچ میں نہیں پھنسایا جا سکتا؟ ذکیہ اور جلال قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔تم حکومت کے محصول وصول کرتے ہو۔اگر تم جلال کو سمجھا دو کہ اس کے ساتھ تم نرمی برتو گے تو پھر اس سے جو چاہو کام لے سکتے ہو۔''

''حاجی اسمٰعیل تم نہیں جانتے' میں اس کے ساتھ کیا کیا حربے استعمال کر چکا ہوں۔ جب سے مجھے اس کی شادی کا پتہ چلا ہے میں یہی کچھ تو کر رہا ہوں۔ مجھے پہلے پتہ چل جاتا تو میں یہ شادی ہی نہ ہونے دیتا مگر مجھے بہت بعد میں پتہ چلا۔ اسی دن سے مجھے معلوم تھا کہ ایک دن میئر مجھے بلائے گا اور زینب کو واپس لانے کو کہے گا۔ میں نے جلال کو سمجھایا کہ زینب کو میئر کے گھر جانے دے۔مگر وہ کہنے لگا کہ زینب نے خود ہی وہاں جانے سے انکار کر دیا ہے۔''

''تمہارا خیال کیا ہے؟ ان دونوں میں کون ایسا کر رہا ہے؟'' حاجی اسمٰعیل نے سوال کیا۔

''زینب جلال سے واقعی محبت کرتی ہوگی' یا پھر یہ سوچتی ہوگی کہ شادی کے بعد میئر کے پاس جانا گناہ ہے۔''

''کچھ بھی ہو'' شیخ زہران بولا۔ جلال کی موجودگی نے ہی اس کی ہمت بڑھائی ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''اس کے بعد؟'' شیخ زہران نے بولنا شروع کیا۔ ''میں نے وہی کرنے کی کوشش کی جو تم کہہ رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ تیرا لگان کم کرا دیا جائے گا۔ مگر وہ تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔ اب تو شاید مجھے اپنے اختیارات ہی استعمال کرنا پڑیں گے۔''

''اب کیا کرو گے؟''

''اب وہ یا فوراً لگان ادا کرے گا یا اس کی زمین ضبط کر لی جائے گی۔''

''مگر زمین تو ان کی زندگی ہے'' شیخ اسمٰعیل بولا۔ ''اسے ضبط کرنے کا مطلب ان کی جان لینا ہوگا۔ اور اگر تم نے صرف جلال کے ساتھ ایسا کیا تو تم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ سارے کسان حکومت کے مقروض ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ صرف جلال کے ساتھ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی اور راستہ سوچو۔''

شیخ زہران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے خیال میں جلال سے نپٹنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کسی طرح بھی اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اس نے کفروی سے اس طرح نجات حاصل کی تھی کہ اسے جھوٹے الزام میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا۔ اب وہ بیٹھا سر کھجا رہا تھا۔

شیخ اسمٰعیل نے وہ سوال تو نہیں سنا جو شیخ زہران کے دماغ میں گردش کر رہا تھا مگر اس کی نظروں سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اب صرف حقے کی گڑگڑ سنائی دے رہی تھی یا پھر حاجی اسمٰعیل کے ناک صاف کرنے یا کھنکارنے کی آواز آ جاتی تھی۔ کالی رات نے کفرالنین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور دریا کی سطح پر ہوا کا شائبہ تک نہیں تھا۔ گاؤں کے افسردہ گھر اور پیچیدہ گلیوں پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے ہر قسم کی حرکت تھم چکی ہو۔

MashalBooks.com

(18)

ذکیہ روز کی طرح اپنے دروازے پر بیٹھی سامنے بلند و بالا آہنی پھاٹک کو تک رہی تھی کہ ایک دم بہت سی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ پھر بہت سے لوگ اس کے گھر میں گھس آئے۔ ان میں آگے آگے گاؤں کا پولیس افسر تھا۔ تنگ آنگن میں اس کی آواز گونج رہی تھی ''تلاشی لو گھر کی۔''

ابھی وہ یہ پوچھنے بھی نہ پائی تھی کہ کس چیز کی تلاشی لی جا رہی ہے کہ لوگوں نے کچے گھر میں ادھر ادھر تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہ دروازوں کے پیچھے' تنور کے اوپر' چھت پر اور ہر کونے کھدرے میں جھانک رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک آدمی ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی اٹھائے باہر آیا۔ وہ پوٹلی لئے پولیس افسر کے قریب گیا۔ ''مل گیا شیخ زہران۔ اس نے تنور کے اوپر چھپایا ہوا تھا۔''

شیخ زہران گلا پھاڑ کر چیخا۔ ''چور کہیں کا' پکڑ واسے' تیرا بیٹا کہاں ہے ذکیہ؟''

''وہ تو کھیتوں میں ہے۔'' اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''اس نے کیا کیا۔ آپ لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں؟''

''تیرا بیٹا چور ہے ذکیہ۔ اس نے میئر کے گھر پر چوری کی ہے۔'' شیخ زہران نے وہ پوٹلی ذکیہ کی طرف بڑھائی ''یہ دیکھو۔'' اس نے اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ''اس میں چاندی کے سکے ہیں۔''

پہلے تو اسے حیرت ہوئی پھر اس پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس کے سامنے لالٹین کی روشنی میں چاندی کے سینکڑوں سکے چمک رہے تھے۔ پھر وہ غصے میں چیخی۔ ''میرے بیٹے نے چوری نہیں کی شیخ زہران۔ یہ جھوٹ ہے وہ تو میئر

کے گھر کبھی گیا ہی نہیں۔''

شیخ زہران نے طنز کے ساتھ زور کا قہقہہ لگایا۔''تو اپنے بیٹے کو نہیں جانتی' یا پھر بن رہی ہے' تجھ سے اس نے اس پوٹلی کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں شیخ زہران۔'' وہ جلدی سے بولی۔''مجھے کچھ پتہ نہیں۔اور میرے بیٹے نے یہ پوٹلی چوری نہیں کی ہے۔''

پولیس افسر نے پھر طویل قہقہہ لگایا۔''اچھا؟...... تو پھر ذرا بتاؤ یہ کس نے چرائے ہیں؟ اور اسے تیرے تنور کے اوپر کس نے چھپایا؟ کوئی بھوت آیا تھا؟''

اس نے اپنے منہ زور زور سے دو ہتھڑ مارے۔''ایسا نہیں ہوسکتا۔ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔میرا بیٹا چور نہیں ہے۔تم اسے کفروی کی طرح ہم سے چھین کر نہیں لے جاسکتے۔''

لیکن وہ اسے بھی لے گئے۔جلال کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہو رہاہ۔وہ اسے کھیت سے سیدھا تھانے لے گئے' اسی جلابیہ میں جس وہ کام کر رہا تھا۔اس کے بعد وہ اسے مسلسل ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جاتے رہے اور طرح طرح کے سوال پوچھتے رہے۔وہ جیسے خواب میں چل رہا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔اس سے جو سوال کئے جا رہے تھے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا وہ کیا جواب دے۔وہ بار بار یہی کہتا۔''مجھے کچھ نہیں معلوم مجھے نہیں پتہ۔میں اس پوٹلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔میں کبھی میسئر کے گھر نہیں گیا۔''

لیکن وہ اس کے خلاف گواہ لے آئے۔ان میں ایک خود پولیس افسر تھا۔ایک گواہ نے کہا کہ اس نے جلال کو میسئر کے پچھلے دروازے سے بھاگتے دیکھا۔دوسرے نے کہا کہ اس نے اسے پوٹلی ہاتھ میں لئے جاتے دیکھا۔تیسرے نے کہا کہ اس نے جلال کو جاتے دیکھا تو اسے آواز دی مگر وہ رکا ہی نہیں۔بلکہ جواب دینے کے بجائے بھاگ کھڑا ہوا اور میسئر کے گھر کے سامنے جا کر غائب ہوگیا۔گاؤں کا پولیس افسر آخری گواہ تھا۔اس نے کہا کہ'' وہ ایک فوجی کی حیثیت سے جلال کی عزت کرتا ہے۔اس نے ہمارے بزرگوں کی سرزمین کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں بہادری دکھائی ہے۔میں ہمیشہ اس پر بھروسہ کرتا تھا۔لیکن مجھے جب چوری کی خبر ملی تو مجھے اس کے گھر کی تلاشی لینا پڑی۔''تھوڑے وقفہ کے بعد وہ بولا۔''جلال نے پہلی مرتبہ چوری کی ہے۔سمجھ میں نہیں آتا اس

نے یہ حرکت کیوں کی۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ مگر میرا خیال ہے اس نے سرکاری لگان ادا کرنے کے لئے ایسا کیا ہوگا۔ اس پر بہت لگان چڑھ چکا ہے۔ اسے اپنی زمین ضبط ہو جانے کا خطرہ تھا۔''

پولیس افسر خوب جانتا تھا کہ ایسے موقعہ پر کیا کہا جاتا ہے اور کس قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ وہ پولیس کے سارے حربوں سے بخوبی واقف تھا۔

گواہوں کے بیانات اور پولیس افسر کے ثبوت کے بعد مجسٹریٹ نے جلال سے سوال کیا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو وہ بولا۔

''میں اس پوٹلی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' بار بار وہ یہی دھراتا رہا۔ اس کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ اور وہ حیران پریشان چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ''میں میئر کے گھر کبھی نہیں گیا۔'' اس نے آخر میں کہا۔

آخر انہوں نے اسے جیل بھیج دیا۔ جیل میں اسے ایک ایسے چھوٹے سے تنگ کمرے میں رکھا گیا جس میں سانس لینا بھی دشوار تھا۔ یہ کمرے غریب قیدیوں کے لئے تھے۔ پہلے تو اسے اس کمرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو اس نے اپنے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ اسے وہاں بیٹھے سوکھے اور دبلے پتلے چہرے نظر آئے۔ ایسے چہرے جن پر سوکھی کھال چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں کالی تھیں اور اس کی طرح اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کب کی اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر چکی ہیں۔ کب سے انہوں نے مقابلہ کرنا ترک کر دیا ہے۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے اس کے سامنے اس کے ماموں کفروی کا چہرہ ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کفروی ماموں؟''

لیکن اندھیرے میں آواز آئی ''کفروی کون ہے' بیٹے؟''

(19)

وہ جلال کو پکڑنے آئے تو زینب اس کے بازو سے لپٹ گئی اور چیخنے لگی۔ ''میرے میاں کو مت لے جاؤ۔ مجھے بھی اس کے ساتھ لے جاؤ۔......'' مگر لوگوں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور جلال کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

زینب تین دن تک کچھ نہ بولی۔ وہ کھیت پر بھی نہیں گئی۔ وہ بھینس کے گلے میں رسی ڈال کر کھینچتی ہوئی باہر لے کر نہیں گئی۔ وہ دریا سے پانی بھرنے بھی نہیں گئی۔ اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ وہ اپنی پھوپھی ذکیہ کے ساتھ دروازے پر چپ چاپ بیٹھی اس راستے کو تکتی رہی جس راستے سے وہ جلال کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔

تیسرے دن وہ اٹھی۔ بھینس کو باہر نکالا اور کھیت کی طرف چلی۔ واپس آئی تو بھینس اس کے ساتھ نہیں تھی مگر اس کی چھاتیوں کے درمیان ایک رومال چھپا ہوا تھا جس میں کچھ سکے تھے۔ وہ واپس آ کر اپنی پھوپھی کے ساتھ پھر دروازے پر بیٹھ گئی۔

چوتھے دن صبح ہوتے ہی وہ اٹھی اور گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئی جہاں بس ٹھہرتی تھی۔ وہ بس میں باب الحدید پہنچی۔ وہاں اس نے ایک راہ گیر سے معلوم کیا کہ جیل کہاں ہے۔ پھر وہ ٹرین میں بیٹھی اور وہاں پہنچ گئی جہاں جیل تھی۔ وہ جیل کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ لیکن دروازے پر کھڑے آدمی نے اسے بتایا کہ تحریری اجازت کے بغیر ملاقات نہیں ہو سکتی۔

اس نے پوچھا کہاں سے اجازت مل سکتی ہے اور درخواست کون لکھتا ہے؟

MashalBooks.com

اس شخص نے اسے سب سمجھایا۔ اس نے پھر ٹرین پکڑی اور واپس باب الحدید پہنچی۔ وہاں سے وہ ٹرام میں بیٹھی جس نے اسے ایک ایسی عمارت کے سامنے پہنچا دیا جو لوگوں سے اور میز کرسیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ عمارت کے اندر گئی اور لوگوں میں کھو گئی۔ وہاں وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتی رہی آخر دفتر کا وقت ختم ہو گیا۔ کئی دن وہ ایسا ہی کرتی رہی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ ایک ہی جگہ چکر لگائے جا رہی ہے۔

آخر ایک دن وہ ساری رقم ختم ہو گئی جو وہ لے کر آئی تھی۔ پھر ایک مہربان شخص نے اسے سہارا دیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مصیبت زدہ عورتوں کو مسجد السیدہ میں پناہ دیتے ہیں۔ لیکن وہ اسے مسجد لے جانے کے بجائے اپنے گھر لے گیا۔ اور پھر اپنے کمرے میں۔

اس کے بعد کفر النین میں کسی نے زینب کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔

(20)

جس دن وہ لوگ جلال کو اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اس کے بعد زینب بھی گھر سے چلی گئی تھی اس دن ذکیہ جو اپنے درواز پ پر بیٹھی تو پھر وہاں سے نہیں ہلی۔ وہ کسی سے نہیں بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ اس جانور کی طرح غصے میں پھنکارتی رہتی تھی جسے چاروں طرف سے شکاریوں نے گھیر رکھا ہو۔ اس کے دماغ میں کوئی خیال گردش کر رہا تھا۔ جیسے دور کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہو۔ جیسے تاریک آسمان پر کوئی چمک سی ہوتی ہو۔ وہ روشنی پل بھر کو چمکتی پھر غائب ہو جاتی۔ وہ اپنے دماغ میں اس روشنی کو اس طرح پکڑنے کی کوشش کرتی جیسے روئی میں الجھے دھاگے کا سرا کوء تلاش کر رہا ہو۔ لیکن ہر بار سرا اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔

لیکن اب اس کے دماغ کا اندھیرا ویسا نہیں تھا۔ اب وہ بدل گیا تھا' اب تو اس کا دماغ بھی وہ نہیں تھا۔ کوئی چیز اس کے اندر حرکت کرنے لگی تھی۔ ایک چھوٹی سی چمکدار چیز۔ ایک سوال اسکے دل و دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔ ایسا سوال جو پہلے اس کے سامنے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ سوال بڑھتے بڑھتے بہت سی گھنٹیوں کی طرح اس کے اندر بجنے لگا۔ ''اگر جلال نے ایسا نہیں کیا تھا تو پھر وہ کون تھا؟۔ جلال نے تو بالکل ایسا نہیں کیا۔''

پھر اسے وہ دن یاد آئے اجب میسؔر نے زینب کو بلانے آدمی بھیجا تھا۔ لڑکی شادی ہو چکی تھی اس لئے اس نے عہد کیا تھا کہ اب وہ میسؔر کے گھر قدم نہیں رکھے گی۔ اس نے نماز کے مصلے پر اللہ سے وعدہ کیا تھا۔ ''یا اللہ' مجھے تو نے جو حکم دیا تھا وہ میں نے پورا کیا۔ میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں کہ تو نے میری پھوپھی کو ٹھیک کر دیا۔ اب میں خدا کے حکم اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق جلال کی بیوی ہوں اس لئے اب میں میسؔر کے گھر نہیں

جاؤنگی۔'' اسی رات جیسے کسی نے اس سے کہا تھا۔''ہاں زینب۔ اب تو کسی کی بیوی ہے تیرے لئے میئر کے گھر جانا منع ہے۔''

لگتا تھا' اس نئے احساس نے اسے ایک نئی طاقت عطا کر دی تھی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے میئر کے گھر نہیں بھیج سکتی تھی۔ چنانچہ جب شیخ زہران اس کے پاس آیا تھا تو اس نے کہہ دیا تھا۔''نہیں شیخ زہران میں نہیں جاؤں گی۔ میں خدا کا فرمان نہیں ٹال سکتی۔''

''تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میئر کے گھر گئی تو خدا کی نافرمانی کرے گی؟۔ یہ تو اللہ کا حکم ہے کہ تو میئر کے گھر جائے۔'' شیخ زہران نے اسے سمجھایا تھا۔

''یہ پہلے کی بات ہے۔ اب میری شادی ہوگئی ہے۔ اب اللہ نے وہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔''

اس وقت ذکیہ بیٹھی یہ سب سن رہی تھی۔ اس نے ساری باتیں اس وقت سن لی تھیں۔ اب بیٹھے بیٹھے اچانک اس کے سامنے ایک ستارہ سا چمکا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے خیال آنا شروع ہوا۔ اور پھر وہ خیال اس کے دل ودماغ میں چھا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈور کا سرا آ گیا تھا اور دھاگہ خود ہی کھلتا چلا جارہا تھا۔

پھر اس کے دماغ میں ایک اور آواز نے سر اٹھایا۔ پہلے وہ دھیمی آواز تھی پھر وہ آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ جلال جس دن جیل گیا اس کی دوسری رات کو زینب نے محسوس کیا کہ اس کی پھوپھی نے زور سے اس کے کہنی ماری ہے۔ وہ اسکے ساتھ ہی لیٹی تھی۔ اس نے بوڑھی عورت کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ وہ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان کے اندر ایک خوف ناک سی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ زینب نے سنا وہ اس کے کان میں کہہ رہی تھی''زینب' زینب......''

''کیا بات ہے پھپھو؟''

''اب تک میری آنکھیں بند تھیں اب کھل گئی ہیں۔''

''تمہاری آنکھیں تو بند نہیں تھیں۔'' زینب نے لرزتے ہوئے کہا تھا۔''بات کیا ہے؟''

پل بھر کو تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی پھوپھی پھر بیمار ہوگئی ہیں۔ اس سے دونوں ہاتھوں سے انہیں پکڑا اور نرمی سے کہا۔''لیٹ جاؤ پھپھو۔ تم تھکی ہوئی ہو۔ جب سے جلال

گیا ہے تم ایک منٹ کو بھی نہیں سوئی ہو۔''

مگر اس کی آنکھوں میں وہ ڈراؤنی رات ابھی تک تھی۔ لگتا تھا وہ پاگل ہو گئی ہے' پھر ذکیہ زیرِ لب بڑبڑائی۔''میں جان گئی ہوں وہ کون ہے' میں جانتی ہوں زینب' میں جان گئی ہوں۔''

''کون ہے وہ؟'' زینب کا بدن ایسے کانپ رہا تھا جیسے اسے بخار چڑھا ہوا۔

''وہ وہی ہے وہی' ہاں وہی۔'' اس نے اس آواز میں کہا جیسے کہیں دور سے بول رہی ہو۔

اب زینب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے ذکیہ کو ہاتھ لگایا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

''اللہ سے دعا مانگو پھپھو' وہ تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ اٹھو وضو کر کے نماز پڑھو اور پانے گناہوں کی معافی مانگو۔ دعا کرو کہ اللہ ہم دونوں پر اپنا کرم نازل کرے۔''

''زینب تو کچھ نہیں جانتی۔ تو کچھ بھی نہیں جانتی۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔'' صرف میں جانتی ہوں ہاں میں جانتی ہوں۔''

MashalBooks.com

(21)

ذکیہ اسی طرح گم صم اپنی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ٹکٹکی لگائے سامنے تکے جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اندھیرے کو چیرتی آہنی پھاٹک تک جا رہی تھیں جو اس کے سامنے کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کس کا انتظار ہے لیکن جیسے ہی آہنی سلاخوں کے پیچھے سے نیلی آنکھیں نمودار ہوئیں وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ وہ کیوں کھڑی ہوئی؟ اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب وہ کیا کرنے والی ہے۔ وہ باڑے کی طرف گئی۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا۔ اسے کونے میں کدال رکھا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ سخت کھردرے اور بڑے تھے۔ جب وہ وہاں سے باہر نکلی تو اس کی انگلیوں نے کدال کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ میئر نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے سوچا میرے فارم پر کام کرنے والی کوئی عورت ہوگی۔ وہ قریب آیا تو اس نے اسے پہچانا۔ وہ کدال سر سے اونچا اٹھائے کھڑی تھی۔

میئر کو احساس ہی نہیں ہوا کہ کدال کب اس کے سر پر پڑا اور اس نے کب کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس سے ایک لمحہ پہلے اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ صرف ایک پل کے لئے۔ اس لمحے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ وہ کچھ بھی نہیں جان سکا۔

MashalBooks.com

(22)

کالی گاڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی اور اس میں ذکیہ ایسے ہی بیٹھی تھی جیسے وہ ہر روز اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا کرتی تھی۔ وہ ان گلیوں اور سڑکوں پر سے گزر رہی تھی جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ان کا کوئی وجود بھی ہے۔ جس دنیا کو وہ جانتی تھی یہ اس سے بالکل ہی مختلف دنیا تھی۔ گاڑی کی کھڑکی کی ایک درز سے دریا نظر آ رہا تھا۔ جو کفر النین کے نیل کی طرح تھا لیکن وہ نیل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ گاڑی ایک بہت بڑے دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس کے ہاتھوں میں انہوں نے ہتھکڑیاں ڈال رکھی تھیں مگر اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے ہونٹ سختی کے ساتھ بھینچے ہوئے تھے جیسے وہ بولنا ہی نہیں جانتی۔ جیسے وہ الفاظ ہی بھول چکی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ بیٹھے لوگ اسے بڑبڑاتے سنتے جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔ میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔'' جیل کی کوٹھڑی میں وہ دوسری عورتوں کے ساتھ فرش پر لیٹ جاتی۔ آدھی رات کو اس کی آنکھیں کھلی ہوتیں اور وہ اندھیرے میں تکتی رہتی۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ سختی کے ساتھ بند رہتے' مگر ایک قیدی عورت نے اسے بڑبڑاتے سنا۔ ''میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔'' اس عورت نے تجسّس کے سات اس سے پوچھ لیا۔

''کون ہے وہ؟''

اور ذکیہ نے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں وہ وہی ہے' وہی ......؟ وہ سب سے بڑی طاقت......''

''مگر وہ کہاں ہے؟'' عورت کا تجسّس اور بڑھا۔

''وہ وہاں ہے میری بچی۔ میں نے اسے نیل کے کنارے دفن کر دیا ہے۔''

MashalBooks.com

افسانے

MashalBooks.com

MashalBooks.com

ایک سابق وزیر کی موت

امی جان' میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیجئے۔ میرے بال' میری گردن اور میرے سینے کو آہستہ آہستہ سہلائیے۔ جیسے آپ میرے بچپن میں کیا کرتی تھیں۔ اس دنیا میں آپ ہی میری رہ گئی ہیں اور آپ کا ہی چہرہ ہے جو میں اپنے آخری دموں میں دیکھ رہا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ آپ مجھے ڈانٹیں کہ میں پانچ سال آپ کے پاس کیوں نہیں آیا۔ لیکن آپ اکیلی تو نہیں تھیں۔ جنہیں میں نے بھلا دیا تھا۔ میں نے تو ساری دنیا کو بھلا دیا تھا حتیٰ کہ میں تو اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ اپنے گھر' اپنے بیوی بچوں اور اپنے دوستوں سب کو ہی بھول گیا تھا۔ مجھے گولف کھیلنے کا کتنا شوق تھا لیکن پانچ سال میں وہ بھی نہیں کھیل سکا۔ میں نے تو اپنی ننھی منی بیٹی کو بھی نہیں دیکھا جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ میرا اپنا چہرہ امی جان' میں نے اس عرصے میں خود اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔ جلدی جلدی گھر سے باہر نکل رہا ہوتا تو آئینے کے سامنے صرف اس لئے چلا جاتا کہ ٹائی تو ٹھیک بندھی ہے اور قمیض ٹائی کے ساتھ میچ کر رہی ہے یا نہیں۔ اگر اپنے چہرے پر نظر پڑ بھی جاتی تب بھی میں اسے نہ دیکھتا۔ میں اپنے دفتر میں یا کار کی ونڈ اسکرین سے بازار میں لوگوں کے چہرے دیکھتا تو میں انہیں بھی نہیں دیکھتا۔ وہ زور زور سے بول رہے ہوتے تب بھی میں ان کی آواز نہ سنتا۔ کار کا ہارن بھی مجھے سنائی نہ دیتا خواہ وہ بالکل میرے پیچھے ہی آ رہی ہوتی۔ اکثر اوقات تو کار میرے سر پر ہی آ جاتی اور مجھے ٹھہرنا پڑ جاتا۔

امی جان' میں تو ان لوگوں میں سے تھا جو اس دنیا میں نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ آخر میں کس دنیا میں رہتا تھا؟ کیا انسانوں کی اس دنیا کے سوا کوئی اور ایسی دنیا ہے جس میں کوئی رہ سکے سوائے اس کے کہ خدا اسے اس دنیا سے ہی اٹھا لے؟ امی جان' میں جانتا

MashalBooks.com

تھا کہ خدا نے مجھے ابھی نہیں اٹھایا ہے کیونکہ اخباروں میں میرے لئے ماتمی کالم نہیں چھپے۔ میرے جیسے مرتبے کے کسی شخص کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ مر جائے اور اخبار اس کے لئے جلی سرخیوں کے ساتھ ماتمی کالم نہ چھاپیں۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ایسے شخص کا شاندار جنازہ نہ اٹھایا جائے اور اس میں بڑے بڑے لیڈر حتیٰ کہ صدر مملکت تک شامل نہ ہوں اور ساری دنیا ان کے لئے رو نہ رہی ہو۔ مجھے یاد ہے جب میں ایسے کسی جنازہ میں شریک ہوتا تھا تو میرے اوپر اس کا بہت اثر ہوتا تھا۔ میں ایک نشہ کے عالم میں جنازہ کے ساتھ چلتا۔ میری خواہش ہوتی کہ کاش یہ جنازہ میرا ہی ہوتا۔ لیکن چونکہ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں تابوت میں موجود ہوتا اور ہمیشہ میں نے اپنے آپ کو جنازہ کے ساتھ زندہ چلتے دیکھا اس لئے امی جان، مجھے یقین تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔

لیکن میں اس دنیا میں نہیں رہا جس میں آپ لوگ رہتے ہیں۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا جو آپ کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ میرا تعلق ان سے بھی زیادہ اہم قومی معاملات سے تھا۔ میری ذمہ داریاں بے حد و حساب تھیں اتنی بھاری کہ میرا دماغ میرا جسم ان کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ میرا جسم میرا ساتھ چھوڑ دیتا۔ میرا دماغ کام کر رہا ہوتا اور جسم بے حس و حرکت ہو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جسم حرکت کر رہا ہوتا اور دماغ سوچنا چھوڑ دیتا۔ میرا جسم دفتر جاتا، اجلاسوں میں شرکت کرتا، کانفرنسوں میں شامل ہوتا اور ہوائی اڈہ پر سرکاری مہمانوں کا استقبال کرتا۔ استقبالیہ تقریر میں شریک ہوتا اور سرکاری مشن پر ملک سے باہر جاتا۔ امی جان، جب میں اپنے جسم کو خود بخود اس طرح چلتے پھرتے دیکھتا تو حیران ہوتا۔ بلکہ اس وقت تو ڈر جاتا جب میں کسی اہم اجلاس میں شرکت کر رہا ہوتا۔ ظاہر ہے ایسے اجلاسوں میں توجہ اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سب سے اہم اجلاس وہ تھا جس میں میں ایک ماتحت کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا......

جب میں حکومت میں آیا تو ماتحت بننے سے مجھے سخت نفرت رہی۔ اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے سامنے میں اپنے غصے اور نفرت کو دبا لیتا تھا لیکن پھر وہی غصہ اور وہی نفرت اپنے ماتحتوں پر اتارتا یا اپنے گھر میں بیوی پر اتارتا جیسے میرے والد آپ پر اتارا کرتے تھے۔ میں اپنے عام افسر کے سامنے بھی نفرت کا اظہار کرتے ڈرتا تھا۔ چاہے وہ کسی دوسرے محکمے کا سربراہ یا مینجنگ ڈائریکٹر ہی کیوں نہ ہو اور جب میرا افسر پورے ملک

کا سربراہ ہوتو اس کے سامنے تو جرات ہی نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے کیا کہا امی جان؟ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوتا تو میرے ہوش وحواس سارے چوکس ہوتے۔ میں سوچتا کہ اگر انہوں نے کوئی سوال کیا تو مجھے اس کا جواب آنا چاہئے اور جواب ایسا ہونا چاہئے جو صحیح ہو۔ صحیح بھی ہو ان کی مرضی کے مطابق بھی ہو۔

آپ نے کیا کہا امی جان؟ جی ہاں' یہ تو سیاست کی ابجد ہے جو ہم شروع میں ہی سیکھ لیتے ہیں۔ ہر جواب ہمیشہ سننے والے کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے۔ بلکہ مرضی کے مطابق جواب ہی صحیح جواب دیتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو ہمیشہ ذہنی اور جسمانی طور پر خبردار رہنا چاہئے اور اصل سچائی اور غلط سچائی میں فرق کرنا چاہئے۔ اور امی جان یہ کام بہت مشکل ہے۔ دنیا کے تمام کاموں سے زیادہ مشکل۔ میں اجلاسوں میں ذہنی اور جسمانی طور پر چوکنا ہو کر بیٹھتا' میں کرسی پر اس طرح بیٹھا ہوتا کہ میرا بایاں ہاتھ میری گون میں پڑا ہوتا اور دایاں ہاتھ کاغذ پر قلم رکھے بالکل تیار ہوتا کہ کوئی حرکت کوئی جنبش اور کوئی اشارہ ایسا نہ ہو جو میری توجہ سے نکل جائے۔ وہ اشارہ سر کا ہو' ہاتھ یا انگلی کی جنبش ہو' نچلے ہونٹ کا دبانا ہو یا ناک' منہ یا آنکھوں کے نیچے جلد کی تھوڑی سی جنبش ہو۔ مجھے دائیں اور بائیں آنکھ کی جنبش میں فرق کرنا پڑتا۔ میں ہر جنبش کو فوراً سمجھ لیتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میرے دماغ کے لئے ضروری تھا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ تیز ہو۔ اور میری آنکھوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ دماغ سے زیادہ تیز ہوں۔ اور کسی قسم کی حرکت سے پہلے انہیں دیکھ لینا چاہئے۔

آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان؟ جی ہاں' ان اہم اجلاسوں میں مجھے اپنے پانچوں حواس پر بھروسہ کرنا پڑتا۔ میں اجلاس میں بیٹھا ہوتا تو میرا دماغ اور میرا جسم انتہائی حساس رگوں کی شکل اختیار کر جاتے جیسے ریڈار کے تار میرے جسم کے ساتھ باندھ دیئے گئے ہوں اور ہو میرے دماغ' میرے دل' میرے ہاتھوں' میرے سینے اور پیٹ کو چلا رہے ہوں۔ میں اتنا حساس ہو جاتا کہ میرا پیٹ ایسے لرزتا جیسے اس میں بجلی کا سرکٹ رکھا ہو۔ خاص طور پر اس وقت جب میں اس کے قریب کھڑا یا بیٹھا ہوتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ میں انہیں بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبا لیتا اور پھر دونوں ہاتھوں کو اپنے ساتھ یا پیٹ کے ساتھ چمٹا لیتا۔ میں بیٹھا ہوتا یا کھڑا ہوتا میرے دونوں پاؤں ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے جڑے ہوتے ہیں۔ میں اس کے

ساتھ ہوتا تو امی جان' میری یہ حالت ہوتی۔ میرا جسم اور کوئی شکل اختیار کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔ جب لوگوں کے سامنے میری تصویر کھینچی جانے لگتی اور فلیش کی لائٹ میرے چہرے پر پڑتی تو میں اپنے ہاتھ سینے یا پیٹ سے ہٹانے کی کوشش کرتا لیکن وہ اسی طرح چپکے رہتے جیسے وہ مفلوج ہو گئے ہوں۔ کیا کہا آپ نے امی جان؟ جی ہاں' اخباروں میں میں نے اپنی وہی تصویر دیکھی تھی جسے دیکھ کر میں شرمندہ ہوا تھا۔ میں نے وہ اخبار سب گھر والوں سے چھپانے کی کوشش کی تھ خاص طور سے میں اسے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے چھپانا چاہتا تھا جس نے اسے دیکھ کر میرے چہرے پر انگلی رکھی تھی اور کہا تھا ''دیکھو امی' یہ ابا جان ہی ہیں نا؟'' اور بیوی نے اپنے شوہر پر فخر کرتے ہوئے سینہ پھلا کر کہا تھا۔ ''ہاں بیٹی' یہ آپ کے ابا جان ہی ہیں وہ صدرِ مملکت کے ساتھ کھڑے ہیں۔''

بیوی کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ میری بیوی کی اصل آواز نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور آواز ہے جسے اس نے ازل سے چھپایا ہوا ہے اور ابد تک چھپائے رکھے گی۔ اس وقت سے وہ اسے چھپائے ہوئے ہے جب ہماری شادی ہوئی تھی اور اس وقت تک چھپائے رکھی گی جب تک ہم مر نہیں جاتے۔ وہ اپنی اصل شکل اپنے اندر ہی کہیں چھپائے رکھے گی۔ میں نے کبھی اپنے ہاتھ کے نیچے اسے محسوس کیا تھا جیسے کوئی پرانا پھوڑا جو پھوٹتا نہیں۔

کیا فرمایا آپ نے امی جان؟ جی نہیں۔ میں صرف اپنی چھوٹی بیٹی کے سامنے شرمندہ ہوا۔ اس کی آنکھیں تو بچوں کی سی تھیں۔ اور شاید اسی وجہ سے...... وہ میرے اندر تک جھانک لیتی تھیں اور میری اصلیت دیکھ لیتی تھی۔ جو اس کرہ ارض پر اور کوئی نہیں دیکھ سکتا حتیٰ کہ میں خود بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کو یاد ہے امی' آپ کہا کرتی تھیں کہ بچے کے لئے ہر نقاب شفاف ہوتا ہے۔ وہ سب دیکھ لیتا ہے۔ اس وقت میں آپ کی بات کا اعتبار نہیں کرتا تھا لیکن جب میری اپنی بچی نے اپنی معصوم آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا تو مجھے آپ کی بات کا یقین آ گیا۔ میں اس سے ڈر گیا۔ کبھی تو میں سوچتا کہ یہ چھبتی ہوئی نظر بچے کی نہیں ہو سکتی۔ خاص طور سے کسی فطری بچے کی نہیں ہو سکتی۔ بچے کی نظر اتنی تیز' اتنی چھبنے والی اور اتنی گھورتی ہوئی نہیں ہونا چاہئے۔ خاص طور سے جب وہ اپنے سے بڑے اور صاحبِ اقتدار شخص کو دیکھ رہی ہو۔ اور پھر اگر وہ باپ ہو' خاندان کا سربراہ ہو' سب کو کھانے پینے کو دیتا ہو اور ان سب کے لئے' خاص طور سے بچوں کے لئے کام کرتا ہو......

آپ درست کہہ رہی ہیں امی جان۔ جب میں بچہ تھا تو ہمیشہ آپ یہی کہا کرتی تھیں۔ وہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے اور میں اپنی بیوی' اپنے بچوں اور پانے ماتحت کام کرنے والوں سے یہی بات کہا کرتا تھا۔ میں یہ کہہ کر خوش ہوتا تھا جیسے بچہ اپنی ماں کو خوش کر رہا ہو۔ میں جب اپنے ملازموں کی آنکھوں میں اپنے لئے تحسین و تعریف کے جذبات دیکھتا تو مجھے اپنا آپ اچھا لگنے لگتا اور میرا سینہ غرور سے بھر جاتا۔ اور مجھے یقین ہو جاتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ازل تا ابد سچ ہے اور اس کے برعکس جو کوئی کچھ کہے گا وہ غلط اور کفر ہوگا۔

کیا امی جان؟ جی' جونیر سرکاری ملازم سے وزیر بننے تک میں نے کبھی ایسے ماتحت کو پسند نہیں کیا جس نے میری بات کو جھٹلایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس عورت کو برداشت نہیں کر سکا۔ اسی لئے میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور وہ سنجیدگی اور وقار برقرار نہیں رکھ سکا جو وزیر اپنے ماتحتوں کے سامنے برقرار رکھتے ہیں۔ امی جان' میں آپے سے باہر ہو گیا اور اپنے مزاج کے خلاف میں نے اول فول بکنا شروع کر دیا۔ مجھے اس پر اس لئے غصہ نہیں آیا تھا کہ اس نے اپنی اس رائے کا اظہار کر دیا تھا جو میری رائے کے خلاف تھی' یا اس لئے کہ وہ ایک جونیئر ملازم تھی جو وزیر کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی یا اس لئے کہ وہ ایسی عورت تھی جس کی اپنی کوئی رائے تھی' یا اس لئے کہ اس نے حضور والا کہنے کے بجائے مجھے صرف جناب کہا تھا۔ بلکہ میں اس لئے اس پر ناراض ہوا تھا کہ اس نے مجھ سے بات کرتے ہوئے اس طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں جس طرح اس سے پہلے کسی نے میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔ ایسی نظریں' ایسی چبھتی ہوئی اور تیز نظریں مرد کی بھی ہوں تو انہیں گستاخی ہی مانا جائے گا۔ میں اس لئے ناراض نہیں ہوا تھا کہ اس نے ایسا کیا تھا بلکہ مجھے طیش آ گیا تھا کہ اس نے ایسی جرات کیسے کی تھی۔ اس نے ایسا کیا ہی کیوں تھا۔

جی کیا کہا؟ جی ہاں میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس نے یہ کیسے کیا۔ یہ جاننے کا خیال بھوت بن کر میرے سر پر سوار ہو گیا۔ مجھے اپنے اوپر بھی غصہ تھا کہ میں یہ بات سمجھ کیوں نہیں سکا۔ میں اسے سمجھنے کے قابل کیوں نہیں تھا۔ میں اتنے غصے میں تھا کہ دوسرے دن میں نے اسے حکم دیا کہ وہ میرے دفتر میں حاضر ہو۔ وہ آئی تو میں نے اسے کھڑا رہنے دیا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور اسے ایسے نظر انداز کیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میری نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ میں نے اسے کھڑا رکھا

اور میں بیٹھا فون پر باتیں کرتا رہا اور جو شخص بات کر رہا تھا اس کے ساتھ قہقہے لگاتا رہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ کھڑی رہی۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور نہ میری طرف دیکھا۔ وہ کھڑی دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں فون پر بات مکمل کرلوں گا تو وہ میری طرف دیکھے گی لیکن وہ اس کے بعد بھی تصویر کو ہی تکتی رہی۔ جیسے میرا وہاں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنی طرف دیکھنے سے پہلے اس کے چہرے کے نقوش پڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک دم منہ موڑا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ میں اچھل پڑا جیسے میرے تمام کپڑے اچانک میرے جسم سے گر پڑے ہوں۔ مجھے شرم آ گئی۔ مجھے اپنی چھوٹی بچی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ پھر پل کے پل میری شرم غصے میں تبدیلی ہوگئی اور دوسرے ہی لمحے وہ غصہ اس خواہش کی شکل اختیار کر گیا کہ جس طرح اس نے مجھے شرمندہ کیا ہے اسی طرح اسے بھی شرمندہ کیا جائے۔ اب میں نے خلافِ معمول اپنے آپ کو گلا پھاڑ کر چیختے سنا۔ ''تیری یہ مجال؟ تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ تجھے پتہ نہیں کہ تو ایک معمولی ملازم ہے اور میں وزیر ہوں اور تو کتنی ہی بلندی پر چلی جائے ہمیشہ عورت ہی رہے گی جس کی جگہ بستر پر مرد کے نیچے ہی ہے۔''

کیا کہا آپ نے؟ جی ہاں' کوئی بھی عورت یہ بات سنتی تو شرم سے وہیں مر جاتی' یا بیہوش تو ضرور ہو جاتی۔ خاص طور سے یہ بات کہنے والا جب کوئی عام مرد' اس کا کوئی اعلیٰ افسر یا محکمے کا سربراہ نہیں بلکہ بنفس نفیس خود وزیر تھا۔ پھر یہ بات اس نے کسی خالی کمرے میں نہیں سنی تھی بلکہ بھرے دفتر میں سنی تھی جہاں دوسرے افسر بھی بیٹھے تھے اور وہ سب اعلیٰ افسر تھے۔ ہاں امی' اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو شرمندگی سے مر جاتی۔ مگر امی حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عورت کو کوئی چیز قتل نہیں کر سکی۔ اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوئی' اس نے آنکھیں نیچی نہیں کیں' حتیٰ کہ پلک تک نہیں جھپکی۔ امی آپ خود ہی سمجھ سکتی ہیں کہ میری حیثیت' میرے رتبے اور میری مردانگی والا انسان اس پر کیا محسوس کرے گا اور اس صورت میں جب کہ میرا وقار اور میری خودداری صرف میری نظروں میں ہی اہم نہیں تھی بلکہ میری وزارت میں سب میری بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور پھر یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ملازم کو اپنے افسر کے سامنے آنکھیں اٹھاتے نہیں دیکھا تھا۔ عورت کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اپنے افسر تو کجا اپنے باپ' بھائی یا کسی بھی مرد کے سامنے آنکھیں اٹھا سکے۔ اسے تو اپنے بیٹے کے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھانا چاہئیں اور اگر

کوئی مرد اس کے باپ سے بھی زیادہ اہم اور ممتاز ہو تو اس کا بالکل ہی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

امی جان، جیسے جیسے مجھے خیال آتا کہ میں اپنی مردانگی کو کتنی اہمیت دیتا ہوں اور لوگ میری مردانگی کی کتنی عزت کرتے ہیں تو میرا غصہ اور بھی بڑھ جاتا۔ اس نے جو کچھ کیا کوئی عورت ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ امی جان اگر میں اسے ایک پل کے لئے آنکھیں نیچی کرتے دیکھ لیتا یا وہ پلک ہی جھپک لیتی تو میرا غصہ شاید ٹھنڈا پڑ جاتا لیکن امی، وہ تو میرے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی، اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں جیسے وہ میری افسر ہے اور میں اس کا ماتحت ہوں۔ جیسے میں عورت ہوں اور وہ مرد، جیسے میں میں نہیں ہوں اور وہ وہ نہیں ہے۔ مجھے جب بھی خیال آتا کہ میں میں نہیں ہوں اور وہ وہ نہیں ہے تو میرا غصہ اور بھی شدت اختیار کر جاتا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ وہ مجھے یہ احساس دلانے والی کون ہوتی ہے کہ میں میں نہیں ہوں۔ جب ہی یاد آتا کہ میں میں ہی ہوں، اپنی مردانگی اور ساری عزت اور ساری خودداری کے ساتھ، تو غصے سے میرا دماغ اور بھی کھولنے لگتا۔ ہاں امی، مجھے یوں یقین تھا کہ میں میں ہی ہوں۔ اس کا جو بھی مطلب ہو لیکن امی، مجھے جو چیز پاگل کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اسی لمحے مجھے یہ بھی یقین ہو رہا تھا کہ میں میں نہیں ہوں اور یہ کہ اب میں پہلا جیسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ امی جان، آپ اچھی طرح سمجھ لیں گی اور مجھے معاف بھی کر دیں گی کہ اس عورت سے میری نفرت اتنی بڑھی کہ دوسرے دن میرا ٹمپریچر ۴۰ سینٹی گریڈ تک پہنچ گیا اور میں بستر سے ہی نہیں اٹھ سکا۔ میں سر پر برف رکھے گھر میں ہی پڑا رہا۔ اور امی، میرا بخار اس وقت تک کم نہیں ہوا جب تک میں نے اس عورت کو مکمل تباہ کرنے کے لئے وزارتی احکام جاری نہ کر دیئے۔

کیا کہا آپ نے امی؟ جی بالکل نہیں۔ میں اس عورت کو تباہ نہیں کر سکا میرے اندر وہ طاقت ہی نہیں تھی وہ اسی طرح زندہ رہی میں لوگوں کو کہتے سنتا کہ وہ عورت ابھی تک اسی طرح زندہ ہے۔ میں دراصل دوسروں سے نہیں سنتا بلکہ میں خود سن گن لیتا رہتا کہ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے۔ میں ڈرتا بھی تھا کہ کہیں کوئی یہ بات جان نہ جائے۔ میں اس خبر کا خواہش مند رہتا کہ کسی حادثے میں وہ ختم ہو گئی ہے مگر نہیں امی، وہ عورت زندہ تھی۔ وہ صرف دوسری عورتوں کی طرح ہی زندہ نہیں رہی بلکہ امی، ایک مرتبہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ اس کی آنکھیں اسی طرح اوپر دیکھ رہی تھیں اور اگرچہ وہ عورت تھی

اور اس نے ایسی حرکت کی تھی جو کوئی عورت نہیں کر سکتی۔ میں اس سے اس لئے ناراض نہیں تھا کہ وہ سرکاری ملازم تھی اور میں نے کبھی کسی ملازم کو ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا تھا' جی نہیں۔ مجھے تو طیش اس بات کا تھا کہ میں اپنے تمام اختیارات اور طاقت کے باوجود اسے تباہ نہیں کر سکا تھا۔ اس کی موجودگی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا اور میرا دماغ چل گیا تھا۔ میں اپنا آپ اور اپنا وقار بحال کرنا چاہتا تھا۔ مگر امی' وہ موجود رہی اور اس کی موجودگی میرے اپنے وجود کے لئے خطرہ بن گئی۔

جی امی؟ پانچویں یا چھٹے گریڈ کا کوئی ملازم مجھ جیسے بااختیار وزیر کے لئے خطرہ کیسے بن سکتا ہے۔ لیکن میں غصے میں پھٹک رہا تھا۔ مجھے اتنا غصہ تھا کہ زندگی میں میں نے کبھی اتنا غصہ نہیں کیا۔ ایک بات اور بھی ہے امی جان' میں اس سے اس لئے ناراض نہیں تھا کہ میں اسے تباہ نہیں کر سکا۔ اپنے اختیارات کے باوجود اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا' بلکہ امی جان' غصہ اس وجہ سے تھا کہ اس نے وہ کام کیا تھا جو میں نہیں کر سکا تھا۔ ساری زندگی میں اپنے افسر کے سامنے نظریں اونچی نہیں کر سکا چاہے وہ مجھ سے ایک درجہ ہی بڑا ہو۔ امی' میرا غصہ یہ سوچ کر بڑھتا گیا کہ میں ایک مرد ہوں اور وہ دوسری عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے اس کے باوجود میں وہ سب کچھ کیوں نہیں کر سکا جو اس نے کر دیا۔

جی امی' وہ بالکل دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت تھی جیسے آپ۔ ہاں امی جیسے آپ۔ مگر امی میں نے آپ کو کسی مرد کے سامنے اس طرح نظریں اٹھاتے نہیں دیکھا جیسے وہ اٹھاتی تھی۔ اگر میں نے ایک بار بھی آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہوتا تو شاید میں اسے برداشت کر لیتا۔ اگر آپ نے ایک بار بھی والد صاحب کے سامنے اپنی نظریں اٹھالی ہوتیں تو میں بھی آپ کے سامنے نظریں اٹھا لیتا۔ بلکہ میں ان تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا جو صاحبِ اختیار و اقتدار ہیں۔ لیکن امی میں نے آپ کو کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ اگر ایک بار بھی آپ ایسا کرتیں تو میرے لئے بھی ایسا کرنا ممکن ہوتا کیونکہ امی میں نے وہی کیا جو آپ کرتی تھیں۔ امی جان میرے لئے تو آپ ہی قابلِ تقلید مثال تھیں۔ میں آپ ہی کی نقل کیا کرتا تھا۔ میں نے سیکھا کہ بات کہتے ہوئے ہونٹ کیسے ہلائے جائیں جیسے آپ ہونٹ ہلاتی تھیں۔ میں نے آپ کی طرح چلنا سیکھا۔ ہر کام میں نے آپ سے ہی سیکھا۔ اچھا امی آپ بابا کے سامنے نظریں کیوں نہیں اٹھاتی تھیں کہ میں

بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سیکھ لیتا؟ اگر ایک بار بھی ایسا ہو جاتا تو میں بھی ایک بار ان کے خوف سے آزاد ہو جاتا۔ صرف ایک بار اور ملازم کی حیثیت سے میں صاحبِ اقتدار لوگوں سے پھر نہ ڈرتا۔

جی نہیں امی۔ میں آپ کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو آپ سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جس طرح آپ بچپن میں میرے بالوں' میرے سینے اور میری گردن پر ہاتھ پھیرا کرتی تھیں اسی طرح آج بھی اپنے نرم اور شفیق ہاتھ پھیریئے۔ آپ ہی تو ہیں جس کے سامنے میں اپنا دل کھول کر رکھ سکتا ہوں اور جس کے سامنے میں اپنا المیہ بیان کر سکتا ہوں۔ اصل المیہ یہ نہیں ہے کہ میری وزارت چلی گئی بلکہ جس طرح وہ گئی ہے اصل المیہ وہ ہے۔ اگر میری وزارت کسی معقول یا سنگین وجوہ کی بنا پر جاتی تو میرے المیے کی شدت کم ہو جاتی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس کی کوئی ایسی معقول وجہ ہی نہیں ہے کہ کسی کی سمجھ میں آ سکے۔ یا کوئی اس پر اعتبار کر سکے۔ میں بھی شاید اس کے غیر معقول ہونے پر یقین نہ کرتا لیکن ایک دن ایک صبح میں نے اخبار کھولا تو دیکھا کہ جو نئی وزارت تشکیل دی گئی ہے اس میں میرا نام نہیں ہے۔ یکلخت میرا دل بیٹھ گیا۔ ایسا لگا جیسے میرے جسم سے میرا نام گر گیا ہو۔ جوں جوں میں اخبار میں اپنا نام تلاش کرتا جاتا اور وہ مجھے نہ ملتا اسی کے ساتھ میرا یہ احساس بڑھتا جاتا کہ میں تو بے نام ہو گیا۔ میرے جسم کا تو کوئی نام ہی نہیں ہے۔ امی جان' ٹیلی فون جو ہر روز اور ہر لمحے بجتا رہتا تھا اور جس پر میرا نام گونجتا رہتا تھا وہ بھی خاموش ہو گیا تھا' گونگا ہو گیا تھا' بہرا ہو گیا' جیسے وہ بھی مجھے دغا دے گیا ہے' جیسے وہ بھی میرے نام کو مٹی میں ملا رہا ہے۔ امی' مجھے ذلت کے گہرے غار میں گرنے کا اتنا تلخ احساس اپنی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

جی امی' میں اس چیز کے ذائقے سے قطعاً ناواقف تھا جو اس لمحے میں نے کھو دی تھی۔ اور امی جان میرا خیال ہے زندگی یہی ہے۔ جب تک ہم کسی چیز سے محروم نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم اس کا مزہ نہیں جانتے۔ اور امی یہ بذاتِ خود ایک المیہ ہے کیونکہ وقت گزر جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خاموش ٹیلی فون کے سامنے بیٹھا میں یہی سوچ رہا تھا۔ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں میرے گھر والے مجھے اس طرح بیٹھا نہ دیکھ لیں۔ وہ کیا سوچیں گے کہ میں اس طرح کس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے ظاہر ہو کہ میں انتظار نہیں کر

رہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی ہی بجے' کوئی بھی آواز آئے' کسی مرد کی کسی عورت کی' رشتے دار کی یا اجنبی کی' چھوٹی یا بڑی آواز' کسی انسان کی یا جانور کی حتیٰ کہ گدھا رینکنے کی آواز ہی آ جائے۔ بس کوئی آواز آ جائے کہ میری یہ تنہائی ٹوٹے۔ کاش فون کی گھنٹی بجے اور کوئی میرا نام پکارے۔ صرف ایک بار۔

جی نہیں امی جان۔ المیہ یہ نہیں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجی' اور المیہ یہ بھی نہیں تھا کہ اس وقت میں چاہتا تھا کہ گھنٹی بجے بلکہ امی جان' اصل المیہ یہ تھا کہ اس وقت میرے اوپر یہ انکشاف ہوا کہ ٹیلی فون کی جس گھنٹی سے میں نفرت کرتا تھا اور اپنی نفرت کا برملا اظہار بھی کرتا تھا وہ جھوٹ تھا۔ دراصل میں تو ٹیلی فون کی آواز سے محبت کرتا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی تو میرے اندر ایک تھرتھری سی پیدا کر دیتی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت بھی یہ اختیار مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ امی جان' وہ جو مسرت تھی وہ جنسی تسکین' محبت یا کھانے سے بھی زیادہ طاقت ور تھی۔ دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک غیر انسانی مسرت تھی' ایسی مسرت جس سے انسانی سرشت بھی واقف نہیں ہے اور جو غیر جبلی ہے' ایک ایسی جبلت جو تمام احساسات اور تمام جبلتوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ صرف وہ خود ہی اپنی پوری توانائی' پوری عظمت اور پوری طاقت کے ساتھ برقرار رہتی ہے اور اس میں دنیا کی ہر چیز کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ تھکن' کام کی زیادتی' عزت' توہین' ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ میرے جسم کو ہر وقت چاق و چوبند رکھتی تھی حتیٰ کہ سوتے ہوئے بھی میں ہوشیار رہتا تھا۔ انتہائی بھاگ دوڑ کے بعد سخت چلچلاتی دھوپ میں بھی وہ مجھے ہوائی اڈہ پر گھنٹوں انتظار میں کھڑا رکھتی تھی۔ اور جب میں مہمان کا استقبال کرتا تو اسے احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ میں کتنا تھکا ہوا ہوں۔ یہی چیز مجھے اجلاسوں یا استقبالیوں میں کمر سیدھی کیے اور گردن اکڑائے رکھنے پر مجبور کرتی۔ دن رات میں اپنے آپ کو اس طرح تیار رکھتا کہ ایک پل کے اندر میں اپنے سرکاری منصب کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لوں۔ دونوں ٹانگیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر کھڑا ہو جاؤں اور دونوں ہاتھ اپنے پیٹ یا سینے پر باندھ لوں۔ جی امی' یہ عظیم مسرت ایسی ہوتی تھی جو ہر قسم کی تھکان اور ہر طرح کو کوشش کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لئے جاتی تھی حتیٰ کہ اگر وہ چاہتی تو وہ اپنے آپ کو اور مجھے بھی اس میں بہا کر لے جاتی۔

کیا فرمایا آپ نے امی؟ جی ہاں' میں نے یہ خوشی' یا مسرت ایک معمولی شے کے

MashalBooks.com

لئے قربان کر دی اور اس کے مقابلے میں کونسی چیز ایسی تھی جو معمولی نہیں تھی ۔لیکن امی جان' سچی بات یہ ہے کہ وہ شے معمولی بھی نہیں تھی ۔ وہ کوئی سادہ اور عام سی شے نہیں تھی ۔ بلکہ وہ تو انتہائی نازک اور انتہائی اہم واقعہ تھا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ تو نہایت سنگین معاملہ تھا جس سے مجھے نبٹنا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے موت ۔ جیسے موت سے واسطہ پڑ جائے ۔ امی جان' ایک وقت تھا جب میں سوچا کرتا تھا کہ میں تو موت کا مقابلہ بھی کر سکتا ہوں ۔لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہوا' میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے ۔ میں حسبِ معمول چاق و چوبند دل و دماغ کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرا دماغ اور میرے اعصاب اس وقت ایک مجسم ریڈار بنے ہوئے تھے اور اتنے حساس تھے کہ ایک ایک حرکت ریکارڈ کر سکتے تھے ۔ میں معمول کے مطابق کرسی پر بیٹھا تھا مجھے یقین تھا کہ میں نارمل ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی جانتا تھا کہ میں نارمل نہیں ہوں ۔اس حقیقت کے باوجود کہ میں پوری طرح چوکس تھا میں اپنے آپ کو چوکس رکھنے کی صلاحیت سے محروم تھا اور زندگی میں پہلی بار محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر اپنے خیالات کو قابو میں رکھنے یا انہیں کسی ایک جگہ مرتکز کرنے کی قدرت نہیں رہی ہے ۔ میرے دماغ نے خود بخود کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اس چیز کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا جسے میں اپنے دماغ پر مسلط کرنا چاہتا تھا اور اگر میٹنگ کے دوران ایسی کیفیت کسی بھی سرکاری ملازم کی ہو جائے تو اس کی خیر نہیں ہے میں تو پھر وزیر تھا۔امی جان' پریشانی یہ نہیں تھی کہ میرا دماغ میرے قابو میں نہیں تھا کیونکہ اگر کسی اہم معاملے کے سلسلے میں ایسا ہوتا جو میں سالانہ رپورٹ کے سلسلے میں پیش کرنے والا تھا یا سالانہ بجٹ کے سلسلے میں جس پر مجھے سوالات کرنا تھے تو میں اتنا پریشان نہ ہوتا۔ لیکن المیہ تو یہ تھا کہ میرا دماغ ایک ایسی معمولی اور غیر اہم چیز میں الجھ گیا تھا جو میرے رتبہ کے انسان کے لئے خاص طور سے اس میٹنگ میں نہایت ہی گھٹیا بات تھی ۔

نہیں امی' میں کسی شخص کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت میں نارمل نہیں ہوں ۔ اس لئے میں کرسی پر کیسے بیٹھوں کہ بالکل نارمل نظر آؤں ۔ اس وقت یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ کرسی پر میں ہی بیٹھا ہوں یا کوئی اور؟ اور ان لوگوں میں سے میں کونسا ہوں ۔امی جان' مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں اسے سمجھ نہیں سکا تھا بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ میری ساری پریشانی کا سبب ایک جونیئر سرکاری ملازم تھی ۔لعنت ہو اس منحوس وقت پر جب میں نے اس عورت کا دیکھا تھا۔ اس

کے بعد پھر وہ میرے دماغ سے نکلی ہی نہیں۔ ہر وقت میرے خیالوں پر وہی چھائی رہی۔ اگر وہ ایک عورت کی شکل میں میرے دماغ پر چھائی ہوتی تو مجھے اس سے کچھ سکون اور اطمینان بھی ہوسکتا تھا۔ آخر میں مرد ہوں اور مرد کسی بھی حیثیت اور رتبے کا ہو عورت اس کے دل و دماغ پر سوار ہوسکتی ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے امی جان' کہ اس وقت میں اس کے بارے میں عورت کی حیثیت سے سوچتا ہی نہیں تھا کیونکہ میرے نزدیک وہ عورت ہی نہیں تھا۔ شاید میری زندگی میں وہ پہلی عورت تھی جس سے مل کر میں نے ایک بار بھی عورت سمجھ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میرے دماغ کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی اور جس نے مجھ سے میری قوت فیصلہ بھی چھین لی تھی اور یہ تھی کہ وہ ایک انتہائی جونیئر سرکاری ملازم تھی اور اس نے ایک نہایت ہی غیر معمولی حرکت کی تھی۔ اس نے ہر اس روایت اور ہر اس دستور اور قاعدے قانون کو توڑ دیا تھا جس میں ہم نے آنکھ کھولی ہے اور جن کا احترام ہم اس وقت سے کر رہے ہیں جب سے پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ جب سے ہم انسان بنے ہیں یہ دستور اور روایات ہمارے ساتھ ہیں۔ امی جان' المیہ یہ نہیں ہے کہ اس نے ایسا کام کیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا یا جسے میں نے بھی نہیں کیا تھا بلکہ المیہ یہ ہے کہ اس نے جب سے وہ کام کیا اس وقت سے میں اپنے آپ میں نہیں رہا۔ میری کرسی پر جو بیٹھا ہے وہ میں نہیں ہوں۔ وہ کوئی اور ہے جسے میں نہیں جانتا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دونوں میں سے میں کونسا ہوں؟ ہاں امی جان' یہی وہ سوال ہے جو میرے دل' میرے دماغ اور میرے تمام حواس پر چھایا ہوا ہے۔

میں نے امی جان اسے دماغ سے نکالنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے اسے دماغ سے نکالنے کی اتنی کوشش کی کہ میرا بایاں ہاتھ خود بخود ایسے کام کرنے لگا۔ جیسے وہ اس خیال کو دماغ سے نوچ پھینکنا چاہتا ہو۔ اور میرا دایاں ہاتھ حسبِ معمول کاغذ پر قلم رکھے کسی بھی اشارہ کا منتظر رہتا۔ اس وقت میرے بائیں ہاتھ کو میری گود میں پڑا ہونا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوسکتا تھا کہ میں نے اپنے چہرے پر سے کسی ضدی مکھی کو اڑانے کے لئے بایاں ہاتھ ہلایا ہے لیکن چونکہ جس ہال میں میٹنگ ہو رہی تھی وہ ملک کا ہی نہیں دنیا کا سب سے صاف ستھرا ہال تھا جہاں کسی مکھی کا گزر نہیں ہوسکتا تھا اس لئے میرے بائیں ہاتھ کی یہ حرکت ہر ایک کو ابنارمل لگی ہوگی۔ چونکہ میری یہ حرکت غیر معمولی تھی اس لئے سب کی توجہ میری طرف ہوگئی۔ حالانکہ میں میٹنگ میں اپنے آپ کو

اس طرح الگ تھلگ رکھتا اور ایسا لئے دیئے رہتا کہ میٹنگ کے آخر تک کسی کو میری موجودگی کا احساس نہ ہوتا اور میں سوالوں سے بھی بچ جاتا۔

کیا کہا آپ نے؟ نہیں امی جان، میں سوالوں سے نہیں ڈرتا تھا۔ میں اس بات سے نہیں ڈرتا تھا کہ سوالوں کے صحیح جواب مجھے نہیں آتے۔ میں تو ہر جواب جانتا تھا۔ ہر سوال کا جواب میری زبان کی نوک پر تھا۔ جیسے دو اور دو چار۔ مشکل یہ تھی کہ میں صحیح جواب نہ دینے سے نہیں ڈر رہا تھا بلکہ میں صحیح جواب دینے سے ڈر رہا تھا۔

جی امی جان، اصل المیہ یہ تھا جس سے اس روز مجھے سابقہ پڑا۔ میں نہیں جانتا یہ کیسے ہوا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ میں نے ہی کہا یا کسی اور شخص نے جو میری کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ اپنی کرسی پر میں ہی بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے بائیں ہاتھ کی بار بار کی حرکت نے اس کی توجہ میری طرف مبذول کرا دی تھی جس نے میرے والد کی نظروں سے مجھے گھورا۔ ایسے جیسے بچپن میں ابا جان غلط کام پر مجھے گھورا کرتے تھے۔ اس کی نظر جب مجھ پر پڑی تو میں نے اس طرح آگے پیچھے ہونے کی کوشش کی جیسے میں کلاس روم میں استاد کی نظروں سے بچنے کے لئے کیا کرتا تھا تاکہ ان کی نظریں میرے بجائے آگے والے یا میرے پیچھے والے لڑکے پر پڑیں۔ لیکن اس روز میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہو سکتا ہے میں نے بروقت اس کی نظریں نہ دیکھی ہوں۔ اور وہ اچانک میرے اوپر آ گئی ہوں یا پھر اس وقت میں پوری طرح ہوش میں نہ ہوں۔ ممکن ہے اس وقت مجھے بخار ہو یا پھر کوئی اور وجہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اپنی کرسی میں بالکل حرکت نہیں کر سکا اور اس شخص کی نظروں کا سارا بوجھ، موت کے بوجھ کی طرح میرے اوپر آ پڑا۔ اس نے سوال کیا تو میرا منہ کسی ایسے شخص کی طرح خود بخود کھل گیا جو سوچے سمجھے بغیر جلدی میں جواب دینا چاہتا ہو۔ اور چونکہ وہ بلا سوچے سمجھے جواب تھا اس لئے وہ بہت ہی آسان اور بہت ہی واضح جواب تھا۔

نہیں امی جان، وہ واضح اور صاف جواب صحیح جواب نہیں تھا۔ صحیح جواب وہی نہیں ہوتا جس کی توقع کی جاتی ہے۔ صحیح جواب وہ نہیں ہوتا جو طلب کیا جاتا ہے۔ امی جان، سیاست کی یہی ابجد ہے۔ میں نے شروع میں ہی آپ کو بتایا ہے۔ سیاست میں ہم سب سے پہلا سبق یہی سیکھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا میں اس وقت یہ سبق کیسے بھول گیا۔ مگر اس وقت میں وہ بھول گیا۔ اس بھول نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی امی جان، میں بتا نہیں سکتا۔ یہ

اتنا بڑا صدمہ تھا کہ میں دوسرے تمام صدمے بھول گیا اور ایسا سکون سا ہوا جیسے مجھے خوشی ہوئی ہو۔ امی جان، نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینے سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ ایسا بوجھ جو میرے سینے اور پیٹ پر رکھے ہاتھوں سے بھی زیادہ بھاری ہے جو میری کرسی حتیٰ کہ میرے اپنے جسم اور اس کرہ ارض سے بھی زیادہ بھاری ہے جو میرے دل ودماغ پر سوار ہے۔

کیا فرمایا آپ نے امی؟ جی ہاں، میں اب سکون محسوس کر رہا ہوں اور سکون بھی کیسا عجیب وغریب۔ اس وقت جب میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں تو آخری دنوں میں یہ تسکین اور یہ اطمینان کیسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ لیکن امی جان المیہ یہ ہے کہ اس وقت جب میں سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں اس وقت بھی ٹیلی فون میرے سرھانے رکھا اور میں انتظار کر رہا ہوں کہ کس وقت اس کی گھنٹی بجتی ہے۔ صرف ایک گھنٹی۔ صرف ایک بار۔ صرف ایک مرتبہ اس کی آواز اور سننا چاہتا ہوں۔ وہی آواز جو میرے کانوں میں سرگوشی کرے۔ ''جناب والا، وزیر محترم......'' میں یہ الفاظ سننے کا کتنا خواہش مند ہوں۔ امی جان میں مرنے سے پہلے صرف ایک بار یہ الفاظ پھر سننا چاہتا ہوں۔

MashalBooks.com

جنت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں

اس نے ہتھیلی سے اپنے نیچے زمین چھونے کی کوشش مگر وہاں مٹی یا زمین تھی ہی نہیں۔ اس نے اوپر دیکھا' گردن آگے کو کر کے روشنی کی طرف نظر کی۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور دبلا پتلا محسوس ہو رہا تھا۔ جلد اتنی سانولی تھی کہ سیاہ معلوم ہوتی تھی۔

وہ اندھیرے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکی اور اس کے ہاتھ میں کوئی آئینہ بھی نہیں تھا۔ لیکن سفید روشنی اس کے ہاتھ کی پشت پر پڑ رہی تھی اس لئے وہ ہاتھ بھی سفید ہو گیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ان میں روشنی بھر گئی۔ اس طرح پھیلی ہوئی اور روشنی سے بھری آنکھیں بالکل حور کی آنکھوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

حیرت زدہ ہو کر اس نے اپنا سر پہلے دائیں جانب گھمایا اور پھر بائیں جانب۔ یہاں سے وہاں تک اس کے سر پر ہرے بھرے درخت سایہ کئے ہوئے تھے اور وہ ٹھنڈے سائے میں بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا جس کا پانی چاندی کی طرح چمک دار تھا اور اس میں موتیوں کی طرح سفید قطرے جمع تھے۔ اس کے سامنے لذیذ کھانوں سے بھری قاب رکھی تھی۔

اس نے پلکیں پوری طرح کھول کر اپنی آنکھوں کو پھیلا دیا۔ مگر وہ منظر ویسا کا ویسا ہی تھا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس میں۔ اس نے اپنی عبا کو چھوا۔ وہ ریشم کی طرح نرم و ملائم تھی۔ اس کی عبا کے گلے سے مشک اور بہترین عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس کا سر اور آنکھیں ایک ہی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے

MashalBooks.com

پلکیں جھپکیں تو یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا جیسے پہلے غائب ہو گیا تھا۔
لیکن کنکھیوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ ہرا بھرا سا یہ دور تک پھیلا ہوا ہے اور سر سبز درخت یہاں سے وہاں تک کھڑے ہیں جن کی جڑوں میں سے سرخ اینٹوں کا مکان اسے نظر آ رہا ہے۔ وہ مکان کسی محل کی طرح ہے جس کا زینہ سنگِ مرمر کا ہے اور اس کی سیڑھیاں خواب گاہ تک جاتی ہیں۔
وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اسے یقین بھی آ رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ اسے ایسے نوجوانوں سے زیادہ اور کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوتی تھی جو متواتر آتے تھے اور جن میں وہ دیکھتی تھی کہ وہ مرگئی ہے اور جنت میں ہے۔ ایسے خواب اسے ناممکن لگتے تھے کیونکہ اسے موت ناممکن لگتی تھی۔ اور یہ بھی ناممکن لگتا تھا کہ موت کے بعد وہ پھر زندہ ہو جائے گی اور پھر جنت میں جانا تو اس کے لئے بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔
اس نے اپنی گردن اور سیدھی کی اور ترچھی نظر کر کے روشنی کو دیکھا۔ منظر ویسا ہی تھا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سرخ اینٹوں والا مکان بھی ویسا ہی تھا جیسے عمدہ (گاؤں کا مکھیا) کا مکان' سیڑھیاں بھی اسی طرح خواب گاہ کی طرف جا رہی تھیں' کمرہ بھی روشنی میں نہا رہا تھا' کھڑکیوں سے دور افق تک نظر آ رہا تھا' ایک بہت بڑی مسہری تھی جس کے چاروں پایوں پر چھپر کھٹ والے چار ڈنڈے کھڑے تھے اور ان پر ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔
یہ سب کچھ اتنا حقیقی تھا کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھی رہی۔ اسے یقین کرتے ڈر لگ رہا تھا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ مر جائے اور پھر اتنی جلدی زندہ ہو کر جنت میں چلی جائے؟
اسے جس بات پر مکمل یقین نہیں آ رہا تھا وہ یہ تھی کہ یہ سب اتنی جلدی ہو گیا تھا۔ ٹھیک ہے' موت بہت آسان ہے۔ ہر شخص ہی مرتا ہے اور اس کی موت تو سب سے زیادہ آسان تھی کیونکہ وہ پہلے ہی موت اور زندگی کے بیچ لٹکتی رہتی تھی بلکہ موت کے زیادہ قریب رہتی تھی۔ جس ماں نے اسے جنا تھا وہ اس کے اوپر لیٹی رہی تھی اور وہ اس کے بوجھ سے مر گئی تھی یا پھر اس کے باپ نے ماں کے سر پر کدال مارا تھا جس سے وہ مرگئی تھی۔ ہر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اور بھی بخار ہو جاتا یہاں تک کہ آٹھ بچے ہو گئے۔ پھر اس کے شوہر نے اس کے پیٹ میں لات ماری اور پھر سورج کی کرنیں اس کی کھوپڑی کی کرچیوں میں

سمٹتی چلی گئیں۔

اس کے لئے زندگی مشکل تھی اور موت آسان۔ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانا اس سے بھی آسان لگتا تھا کیونکہ کوئی بھی ایسا نہیں جو مرنے کے بعد پھر نہ اٹھایا گیا ہو۔ ہر شخص مرنے کے بعد پھر اٹھتا ہے۔ صرف جانور ہی ایسے ہیں جو ہمیشہ کے لئے مر جاتے ہیں۔

اس کا جنت میں جانا ناممکن تھا۔ لیکن اگر وہ جنت میں نہیں جائے گی تو اور کون جائے گا؟ اپنی ساری زندگی میں اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے خدا یا اس کے رسول ﷺ ناراض ہوں۔ وہ اپنے گھنگریالے بالوں میں اونی موباف ڈال کر چوٹی بناتی اور چوٹی کو سفید رومال سے باندھتی۔ پھر اوپر سے کالی چادر اوڑھتی۔ اس کے جلابیہ میں سے سوائے ایڑیوں کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ پیدائش سے موت تک اس نے ایک ہی لفظ سیکھا تھا ''جی' بہت اچھا۔''

سورج نکلنے سے پہلے جب اس کی ماں اسے مار کر اٹھاتی کہ اپلے تھاپنے کے لئے گوبرا اٹھا لائے تو اس وقت سے شام تک وہ ''اچھا'' ہی کہتی رہتی۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی نہیں دیکھا۔ اسے بخار ہوتا اور اس کے باوجود وہ اپنا جی خوش کرتا تب بھی وہ جی بہت اچھا ہی کہتی۔

اس نے اپنی زندگی میں کبھی چوری نہیں کی اور نہ کبھی جھوٹ بولا۔ وہ مرتے مر جاتی مگر کسی اور کا کھانا نہ چھوتی چاہے وہ کھانا اس کے باپ یا شوہر کا ہی کیوں نہ ہوتا۔ اس کی ماں روٹیوں پر سالن رکھ کر اور اسے لپیٹ کر اس کے ہاتھ کھیت پر باپ کے لئے بھیجتی۔ وہ اپنے سر پر رکھ کر کھانا لے جاتی۔ بعد میں اس کے شوہر کی ماں بھی اسی طرح اپنے بیٹے کے لئے اس کے ہاتھ کھیت پر کھانا بھیجتی۔ اس کا دل بہت للچاتا۔ اس کے جی میں آتا کہ وہ راستے میں کسی پیڑ کے سائے میں بیٹھ جائے اور پوٹلی کھول کر دیکھے۔ لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کر سکی۔ جب بھی اس کے دل میں ایسا خیال آتا وہ فوراً خدا سے دعا مانگتی کہ اے اللہ مجھے شیطان سے اپنی پناہ میں رکھ۔ راستے میں جب بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ سڑک کے کنارے سے نرم نرم گھاس اکھیڑتی اور اسے چبانے لگتی۔ پھر نہر کے کنارے بیٹھ کے چلو میں پانی لیتی اور اسے حلق سے نیچے اتار لیتی۔ وہ اس وقت تک پانی پیتی رہتی جب تک اس کی پیاس نہ بجھ جاتی۔ پھر وہ جلابیہ کی آستین سے منہ پونچھتی اور منہ ہی منہ میں کہتی

الحمداللہ وہ تین بار الحمداللہ کہتی اور چل دیتی۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی اور خدا کا شکرادا کرتی۔ وہ بخار میں پھنک رہی ہوتی اوراس کا خون آگ کی طرح اس کی رگوں میں پھر رہا ہوتا اس وقت بھی وہ خدا کا شکرادا کرتی۔ وہ رمضان میں پورے روزے رکھتی' کھانا پکانے کے دن کھانا پکاتی' فصل کی کٹائی پر وہ کھیت کاٹتی' متبرک دنوں میں وہ ماتمی پوشاک پہنتی اور قبرستان جاتی۔

اس نے کبھی اپنے باپ' بھائی یا شوہر کے سامنے غصہ نہیں کیا۔ اگر اس کا شوہر اسے مار مار کرادھموا کر دیتا تو اپنے باپ کے گھر چلی جاتی۔ لیکن اس کا باپ اسے پھر واپس بھیج دیتا۔ اگر وہ اس کے بعد بھی میکے آتی تو اس کا باپ اسے خوب مارتا اور سسرال بھیج دیتا۔ اس کا شوہر اگر اسے پھر مارتا تو وہ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس جاتی۔ اور اس کی ماں اسے سمجھاتی۔ ''زینب واپس چلی جا آخرت میں تو سیدھی جنت میں جائے گی۔''

پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی ماں سے بار بار جنت کا لفظ سنا تھا۔ اپنے ہوش میں پہلی بار جب اس نے یہ لفظ سنا اس وقت وہ چلچلاتی دھوپ میں سر پر گوبر کی ٹوکری رکھے گھر آرہی تھی۔ تپتی زمین پر اس کے ننگے پاؤں جل رہے تھے۔ اس کے دماغ میں جنت کی جو تصویر آئی وہ ایسے گھنے سائے والی جگہ کی تھی۔ اس کے سر پر گوبر کی ٹوکری نہیں تھی اور اس کے پیروں میں پڑوسی لڑکے حسنین کی طرح جوتے تھے۔ وہ زمین پر اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔ حسنین کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ دونوں گھنے سائے میں بیٹھے تھے۔

اسے حسنین کا خیال آیا تو جنت میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھنے سے زیادہ اس کا تصور اسے اور آگے نہیں لے گیا۔ لیکن اس کی ماں اسے ڈانٹتی تھی اور کہتی تھی کہ حسنین یا ہمسایہ کا کوئی بھی لڑکا جنت میں اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اپنے شوہر کے سوا اور کسی پر عورت کو نظر نہیں ڈالنا چاہئے۔ مرنے کے بعد شوہر ہی اپنی بیوی کے ساتھ ہوگا۔ اگر سوتے یا جاگتے میں اس کے دل میں شیطانی خیالات آئیں اور اس نے کسی اور مرد کے بارے میں سوچا تو وہ کبھی جنت کا منہ نہیں دیکھے گی۔

اس کے بعد سے جب بھی وہ سونے لیٹتی ہمیشہ اپنے شوہر کو ہی دیکھتی۔ وہ دیکھتی کہ جنت میں اس کا شوہر اسے مارتا پیٹتا نہیں' اس کے سر پر گوبر کا ٹوکرا نہیں ہے' اور اس کے ننگے پاؤں تپتی ریت میں نہیں جل رہے ہیں۔ اس کا مٹی کا جھونپڑا سرخ اینٹوں والا بڑا مکان بن گیا ہے۔ مکان کے اندر بہت بڑا زینہ ہے۔ ایک بہت لمبی چوڑی مسہری پر پڑی

ہے جس پر اس کا شوہر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے لیٹا ہے۔

جنت میں اپنے میاں کا ہاتھ پکڑنے سے آگے اس کا خیال نہیں جاتا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے کبھی اپنے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس شوہر سے اسکے آٹھ بیٹے بیٹیاں تھیں لیکن وہ سب میاں کا ہاتھ پکڑے بغیر ہی اس کی کوکھ میں داخل ہوئے تھے۔ گرمیوں میں وہ کھیت میں سوتا اور سردیوں میں کھلیان میں یا پھر انگیٹھی کے اوپر سوتا۔ ساری رات وہ چت سوتا۔ ایک بار بھی کروٹ نہ لیتا۔ جب وہ کروٹ لیتا تو گیدڑ کی آواز میں اسے بلاتا۔ اور ابھی وہ ''جی'' بھی نہ کہتی کہ وہ اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیتا اور اس پر سوار ہو جاتا۔ اگر وہ کوئی آواز نکالتی یا لمبا سانس لیتی تو وہ اس کے ٹھوکر مارتا۔ اگر وہ آواز نہ نکالتی تب بھی اس کے ٹھوکریں پڑنا شروع ہو جاتیں۔ یہاں تک کہ وہ لمبے سانس لینا شروع کر دیتی۔ شوہر کے ہاتھ نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور نہ کبھی اس کے بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔

اس نے صرف فاختاؤں کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھا تھا۔ کبھی کسی انسانی جوڑے کو بغل گیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دیوار پر چڑھتی تو اسے فاختائیں ایک دوسرے کے ساتھ چونچ ملاتی نظر آتیں۔ یا وہ جانوروں کے باڑے میں جاتی تو گائے اور بیل اس طرح دکھائی دیتے۔ لیکن ایسے وقت اس کی ماں لاٹھی سے انہیں مارتی اور برا بھلا سناتی۔

ساری عمر اس نے اپنے سر سے کالی چادر نہیں اتاری تھی اور نہ وہ سفید رومال اتارا تھا جس سے اس کے بال بندھے رہتے تھے۔ البتہ کہیں موت ہو جاتی تو وہ اتارتی۔ اس کا شوہر مرا تو اس نے کالی چادر سر پر باندھ لی اور تین برس تک ماتمی پوشاک پہنے رہی۔ ایک آدمی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بچے رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ماں نے غصے میں تھوک دیا اور اپنی چادر کو سر پر کھینچ کر بڑبڑائی۔ ''بے شرم کہیں کا...... کوئی عورت شادی کے لئے اپنے بچے چھوڑ سکتی ہے۔؟'' تین برس گزر گئے۔ پھر ایک آدمی بچوں کے ساتھ اس سے شادی کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ اب اس کی ماں نے فیل مچائے۔ ''دنیا میں عورت کو اور کیا چاہئے ماشاءاللہ بچے ہیں شوہر مر چکا ہے تو کیا ہوا۔''

ایک دن اس کا جی چاہا تھا کہ کالی چادر اتار دے اور سفید رومال ہی سر پر رکھے۔ مگر پھر خیال آیا کہ لوگ کیا کہیں گے یہی کہ اپنے شوہر کو بھول گئی۔ اس لئے اس نے کالی چادر

اپنے سر سے ہی باندھے رکھی اور جب تک مر نہ گئی اسی طرح ماتمی پوشاک پہنے رہی۔

اب اس نے دیکھا کہ وہ تابوت کے اندر ہے اور ریشمی کفن میں لپٹی ہوئی ہے۔ جنازہ کے ساتھ جانے والوں میں اس نے اپنی ماں کے بین کرنے کی آواز سنی جیسے گیدڑ رو رہے ہوں یا ریل گاڑی سیٹی بجا رہی ہو۔ ''زینب' جنت میں تو اپنے میاں کے پاس جا رہی ہے۔''

پھر شور بند ہو گیا۔ اب وہ صرف خاموشی کے سانس سن رہی تھی اور اسے مٹی کے سوا اور کوئی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ اس کے نیچے کی زمین ریشم کی طرح ملائم تھی۔ اس نے سوچا یہ کفن ہے۔ اپنے سر پر اس نے دو غصیلی آوازیں سنیں جیسے دو آدمی جھگڑ رہے ہوں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر لڑ رہے ہیں۔ پھر اس نے سنا کہ ایک آواز نے اس کا نام لیا اور کہا کہ اسے قبر کا عذاب سہے بغیر ہی سیدھا جنت میں جانا چاہئے۔ مگر دوسری آواز نہیں مانتی تھی۔ وہ ضد کر رہی تھی کہ اسے قبر کا عذاب ضرور ملنا چاہئے وہ سیدھی جنت نہیں جا سکتی۔ ہر شخص کے لئے قبر کا عذاب ضروری ہے۔ اس پر پہلی آواز نے پھر اصرار کیا کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا جس کا اسے عذاب دیا جائے۔ وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی وفادار رہی ہے۔ دوسری آواز نے دلیل پیش کی کہ سفید رومال کے اندر سے اس کے بال نظر آتے تھے اور اس نے مہندی سے اپنے بال لال کئے تھے اور اس کی مہندی لگی ایڑی اس کے جلابیہ میں سے دکھائی دیتی تھی۔

پہلی آواز نے جواب دیا کہ اس کے بال کبھی نظر نہیں آئے تم نے جو دیکھا وہ موباف تھا اس کا جلابیہ تو بہت لمبا اور کھلا ہوتا تھا۔ وہ موٹے کپڑے کا ہوتا تھا اور اس کے اندر وہ بہت ہی موٹی قمیض پہنتی تھی۔ اور لمبا پاجامہ بھی پہنتی تھی۔ آج تک کسی نے اس کی لال ایڑی نہیں دیکھی۔

لیکن اس آواز کا ساتھی مستقل کہتا رہا کہ اس کی لال ایڑی سے گاؤں والوں کا دل خراب ہوتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جھگڑا ساری رات چلا۔ وہ ایسے ہی لیٹی رہی۔ اس نے اپنی ناک اور منہ نیچے کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ مر گئی ہے۔ اگر یہ پتہ چل گیا کہ وہ مری نہیں ہے تو قبر کا عذاب اور بھی لمبا ہو جائے گا۔ موت ہی اسے اس عذاب سے بچا سکتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کس بات پر اتفاق ہوا؟ اس کا اسے علم نہیں ہو سکا۔ انسان ہو یا روح مرنے کے بعد قبر میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا کسی کو پتہ تھوڑا ہی چلتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی بات سن بھی لے تو اسے ظاہر یہی کرنا چاہئے کہ اس نے کچھ نہیں

سنا اور نہ کچھ سمجھا۔ سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں جھگڑا کرنے والے منکر نکیر یا کسی قسم کے فرشتے بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر وہ فرشتے ہوتے تو اتنی سی بات بھی نہ جانتے جو سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس نے عمدہ کی بیٹیوں کی طرح اپنے پیروں میں کبھی مہندی نہیں لگائی بلکہ اس کا منہ اور ہتھیلیاں تو کالی مٹی کی طرح ہمیشہ پھٹی رہتی تھیں۔

ان دونوں آوازوں کا جھگڑا صبح ہونے سے پہلے ختم ہو گیا اور اسے عذاب سے گزرنا نہیں پڑا۔ وہ آوازیں بند ہوئیں تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے اپنا جسم ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا اور وہ ہوا میں اڑنے لگے۔ وہ جیسے آسمان میں اڑتی رہی، پھر اس کا جسم نیچے اترا اور وہ نرم اور مرطوب مٹی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا ہاں، یہ جنت ہے۔

ڈرتے ڈرتے اس نے سر اٹھایا تو سامنے دور تک نخلستان تھا۔ اونچے اونچے سایہ دار درخت تھے اور ان کے نیچے خوب گھنا سایہ۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ درخت اس کے قریب تک پھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ مہکتی ہوئی تازہ ہوا اس کے نتھنوں سے ہوتی اس کے سینے میں بھر گئی ہے اور مٹی دھول اور گوبر کی ساری بدبو اس کے بدن سے نکل گئی ہے۔

وہ ہولے سے اٹھی اور کھڑی ہو گئی۔ سامنے درختوں کے جھنڈ میں اسے سرخ اینٹوں کا محل نظر آ رہا تھا محل کا دروازہ اس کے سامنے تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی اس کے اندر داخل ہو گئی۔ اسی طرح ہانپتی وہ اونچا زینہ چڑھ گئی۔ خواب گاہ کے باہر وہ ایک پل کے لئے ٹھہری اس نے اپنی سانسیں درست کیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

دروازہ بند تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھایا اور کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا۔ سامنے مسہری کے چاروں پایوں پر چار چوب کھڑے تھے جن پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ اس نے دیکھا مسہری پر اس کا شوہر دولہا بنا بیٹھا ہے اور اس کے دائیں بائیں دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ دونوں عورتوں نے ایسے شفاف لباس پہن رکھے ہیں کہ ان کے اندر سے ان کا گورا گورا بدن جھلک رہا ہے۔ ان کی آنکھیں ایسی روشن ہیں جیسے حوروں کی آنکھیں۔ اس کے شوہر کا چہرہ اسکی جانب نہیں تھا اس لئے شوہر نے اسے نہیں دیکھا۔ ابھی تک اس کا ہاتھ دروازہ پر تھا اس نے کواڑ اپنی طرف کھینچا اور اسے بند کر دیا۔ پھر وہ زمین پر اتر آئی ہاں اس جیسی عورت کے لئے جنت میں بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

بند کمرے میں

پہلی چیز جو اس نے محسوس کی وہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں پھر بھی روشنی تکلیف دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے اور ننگی گردن سے ٹکرائی اور سرکتی ہوئی اس کے سینے اور پیٹ تک پہنچی اور پھر اور نیچے بہتے زخم پر کاری ضرب کی طرح لگی۔ اس نے روشنی سے بچنے کے لئے ایک ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اپنی گردن پر رکھا اور دونوں رانوں کو زور سے دبا لیا۔ اچانک ٹیس سی اٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ اس درد کو دبانے کے لئے زور سے بھنچے ہوئے تھے جو آنکھوں، چھاتیوں، بغلوں اور پیڑو میں سوئی کی تیز نوک کی طرح چبھ رہا تھا۔ اتنی دیر تک کھڑے کھڑے سوتے ہوئے اور سوتے میں کھڑے ہوئے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اب اس کا جسم کس پوزیشن میں ہے۔ وہ عمودی طور پر کھڑی ہے یا افقی طور پر لیٹی ہے۔ وہ ہوا میں معلق ہے یا پانی میں سر کے بل کھڑی ہے۔

جب اسے بٹھایا گیا اور اس نے ہاتھ سے بیٹھنے والی نشست کو محسوس کر لیا تو اس کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہوا اور وہ انسانی جون میں واپس آ گئی۔ اس کے اندر خوشی کی ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''ہاں اب معلوم ہوا بیٹھنے میں کتنی راحت ہے۔''

روشنی اب بھی بہت تیز تھی اور اب بھی وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے آوازوں کی بھن بھن محسوس کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھایا اور آہستہ آہستہ انہیں کھولنا شروع کیا۔ اونچے سے چبوترے پر انسانوں کی

MashalBooks.com

دھندلی دھندلی شکلیں چلتی پھرتی نظر آئیں۔ وہ اچانک ڈر گئی۔ انسانی شکلیں اسے زیادہ ڈراتی تھیں۔ وہ لمبے تیز اور پھرتیلے جسم جن کی ٹانگیں پتلونوں میں اور پاؤں جوتوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ ہر کام اندھیرے میں نہایت تیزی اور پھرتی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ رو نہیں سکی تھی۔ وہ چیخ نہیں سکی تھی۔ اس کی زبان، اس کی آنکھیں، اس کا منہ، اس کی ناک اس کے جسم کا ہر حصہ جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ اس کا جسم جیسے اس کا اپنا جسم نہیں تھا بلکہ کسی بچھڑے کا جسم تھا جسے بھاری جوتے سے ٹھوکریں ماری گئی تھیں۔ ایک کھردری لاٹھی جیسے اس کے اندر اترتی چلی گئی ہو اور اس نے اسے زخموں سے چور چور کر دیا ہو۔ اس کے بعد اسے ٹھوکر مار کر ایک کونے میں پھینک دیا گیا جہاں وہ دوسرے دن تک سکڑی پڑی رہی۔ تیسرے دن بھی اس کے ہوش و حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ وہ کسی چھوٹے سے جانور کی طرح وہاں پڑی رہی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھی۔

اس کی آنکھوں نے اب اوپر بیٹھے انسانی جسموں کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ وہ اونچی جگہ پر بیٹھے تھے ہر جسم پر ایک سر تھا۔ اور ہر سر ایسا چمکیلا کہ روشنی میں بندر کے کولہوں کی طرح لال لال نظر آ رہا تھا۔ یہ سب مرد ہوں گے؟ کیونکہ عورت کا سر کتنا ہی سکڑ جائے وہ بندر کے کولہوں کی طرح نظر نہیں آ سکتا۔ اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بیچ میں ایک موٹا سا آدمی بیٹھا تھا جس نے کالی عبا پہن رکھی تھی، اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا سا تھا۔ اسے گاؤں کا جادوگر یاد آ گیا جو اس کی اور تمام بچوں کی نظر بندی کر دیتا تھا اور اپنے عصا کو سانپ بنا دیتا تھا یا عصا سے آگ نکالتا تھا۔ ہتھوڑا ناگ کی طرح پھنکارا اور اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ''عدالت'' اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''یہ جج ہوگا'' وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی جج کو دیکھ رہی تھی بلکہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ عدالت میں آئی تھی۔ بچپن میں عدالت کا لفظ پہلی بار اس نے اپنی خالہ سے سنا تھا۔ وہ ماں سے کہہ رہی تھیں کہ جج نے ان کی بات کا اعتبار نہیں کیا اور کہا کہ وہ جگہ کھول کر دکھاؤ جہاں تمہیں مارا گیا ہے۔ ''میں نے کہا میں کسی غیر مرد کے سامنے ننگی نہیں ہو سکتی۔'' چنانچہ اس نے میرا استغاثہ خارج کر دیا اور مجھے شوہر کے پاس واپس جانے کا حکم دیا۔ اس کی خالہ بہت روئی تھیں۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جج نے اس سے ننگا ہونے کے لئے کیوں کہا تھا۔ پھر اس نے دل میں کہا ''وہ میرا زخم دیکھے گا تو کیا کہے گا''۔

آہستہ آہستہ اس کی نظریں روشنی سے مانوس ہو رہی تھیں۔ اب اسے جج کا چہرہ

MashalBooks.com

صاف دکھائی دینے لگا تھا۔اس کا چہرہ ایسا سرخ تھا جیسے اس کا سر۔اس کی آنکھیں گول اور مینڈک کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ جو ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں۔اس کی ناک چیل کی چونچ کی طرح نکیلی تھی اور اس کے نیچے ایسی مونچھیں تھیں جیسے زرد گھاس اگی ہوئی ہو۔ یہ گھاس کھلے منہ پر لرزتی رہتی اور منہ چوہے دان کی طرح ہر وقت کھلا رہتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جج کا منہ ہمیشہ کھلا کیوں رہتا ہے۔کیا وہ اس سے ہر وقت بولتا رہتا ہے یا اس سے سانس لیتا ہے؟ اس کا چمک دار گنجا سر ہر وقت آگے پیچھے یا دائیں بائیں جنبش کرتا رہتا۔سر آگے ہوتا پھر تھوڑا پیچھے ہو جاتا' کسی بات پر غور کرتا پھر وہ ایسے جھک جاتا کہ ٹھوڑی گردن میں جا گھستی۔ وہ جج کے پیچھے نہیں دیکھ سکتی تھی کہ وہاں کیا ہے لیکن جب اس نے اپنا سر اٹھایا اور پیچھے کو کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ سر کسی نکیلی سی چیز میں داخل ہو گیا ہے۔ جیسے وہ کوئی ٹوپی ہو یا جوتا۔اس نے اپنی توجہ اس پر مرکوز کی اور غور سے دیکھا۔ وہ جوتا ہی تھا جو جج کے سر پر تھا۔ جوتے کے اوپر اس نے موٹی موٹی ٹانگیں دیکھیں جو پتلون میں جکڑی ہوئی تھیں۔ پتلون نہایت قیمتی چمڑے' چیتے کی یا سانپ کی کھال کی تھی اور دو کاندھوں پر جو کوٹ تھا وہ بھی نہایت قیمتی کپڑے کا تھا۔دونوں کاندھے اس کوٹ میں جکڑے ہوئے تھے۔ کاندھوں کے اوپر اس نے وہ چہرہ دیکھا جو اس نے اخباروں میں ہزاروں مرتبہ دیکھا تھا اور آنکھیں جو خلا میں گھور رہی تھیں ان میں سادگی سے زیادہ حماقت تھی۔ ناک ایسی سیدھی تھی جیسے چھینی سے بنائی گئی ہو۔منہ بند تھا جس سے وہ جھوٹی دیانت جھلک رہی تھی جس کی نمائش کیمرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تمام حکمران اور بادشاہ کرنا چاہتے ہیں۔اگرچہ اس کا منہ غرور اور جھوٹے خلوص سے پکا ہوا تھا لیکن اس کے گال لٹکے ہوئے تھے۔اس کے نیچے ایک اداس اور مسخروں والی مسکراہٹ پھیلی تھی جس سے جنم جنم کی بددیانتی اور بچگانہ ہٹ دھرمی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

پہلی بار اس نے بادشاہ کی تصویر دیکھی تھی تو وہ پرائمری اسکول میں تھی۔ چہرہ گوشت سے بھرا ہوا تھا اور آنکھوں کی لکیر سرخ نظر آتی تھی۔ ہونٹ پتلے تھے جو تکبر اور نخوت کے ساتھ بھنچے ہوئے تھے۔اسے اپنے والد کی آواز یاد آئی جو کہہ رہے تھے۔''یہ بہت گھٹیا اور بدمعاش انسان ہے۔'' لیکن وہ تو سب ہی ایسے تھے۔ جب وہ کیمرے کے سامنے کھڑے ہوتے تو اپنے آپ کو خدا سمجھتے۔

وہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم لکڑی کی نشست پر ٹکا ہوا ہے لیکن وہ

شبہ میں پڑ گئی تھی۔ وہ اسے اتنی دیر بیٹھا رہنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ اس طرح بیٹھنے سے بہت آرام ملتا ہے۔ وہ بیٹھ سکتی ہے' اپنے جسم کو بیٹھنے کی پوزیشن میں رکھ کے اس نے انسان کی اس حیرت انگیز صلاحیت سے پورا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ انسانی جسم ایک نہایت اہم صلاحیت کے اعتبار سے جانور سے مختلف ہے۔ وہ صلاحیت ہے بیٹھنے کی۔ وہ جس طرح بیٹھ سکتی ہے کوئی جانور ایسے نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر جانور ایسے بیٹھے تو وہ اپنے چاروں پیروں کے ساتھ کیا کریں گے؟ اسے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور وہ ہنس دی۔ ایک بچھڑے نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی اور پیچھے کو لڑھک گیا تھا۔ اس کے ہونٹ جیسے کچھ کہنے کے لئے لرزے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ مسکرا ہی دے۔ مگر وہ ناکام ہوگئی۔ اسکے ہونٹ افقی طور پر اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ چپکے رہے۔ ان ہونٹوں نے اس کے چہرے کے نچلے حصے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کیا وہ تھوکنے کے لئے تھوڑا سا منہ کھول لے؟ لیکن اس کا حلق' اس کی گردن' اس کا منہ' ہر چیز خشک تھی سوائے اس زخم کے جو رس رہا تھا۔

اس نے دونوں رانیں سختی کے ساتھ بند کر لیں تاکہ وہ زخم کو دبا سکے اور آرام سے بیٹھنے کا لطف لے سکے وہ ہمیشہ اس طرح بیٹھے رہنا چاہتی تھی' جب تک موت نہ آ جاتی وہ اس طرح بیٹھنے کو تیار تھی مگر اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ کوئی اس کا نام لے رہا تھا ''لیلیٰ الفرجانی۔''

اس کے حواس جو سن ہو چکے تھے یکدم جاگ پڑے اور اس عجیب سے نام پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیلیٰ الفرجانی۔ جیسے یہ اس کا نام نہیں تھا۔ جیسے اس نے زمانے سے یہ نام نہیں سنا تھا۔ یہ ایک لڑکی کا نام تھا جو لڑکوں کے کپڑے نہیں پہنتی تھی اس جس نے سورج کو دیکھا تھا اور جو اپنے دو پیروں پر انسانوں کی طرح چلتی تھی۔ لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ وہ برسوں پہلی لڑکی تھی۔ اس نے عرصہ پہلے لڑکیوں کے کپڑے پہنے تھے۔ اس کے بعد اس نے لڑکیوں کے کپڑے نہیں پہنے' پھر اس نے سورج نہیں دیکھا اور اپنے دو پیروں کھڑی نہیں ہوئی۔ ایک زمانے سے وہ کسی چھوٹے سے جانور کی طرح ایک تاریک اور دور افتادہ غار میں بند ہے اور وہ جب اسے بلاتے ہیں تو کسی جانور کا نام لیتے ہیں۔

اس کی آنکھیں اب بھی چیزوں کو صاف صاف دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جج کا چہرہ اب زیادہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اب وہ زیادہ ہل رہا ہے لیکن وہ جب بھی اوپر کو ہوتا

MashalBooks.com

ہے تو دیوار کے جوتوں میں جا گھستا ہے اور نیچے ہوتا تو اپنی گردن میں چھپ جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ٹنگی تصویر بھی واضح ہوگئی ہے۔ نوکیلے جوتے چمک دار ہیں، گھوڑسواروں کی طرح خوب تنگ سوٹ ہے، چہرہ اکڑا ہوا جس سے اعتماد اور حماقت جھلک رہی ہے اندرونی خباثت اور غرور ایک چیز سے ٹپکا پڑ رہی ہے۔

اس کی نظروں کی وہ تیزی اب باقی نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی وہ گھناؤنا پن اب بھی صاف دیکھ سکتی تھی۔ اس نے وہ مکروہ چہرہ دیکھا اور اسے اپنے باپ کے الفاظ یاد آئے۔ انہوں نے کہا تھا ''بیٹی یہ لوگ تخت سلطنت تک اس وقت پہنچتے ہیں جب وہ اخلاقی طور پر تحت الثریٰ میں گر چکے ہوں اور اندرونی طور پر بالکل گل سڑ چکے ہوں۔

اندرونی طور پر گلنا سڑنا کیا ہوتا ہے؟ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ اس وقت اس کا جی چاہا تھا کہ کاش اس کے پاس کاغذ اور قلم ہوتا تو وہ اس کی تصویر بنا لیتی۔ لیکن کیا اس کی انگلیاں اس قابل تھیں کہ قلم پکڑ سکتیں اور قلم کاغذ پر چلا سکتیں؟ کیا قلم پکڑنے کے لئے اس کی دو انگلیاں باقی رہ جائیں گی؟ اگر انہوں نے وہی دو انگلیاں قلم کر دیں تو کیا ہوگا؟ کیا وہ ایک انگلی سے قلم پکڑ سکے گی۔ کیا کوئی انسان ایک پاؤں پر چل سکتا ہے؟ یہ سوال وہ تھے جو اس کے باپ بار بار دہرایا کرتے تھے۔ مگر وہ اس قسم کی کمزوری کے سوال سے نفرت کرتی تھی اور اپنے آپ سے کہتی تھی ''میں انگلی کو بیچ میں سے چیر لوں گی اور اس میں قلم پکڑ لوں گی۔'' بالکل ایسے ہی جیسے آئی سس نے اوسی اس کی ٹانگ چیر دی تھی۔ اسے وہ کہانی یاد تھی۔ وہ چری ٹانگ سے بہتا لہو دیکھ رہی ہے۔ کتنے طویل ڈراؤنے خواب میں اس نے زندگی گزاری ہے۔ اس کی کتنی خواہش تھی کہ اس ک ماں کا ہاتھ اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا۔ تا کہ وہ آنکھیں کھول لیتی۔ بچپن میں وہ کتنی خوش ہوتی تھی جب اس کی آنکھ کھلتی تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ جو خوفناک دیو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ وہ صرف خواب تھا یا جیسا کہ ماں کہتی تھیں ڈراؤنا خواب تھا۔ ہر بار اس کی آنکھ کھلتی تو خوشی ہوتی کہ دیو غائب ہو گیا ہے۔ لیکن اب اس نے آنکھ کھولی تو دیو غائب نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور دیو اسی طرح اس کے جسم پر سوار تھا۔ اس پر اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں تا کہ وہ پھر سو جائے تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ یہ صرف ڈراؤنا خواب ہے۔ مگر اس نے آنکھیں پھر کھولیں اور جان لیا کہ وہ خواب نہیں ہے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

سب سے پہلی چیز جو اسے یاد آئی وہ رات کی خاموشی میں اس کی ماں کی چیخ تھی ۔ وہ بیس سال کی ہو چکی تھی لیکن چھ سالہ بچی کی طرح اپنی ماں کے ساتھ چمٹ کر سو رہی تھی ۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ میری گود میں سونا تا کہ وہ آدھی رات کو بھی آئیں تو مجھے پتہ چل جائے اور میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہیں اپنے ساتھ چمٹا لوں ۔ اگر وہ تمہیں لے کر جائیں تو تمہارے ساتھ انہیں مجھے بھی لے جانا پڑے ۔

اس کے لئے اس سے زیادہ اذیت ناک اور کوئی چیز نہیں تھی کہ ماں کا چہرہ اس سے دور ہٹتا گیا ۔ حتٰی کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ ماں کا چہرہ ان کی آنکھیں اور ان کے بال کیسے زرد ہو گئے تھے ۔ کاش وہ ماں کا ایسا چہرہ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی ۔ اس نے اپنے آپ سے کہا تھا ۔ ماں میں نے تمہیں جو تکلیف پہنچائی ہے کیا اس کے لئے تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟ ۔ ماں اس سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں ۔ ’’سیاست کا تیرے ساتھ کیا تعلق ہے ۔ تو مرد تو نہیں ہے ۔ تیری عمر کی لڑکیاں تو صرف شادی کا ہی سوچتی ہیں ۔‘‘ جب اس کی ماں نے کہا تھا کہ سیاست ایک گندا کھیل ہے جو بے کار مرد کھیلا کرتے ہیں تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا ۔

اب آوازیں زیادہ واضح ہو گئی تھیں ۔ دھند اب بھی زیادہ تھی مگر تصویر بھی زیادہ صاف ہو گئی تھی ۔ کیا یہ سردیوں کا موسم ہے اور کمرہ چھت کے بغیر ہے یا پھر گرمیاں ہیں اور یہاں سب لوگ سگریٹ پی رہے ہیں؟ اب وہ ایک اور آدمی کو بھی سامنے بیٹھا دیکھ سکتی ہے ۔ یہ آدمی جج سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا ہے ۔ اس کا سر بھی جج کی طرح سرخ اور چمکتا ہوا ہے ۔ لیکن جج کی طرح وہ جوتے کے نیچے نہیں ہے ۔ وہ ایک طرف کو بیٹھا ہے اور اس کے سر پر ایک اور تصویر لٹک رہی ہے جو کسی پرچم یا چھوٹی سی کسی رنگ برنگی جھنڈی کی ہے پہلی بار اس کے کانوں میں الجھے الجھے سے جملے پڑتے ہیں ۔

’’ذرا سوچئے خواتین وحضرات‘ یہ طالبہ جو ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہے ظلِ الٰہی کو احمق کہتی ہے اس ہستی کو احمق کہتی ہے جسے خدا نے ہماری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے ۔‘‘

’’احمق‘‘ کا لفظ اتھاہ گہرے اور خاموش سمندر میں پتھر کی طرح گرا ۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے پانی میں پتھر گرنے سے ہوتی ہے‘ جیسے کسی سخت چیز پر ہاتھ کی ضرب پڑنے سے ہوتی ہے‘ جیسے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجانے سے ہوتی ہے ۔ کیا کوئی تالی

بجا رہا ہے؟ کیا قہقہوں کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے؟ پھر اچانک عدالت میں ہولناک خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایک طویل خاموشی جس میں وہ اپنے دل کی دھڑکن سن سکتی ہے۔ اس کے کانوں میں تالیوں یا قہقہوں کی آواز ابھی تک گونج رہی ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ اس وقت جب ''جلالت مآب'' کو احمق کہا جا رہا ہے تو وہ کون ہے جو تالی بجا رہا ہے اور قہقہہ لگا رہا ہے؟

اس کا جسم ابھی تک لکڑی کی نشست سے چپکا ہوا تھا۔ وہ اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اسے پھر وہاں سے اٹھا لیا جائے گا۔ اس کے پیڑو کا زخم ابھی تک رو رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور تھوڑی سی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ تالی کدھر بجی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ کمرہ سروں سے بھرا ہوا ہے جو قطار اندر قطار ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ انسانی سر ہیں۔ ان میں کچھ چھوٹے ہیں جیسے بچوں کے سر۔ بعض سروں پر بہت سے بال ہیں جیسے وہ لڑکیوں یا عورتوں کے سر ہوں۔ ایک سر اسے ایسا لگا جیسے اس کی چھوٹی بہن کا ہو۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو پل بھر کے لئے اس کا جسم لرز گیا۔ کیا وہ اکیلی آئی ہے یا ابو امی کے ساتھ آئی ہے؟ کیا وہ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں؟ اس وقت وہ کیسی لگ رہی ہے؟ کیا وہ اس کا چہرہ یا اس کا جسم پہچان رہے ہیں؟

اس نے سر موڑ کر دیکھا۔ اس کی بینائی کمزور ہوگئی پھر بھی اس نے ماں کو تلاش کیا۔ وہ تو آنکھیں بند کر کے بھی ہزاروں چہروں میں اپنی ماں کا چہرہ پہچان سکتی ہے۔ کیا واقعی اس ہال میں اس کی ماں موجود ہے؟ اس کے دل کی دھڑکن زور زور سے سنائی دینے لگی۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ ایسی گھبراہٹ اس پر طاری ہو جاتی تو اسے ڈر لگتا کہ اس کی ماں کو کچھ ہو جائے گا۔ ایک رات جب وہ سکڑی پڑی تھی تو ایک دم اس کے دل پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ ماں مر چکی ہو گی اور وہ اس کا منہ بھی نہیں دیکھ سکے گی۔ لیکن دوسرے دن جب ماں اس سے ملنے آئی تو اس نے ماں کو دیکھا۔ وہ ٹھیک تھی۔ اسے خوشی ہوئی۔ اس نے کہا ''ماں اس وقت تک مجھے چھوڑ کر نہ جانا جب تک میں باہر نہ نکل آؤں اور میں نے تمہیں جتنی تکلیفیں پہنچائی ہیں ان سب کا ازالہ نہ کر دوں۔''

اب اس کے کانوں میں صاف آواز آ رہی ہے۔ وہ صرف ایک تالی نہیں ہے بلکہ بہت سی تالیاں بج رہی ہیں۔ ہال کے اندر سر ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ جج ابھی تک بیٹھا ہے۔ اس کا چکنا سر ابھی تک اس جوتے کے نیچے ہے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا

ہتھوڑا تیزی کے ساتھ لکڑی کی میز پر پڑ رہا ہے۔ لیکن تالیاں ابھی تک بند نہیں ہوئیں۔ جج کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا سر تصویر کے پیٹ پر رکھا ہوا ہے۔ اس نے ڈانٹا تو اس کا نچلا ہونٹ زور سے کانپا۔ وہ اس کے الفاظ نہیں سن سکی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنے پہلوؤں میں رکھے اپنے ان ہاتھوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے جنہوں نے لکڑی کی بنچ کو زور سے پکڑ رکھا ہے۔ وہ پوری طاقت سے بنچ کو پکڑ کر یہ یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیا وہ بنچ واقعی اسکے نیچے ہے کیا وہ واقعی اس پر بیٹھی ہے؟ اس کی آنکھیں بند ہیں لیکن وہ جانتی ہے کہ وہ جاگ رہی ہے سو نہیں رہی ہے۔ پہلے تو وہ آنکھیں کھولتی تھی تو دیو غائب ہو جاتا تھا اور وہ خوش ہوتی تھی کہ وہ محض خواب تھا۔ لیکن اب اس کے اندر خوش ہونے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ اور وہ آنکھیں کھولتے بھی ڈرتی ہے۔

ہال کے اندر آوازیں بند ہو گئی ہیں اور سر پہلے کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔ سوائے ایک سر کے جو چکنا ہے اور نہ سرخ۔ اس پر گھنے سفید بال ہیں اور وہ حرکت نہیں کر رہا ہے۔ نظریں بھی ساکن ہیں۔ وہ خشک ہیں اور اس چھوٹی سی گٹھری پر جمی ہوئی ہیں جو لکڑی کی بنچ پر بیٹھی ہے۔ اس عورت کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے ہیں۔ اس کے ہاتھوں کے نیچے زور زور سے دل دھڑک رہا ہے۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی ہے جیسے دوڑتے دوڑتے میدان کے سرے پر پہنچ گئی ہو اور اسے سانس نہ آ رہا ہو۔ اس نے اپنے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یا اللہ کہا تو اس کی سانس جیسے اکھڑ سی گئی: اس کی نگاہیں میری طرف اٹھی تھیں مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ ان لوگوں نے اس کی آنکھوں کو کیا کر دیا ہے؟ یا وہ نیند سے لڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یا اللہ تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ میری بیٹی اتنی اذیت کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ ہم دونوں مل کر اتنی اذیت کیسے سہ سکتے ہیں؟ میری بیٹی تو ہمیشہ سے یہی سمجھتی تھی کہ تو ہر کام کر سکتی ہے۔ تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے اور پتھر ریزہ ریزہ کر سکتی ہے حالانکہ تو بھی میری طرح دبلی پتلی ہے۔ جب میرے پیٹ کے اندر تیرے ننھے ننھے پاؤں زور زور سے ٹکراتے تھے تو میں کہتی تھی۔ یا اللہ کتنی طاقت ہے اس ننھی سی جان میں۔ تو میری کوکھ میں تھی تو تیری حرکت بہت طاقت ور تھی۔ تو آتش فشاں کی طرح مجھے ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ تو میری طرح دبلی پتلی ہی ہو گی۔ تیری ہڈیاں اپنے باپ کی طرح نازک ہوں گی۔ تو اپنی نانی کی طرح لمبی اور دبلی

ہو گی اور تیرے پاؤں پیغمبروں کی طرح بڑے ہوں گے۔تو پیدا ہوئی تو تیری دادی نے منہ بنایا۔''ایک تو لڑکی اور اس پر بدشکل۔مصیبت پر مصیبت۔'' میں نے اپنے پیٹ کے اعصاب کو اکڑا لیا تھا۔خون بہت جا رہا تھا درد انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔تو بہت مشکل سے پیدا ہوئی تھی۔ تجھے جنم دینا ایسا ہی تھا جیسے کسی چٹان کو جنم دینا۔ میں نے تیری دادی سے کہا ''یہ میرے لئے ساری دنیا سے زیادہ قیمتی ہے۔'' میں نے تجھے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا اور گہری نیند سو گئی تھی۔ میری بیٹی کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں پھر اتنی ہی گہری نیند سو سکوں؟ تو میرے پیٹ میں ہو یا کم سے کم میرے پاس ہو کہ ہاتھ بڑھا کر تجھے چھو سکوں؟ یا تو برابر والے کمرے میں ہو اور میں دبے پاؤں اندر آؤں اور تجھے سوتا دیکھ سکوں؟ تو جب بھی سوتی تھی تیرا کمبل ہمیشہ نیچے گر جاتا تھا میں اسے اٹھا کر تجھے اڑھاتی تھی۔ ہر رات مجھے گھبراہٹ سی ہوتی تھی اور میں چپکے سے تیرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ وہ گھبراہٹ کیسی تھی اور کس وقت ہوتی تھی؟ کیا وہ لمحہ ہوتا تھا جب تیرے اوپر سے کمبل گرتا تھا؟ تو میرے سامنے سے چلی جاتی تھی تب بھی میں تیری موجودگی محسوس کرتی تھی۔اگر وہ تجھے زمین میں گاڑ دیں یا تجھے سیمنٹ اور فولاد کی دیوار میں چنوا دیں تب بھی تیرے جسم پر پڑنے والے ہوا کے جھونکے کو میں اپنے جسم پر پڑتا ہی محسوس کروں گی۔کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں نے واقعی تجھے جنم دے دیا ہے یا ابھی تو میرے پیٹ میں ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو تجھے چھونے والی ہوا کو میں کیسے محسوس کرتی ہوں اور تجھے لگنے والی بھوک مجھے کیوں ستاتی ہے؟ تیرا درد میرا ہے جیسے میرے سینے اور پیٹ میں آگ لگی ہو یا مولا۔ تیرا اور میرا جسم اسے کیسے برداشت کر سکا تھا۔مگر میں نے یہ سب اس لئے برداشت کر لیا تھا کہ اللہ نے تجھے میری بیٹی بنایا ہے۔تو گندگی کے پہاڑوں کے اوپر سے اپنا سر اونچا کر سکتی ہے۔ تین ہزار پچیّس گھنٹے میں نے ایک ایک منٹ کا حساب رکھا ہے۔انہوں نے تجھے پیٹ کے رستے زخم کے ساتھ قے اور پیپ میں ڈالے رکھا تھا۔تو نے جب مجھے بتایا تھا تو میں نے تیری آنکھوں میں تیرتے دکھ اور خوف کے سائے دیکھے تھے۔ ہمارے درمیان سلاخیں تھیں۔ کاش آنسو خون کے ہوتے۔مگر وہ سرخ نہیں تھے وہ سفید تھے اور ان میں موت کی بو تھی۔ میں نے اس روز تجھ سے کیا کہا تھا؟ مجھے تو یاد نہیں مگر میں نے شاید کہا تھا کہ آخر ہم اس بو سے مانوس ہو جاتے ہیں اور ہم اس کے ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ میں نے تیرے لاغر چہرے کو نہیں دیکھا تھا مگر تو نے جو کہا تھا وہ سنا تھا۔ ماں یہ بو نہیں ہے یہ دوسری بو کی طرح ایسی بو

نہیں ہے جو ناک یا منہ کے راستے اندر داخل ہوتی ہے بلکہ وہ سیال ہوا یا سیال بھاپ ہے جو چپچپا پانی یا پگھلا ہوا تانبہ بن گئی ہے اور جسم کے ہر سوراخ سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ امی میں نہیں جانتی کہ وہ سیال دہکتا ہوا خون گرم تھا یا یخ ٹھنڈا۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ پھر تیرے نازک ہاتھ سلاخوں کے درمیان سے تھام لئے اور کہا ''میری بچی جب گرمی ٹھنڈ بن جائے تو ہر چیز قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔لیکن جب میں تیرے سامنے سے ہٹی تو میرا دل بھر آیا۔ایسا لگا جیسے سینے میں کوئی چیز پھیلتی جا رہی ہے۔پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ میرا سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ مجھے لگا کہ میرا گلا بند ہو رہا ہے۔ میں نے سانس ٹھیک کرنے کے لئے اپنا سر اوپر کر لیا۔لیکن اس دن میرے سر پر آسمان ہوا سے عاری تھا اور سورج جہنم کی آگ کی طرح پگھلا تانبہ برسا رہا تھا۔ گارڈ کی نگاہیں میرے بدن میں چبھ رہی تھیں اور ان کی گنوار آوازیں میرے اندر طوفان مچا رہی تھیں۔ اگر اس وقت زمین ان میں سے کسی کا چہرہ بن جاتی تو میں اس پر تھوک تھوک کر اپنا منہ اور حلق خشک کر لیتی۔ ہاں میری بچی' اپنی کمر کے پٹھے سیدھے کر لے اپنا سر اٹھا اور میری جانب کر لے۔ میں تیرے ساتھ ہی بیٹھی ہوں۔تو نے سنا ہو گا انہوں نے تیرے لئے تالیاں بجائی تھیں۔کیا تو نے سنا؟ میں نے تجھے اپنا سر ادھر کرتے دیکھا تھا۔تو نے ہمیں دیکھا؟ مجھے اپنے ابو اور اپنی چھوٹی بہن کو؟ ہم سب نے ان کے ساتھ تالیاں بجائی تھیں۔تو نے ہمیں دیکھا؟

اس کی نظریں گہری دھند کو چیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔جج ابھی تک کھڑا ہے۔ اس کا سر چکنا اور سرخ ہے اور اس کا نچلا ہونٹ تیز تیز لفظوں کے ساتھ لرز رہا ہے۔جج کے دائیں اور بائیں اس نے چکنے سرخ سروں کو اونچی میز کی جانب سے ہٹتے دیکھا۔ جج اور دوسروں کے سر غائب ہو گئے۔ دیوار پر تصویر اسی طرح ٹنگی رہی۔ چہرے اور آنکھیں ویسی ہی تھیں جیسے اس نے دیکھی تھی لیکن اب ایک آنکھ چھوٹی لگ رہی تھی جیسے آدھی بند ہو۔ بالکل اس طرح جیسے جب کوئی مرد کسی عورت کو آنکھ مارتا ہے تو آنکھ آدھی بند ہو جاتی ہے۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اسے آنکھ مار رہا ہو؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تصویر میں آنکھیں حرکت کرنے لگیں؟ کیا جامد چیزیں حرکت کرتی ہیں؟ یا وہ بیمار ہے اور اسے خواب آ رہے ہیں اس نے اپنے نیچے لکڑی کی بنچ کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا اور پھر اپنے جسم کو چھوا۔ اس کے جسم سے تیز تپش اٹھ رہی تھی جیسے بھڑکتا شعلہ۔ جیسے اس کے سینے کے اندر

آگ بھڑک رہی ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ منہ کھولے اور کہے''پانی کا ایک گلاس'' مگر اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ایک افقی لائن کھینچی ہوئی تھی تنے ہوئے تار کی طرح۔ اس کی آنکھیں تصویر کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں اور تصویر کی ایک آنکھ اسے آنکھ مار رہی تھی۔ یہ اسے آنکھ کیوں مار رہی ہے؟ کیا وہ اسکے ساتھ فلرٹ کر رہا ہے؟ دو سال قبل جب اس نے غیر ملکی سیاحوں کو دیکھا تھا تو اسے اندازہ ہوا تھا کہ آنکھ مارنے کا مطلب ایک دوسرے کو خوش آمدید کہنا بھی ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی کسی غیر ملکی مرد یا عورت کی طرف دیکھتی تو اسے کوئی آنکھ مار دیتا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ عورت کسی عورت کو آنکھ کیسے مار سکتی ہے؟ بعد میں اسے پتہ چلا تھا کہ امریکیوں کا خوش آمدید کہنے کا یہی طریقہ ہے۔

سامنے اوپر کرسیاں خالی تھیں۔ جج اور دوسرے سرخ سروں والے ابھی تک غائب تھے۔ ہال میں بیٹھے سر ابھی تک ایک دوسرے میں جڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں سفید بالوں کو تلاش کر رہی تھی۔ سفید بالوں اور ان مہربان آنکھوں کو جنہیں وہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہاں اتنے بہت سے سر تھے۔ کوئی گول تھا تو کوئی انڈے کی شکل کا۔ ان پر کالے بال تھے یا کھچڑی۔ اس کی ناک میں لرزش پیدا ہوئی جیسے وہ اپنی ماں کی خوشبو سونگھنا چاہتی ہو۔ ہاں وہ اپنی ماں کی خوشبو ہزاروں لوگوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ بچی تھی تو وہ خوشبو دودھ کی تھی وہ اٹھتی تو وہ خوشبو صبح کی ہوتی اور سوتی تو وہی خوشبو رات کی خوشبو بن جاتی۔ وہ گیلی مٹی پر بارش کی خوشبو تھی اور بستر پر دھوپ کی گرمی اور پیالے میں گرم سوپ کی خوشبو۔ اس نے دل میں کہا''کیا یہ ہوسکتا ہے امی آپ یہاں نہ ہوں؟ اور ابو کیا آپ بھی نہیں آئے؟''

اس کی آنکھوں کے سامنے دھند ابھی تک چھائی ہوئی ہے اس کا سر ہال بے بیٹھے سروں کی طرف گھوم گھوم کر دیکھتا ہے۔ اس انتھک حرکت میں سفید اور سیاہ دائرے سے بن رہے ہیں' بگڑ رہے ہیں۔ گندمی ماتھے پر کالے بالوں کا ایک دائرہ منجمد ہے' دبلے زرد چہرے پر دو تیز آنکھیں اور ایک دبلا پتلا جسم پیچھے موجود ہے۔ اس کے لمبے لمبے استخوانی ہاتھ سختی سے گھٹنوں پر جمے ہوئے ہیں۔ جیسے درد سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ سہارا لے رہا ہو۔ لیکن جونہی وہ تالیوں کی آواز سنتا ہے اس کے ہاتھ بھی اٹھتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ اب اس کے ہاتھ گھٹنوں پر نہیں آتے۔ اب درد اتنا شدید نہیں ہے۔ تالیاں بجاتے

ہوئے اس کا دل اس زور سے دھڑکتا ہے کہ اس کا جسم اپنی نشست پر اچھل پڑتا ہے۔ وہ ہال میں بیٹھے چہروں کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی آنکھیں دیکھتا ہے۔ اسکے ہونٹ تھوڑے سے کھلتے ہیں جیسے وہ چیخنا چاہتا ہو۔ میں اس کا باپ ہوں۔ میں الفرجانی ہوں جو اس کا باپ ہے اور جس کا نام اس کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ یا اللہ ایک بار تالی بجانے سے سارے جسم کا درد کیسے غائب ہو گیا۔ اگر اس وقت میں کھڑا ہو جاؤں اور اپنی شناخت کرادوں تو کیا ہوگا؟ ایسے موقع کبھی کبھی آتے ہیں مجھے اسے کھونا نہیں چاہیے۔ ہم جیسے لوگ ایک لمحے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ اس لمحے کے لئے جب لوگ ہمیں پہچانیں ہمارے لئے تالیاں بجائیں ہم ان کے ہیرو بن جائیں۔ وہ ہمیں دیکھیں ہماری طرف انگلیوں سے اشارے کریں۔ ہم ایسے ہی لمحے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ اب میری بیٹی نے اتنی قربانی اور بہادری سے میرے لئے ایسا مواقع فراہم کیا ہے تو مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

وہ اپنی نشست پر تھوڑا سا اوپر اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ صرف اس کا سر ہل رہا تھا۔ اس کی نظریں لوگوں کے چہروں پر سرکتیں رہیں جیسے وہ چاہتا ہو کہ کوئی اسے پہچانے۔ جج کی غصے بھری آواز اور میز پر اس کے ہتھوڑے کی دھم دھم کے ساتھ یکدم تالیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ فوراً ہی جج اور اس کے ساتھی اپنے چیمبر میں چلے جاتے ہیں۔ ہال پر پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ ہولناک خاموشی۔ اس دوران سرگوشیاں اس کے کانوں میں پڑتی ہیں۔ وہ چیمبر میں کوئی نیا مقدمہ بنا لیں گے...... ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے...... یہاں عدل اور انصاف کو کون پوچھتا ہے...... ابھی دو عدالت میں کھلی سماعت ختم کر دیں گے۔ عدالت سے لوگوں کو باہر نکال دیا جائے گا۔ سماعت بند کمرے میں ہو گی...... وہ تو ہیروئن ہو گی جواب تک زندہ رہ گئی ہے...... ذرا سوچو تو اتنی ذرا سی لڑکی نے حکومت کو کتنا پریشان کر رکھا ہے...... آپ جانتے ہیں اسے کتنی اذیت دی گئی ہے؟...... اس کے ساتھ زنا کیا گیا...... ایک کے بعد دوسرے مرد نے...... رات رات بھر...... انہوں نے اس کی اور اس کے باپ کی عزت لوٹ لی۔ بے چارہ باپ۔ آپ اسے جانتے ہیں؟ کہتے ہیں وہ بیمار پڑا ہے۔ اتنی بے عزتی کے بعد بھلا لوگوں کو منہ کیسے دکھا سکتا ہے۔

اس پر وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کان بند کر لیتا ہے۔ وہ اور نہیں سن سکتا۔ وہ اپنا سر اپنے سینے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے

MashalBooks.com

اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ سب کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتا ہے۔ اس کا نام الفرجانی نہیں ہے۔ اس کا کوئی نام یا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جس شخص کی عزت و آبرو ہی لٹ گئی ہو اس کا پھر کیا رہ جاتا ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو سختی کے ساتھ سمجھایا تھا کہ ''میری بیٹی سیاست عورتوں کا کام نہیں ہے'' مگر اس نے سنا ہی نہیں۔ اگر وہ مرد ہوتی تو وہ عذاب نہ بھگت رہی ہوتی جو آج وہ بھگت رہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کتا اس کی عزت و آبرو پہ ہاتھ نہ ڈالتا۔ اب تو اس کے لئے اور اس کی بیٹی کے لئے موت ہی ایک راستہ رہ گئی ہے۔

ہال میں ابھی تک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ جج اور اس کے ساتھی ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ اس کی نظریں ان چہروں میں ایک چہرے کو تلاش کر رہی ہیں۔ جانی پہچانی آنکھوں کو ڈھونڈ رہی ہیں اور سفید بالوں کے اس گچھے کو تلاش کر رہی ہیں جن کا رنگ بچوں کے دودھ جیسا ہے۔ لیکن اسے صرف کالے اور سفید دائرے ایک دوسرے میں ملتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ امی آپ یہاں نہ ہوں؟ کیا ابو ابھی تک بیمار ہیں؟ اسکی ناک بھی ادھر ادھر سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے' جانی پہچانی خوشبو سونگھنے کی' دودھ سے بھری چھاتی کی خوشبو' گرم دھوپ اور ہری گھاس پر پڑنے والی پھوار کی خوشبو۔ لیکن اس کی ناک میں اب جو بو آ رہی ہے وہ صرف اس کے جسم کی بو ہے جو لکڑی کی بنچ پر سکڑا پڑا ہے یا پھر اس رستے زخم کی بو ہے جو اس کے نیچے بنچ پر پھیل رہا ہے۔ یہ پیپ اور خون کی بو ہے' دس مردوں کے پسینے اور گندی سانسوں کی بدبو ہے۔ ان کی کرخت آوازوں' ان کے تھوک اور ان کے حلق سے نکلتی خرخراہٹ کی آواز ہے۔ اس آدمی نے جس نے اسے دبوچ رکھا تھا اس نے کہا تھا۔ ''عورتوں کو ایذا پہنچانے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کی عزت لوٹ لی جائے'' اس کا جسم اس وقت بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن اس نے ہمت کر کے اپنا منہ کھولا اور کہا ''تم گدھے ہو میری سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ اور سب سے بڑا گدھا وہ ہے جو تمہارا لیڈر رہے۔''

وہ اپنا سر اٹھانے کے لئے گردن لمبی کرتی ہے اور اپنی کمزور نظروں سے دھند کے اندر دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ابھی تک بہت سے سر ایک دوسرے میں بھڑے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں میں ابھی تک تکلیف ہو رہی ہے۔ کاش وہ ایک لمحے کے لئے ہی اپنی ماں کو دیکھ سکتی۔ یا اپنے باپ اور بہن سے بات کر سکتی۔ وہ انہیں ایک عجیب سی بات بتاتی۔ وہ انہیں بتاتی کہ جب انہیں پتہ چلا کہ اس قسم کی ایذا اور تشدد سے اب اسے تکلیف

MashalBooks.com

نہیں پہنچتی تو انہوں نے تشدد کا طریقہ ختم کر دیا۔ انہوں نے دوسرے طریقے تلاش کرنا شروع کر دیے۔

جج اور اس کے معاونین اپنے چیمبر میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ اس مقدمہ پر غور کر رہے ہیں کہ لوگوں نے ملزمہ کے لئے تالیاں بجائی ہیں' اب انہیں کیا کرنا چاہئے؟ اب جج کو خود حملوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

......ہم آپ کو الزام نہیں دے رہے ہیں جناب والا لیکن آپ نے ہم سب کو شرمندہ کر دیا ہے۔ آپ نے جو مناسب خیال فرمایا وہی کیا لیکن اس سے حالات اور بگڑ گئے۔ جناب والا' آپ اس ہستی کو ''احمق'' کیسے کہہ سکتے ہیں جسے خدا نے اس قوم کی کشتی پار لگانے کے لئے بھیجا ہے؟

......نعوذ باللہ میں نے یہ کب کہا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ وہ لڑکی ایسا کہتی ہے۔ وہ ''احمق'' کہتی ہے۔

......آپ نے وہ مثل نہیں سنی ہے کہ ''جو بات کان نہیں سنتا اس سے دل کو تکلیف نہیں پہنچتی''۔ آپ نے سب کے سامنے اس ہستی کو احمق کہا۔

......میں نے نہیں کہا۔ میں نے وہ بات دہرائی تھی جو ملزمہ نے کہی تھی۔ اور میرا یہی کام ہے۔

......ٹھیک ہے آپ کا یہی کام ہے۔ لیکن آپ کو زیادہ عقل مندی سے کام لینا چاہئے تھا۔

......میں سمجھا نہیں۔

......آپ نے دیکھا نہیں کہ لوگوں نے اسے دیکھ کر کیسے تالیاں بجائی تھیں؟

......تو کیا یہ بھی میرا قصور ہے؟

......کیا آپ نہیں جانتے انہوں نے تالیاں کیوں بجائی تھیں؟

......نہیں میں نہیں جانتا۔

......انھوں نے تالیاں اس لئے بجائیں کہ جو بات اس لڑکی نے تنہائی میں کہی تھی وہ آپ نے برسرعام کہہ دی۔ اور یہ اس لڑکی پر الزام ثابت کرنے کے بجائے ایک اور حقیقت کی تصدیق کرنے کے برابر تھا۔

......اور مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے؟

......آپ کو کہنا چاہئے تھا کہ اس نے رہبرِ اعظم کو گالی دی ہے۔ آپ کو اس لڑکی کے الفاظ دہرانا نہیں چاہئے تھے۔

......اور اگر وہ مجھ سے پوچھا جاتا کہ وہ گالی کیا تھی تو میں کیا کہتا؟

......آپ سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس کے علاوہ آپ نے کسی کے سوال کرنے سے پہلے ہی جواب دیدیا۔ جیسے آپ موقع کی تلاش میں تھے کہ اس لڑکی نے جو کہا ہے یا اپنے دل میں آپ جو سمجھتے ہیں اسے سب کے سامنے کہہ دیں۔

......آپ میرے اوپر تہمت لگا رہے ہیں۔ میں تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ مجھ پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ میرے اوپر ناسمجھی کا الزام تو لگا سکتے ہیں لیکن مجھے بدنیت نہیں کہہ سکتے۔

......کبھی کبھی ناسمجھی بدنیتی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کسی کو احمق کہنا اس کی سب سے بڑی توہین ہے۔ اور پھر اس عظیم ہستی کو ایسا کہنا؟ آپ انہیں دھوکے باز' جھوٹا' بخیل' چال باز اور چور یا غدار کہہ سکتے ہیں لیکن احمق کہنا تو ان کی ہتک ہے۔ احمق کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوچتے ہی نہیں' ان کے پاس دماغ ہی نہیں ہے وہ حیوان ہیں۔ آپ کسی عام آدمی کو بھی اتنی بڑی گالی نہیں دے سکتے اور وہ تو پھر حاکم وقت ہیں۔ جناب والا آپ حاکموں کو نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ عقل مند دنیا میں اور کوئی نہیں ہے اور یہ کوئی خیال وخواب نہیں ہے بلکہ ایسا ہی عقیدہ ہے جیسے خدا کے وجود پر اعتقاد۔ اس کے لئے وہ ہزاروں انسانوں کی گردن اڑا سکتا ہے۔

...... مجھے یہ علم نہیں تھا۔ اب میرا کیا ہوگا؟

......سمجھ میں نہیں آتا آپ نے ''احمق'' کا لفظ استعمال کیوں کیا تھا۔ اگر آپ غور سے دیکھتے تو اس لڑکی نے اپنے بیان میں اور بھی نرم الفاظ استعمال کئے تھے۔

......مثلاً کیسے الفاظ؟ خدا کے لئے آپ لوگ اپنے تجربے سے کام لیجئے اور مجھے اس مصیبت سے نکالئے۔ ایسے الفاظ مجھے تلاش کر دیجئے ایسا نہ ہو کہ اس لڑکی پر الزام لگتے لگتے میرے اوپر بھی الزام لگ جائے۔

......ایسے الفاظ عام لوگوں کے سامنے نہیں کہے جاتے۔ اب ساعت ملتوی کر دیجئے۔ اگر کھلی عدالت میں لوگوں کے سامنے اس سے کم ہتک آمیز الفاظ بھی استعمال کئے

جائیں تو وہ بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ اسی لئے تو مقدموں کی سماعت بند کمرے میں کرائی جاتی ہے۔ آپ کے دماغ سے بہت سی باتیں نکل گئی ہیں۔ لگتا ہے آپ کو زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ آپ قانون زیادہ نہیں جانتے۔

چند منٹ ہال پر پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرہ عدالت خالی کرالیا گیا۔ اور جہاں تک اس لڑکی کا تعلق ہے اسے دوبارہ اس جگہ بھیج دیا گیا جہاں سے وہ لائی گئی تھی۔

MashalBooks.com

مرد

ایک انوکھے لمحے میں قسمت اس کے ساتھ تھی۔ ایسے انوکھے لمحے میں جو بہت کم بلکہ بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ قسمت نے اسے دھوکا دیا کیونکہ اچانک اور انجانے طور پر اس نے آپ کو زندگی کے دوبدو پایا۔ برہنہ اور کٹھور زندگی کے۔ جیسے پلک جھپکتے ہی بجلی گری ہو اور اس نے کسی کو بھسم کر دیا ہو اور سارے راز بھی اس کے ساتھ ہی جل گئے ہوں۔ یا وہ سخت جان ہو اور فوراً نہ مرا ہو بلکہ ہوش اور بیہوشی کے درمیان معلق ہو اور پریشان خیال ہو کہ حقیقت اور واہمے اور خواب اور بیداری کے درمیان وہ تمیز ہی نہ کر سکے۔

ایسے ہی ایک لمحے میں خدیجہ نے ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھولا۔ ایسا لگا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان کی طاقت جیسے ختم ہو گئی۔ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے اور شریانوں میں خون جم گیا۔ اگر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت برقرار نہ رہتی تو اس کے دل کی دھڑکن ہی بند ہو جاتی۔ یوں لگا جیسے جسم کی ساری طاقت آنکھوں میں جمع ہو گئی ہے۔ خدیجہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت لیکن وہ واضح طور پر اسے دیکھ رہی تھی۔ اشموی کی پہلی جھلک سے ہی اس نے اس کے گھنگریالے بال اور سانولی موٹی گردن پہچان لی تھی۔ لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی اجنبی کا سر ہو۔ وہ اس شخص کا سر نہ ہو جسے وہ جانتی ہے اور جس کے ساتھ اس نے پورے دس سال گزارے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے جذبات سے عاری انداز میں اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اس بے نیازی کے ساتھ جیسے

Mashalbooks.com

کوئی فلم یا ڈرامہ کا منظر دیکھتا ہو۔ یا جیسے سرکس میں بازی گروں کو اچھل کود کرتے دیکھ کر انسان حیرت سے کہتا ہے''افوہ!''

جب خدیجہ کا منہ حیرت سے کھلا اور اس کے منہ سے افوہ! نکلا تو اسی وقت چار دھنسی ہوئی افسردہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گڑ گئیں۔ وہ ایسی ڈری کہ وہ چار آنکھیں اسے غیر انسانی نظر آئیں۔ پھر وہ زردی مائل ڈھیلوں اور بڑی بڑی پلکوں سے پہچان گئی کہ وہ اشموی کی آنکھیں ہیں۔ دوسری وہ آنکھیں اچانک غائب ہوگئیں جیسے وہ اصلی آنکھیں نہیں تھیں کسی فلم کا فریم تھا جو سامنے آیا اور چلا گیا۔ جیسے وہ کسی جیتے جاگتے انسان کی آنکھیں نہیں تھیں۔

پہلی نظر میں تو اشموی بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ جو آنکھیں اسے گھور رہی ہیں وہ خدیجہ کی دھنسی ہوئی غصیلی آنکھیں ہی ہوسکتی ہیں۔ غالباً وہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت ہے یا ڈراؤنا خواب۔ غیر شعوری طور پر اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے جسم کو چھوا اور دیکھا کہ وہ واقعی جاگ رہا ہے۔ اس کا ہاتھ اس کی ننگی پیٹھ پر پڑا۔ حقیقت اس پر ایک بھاری پتھر کی طرح پڑی جس کے نیچے وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ یہی کرسکتا تھا کہ ایرانی قالین میں اپنا منہ چھپا لے لیکن اس کا باقی جسم اسی جگہ تھا' کھلا ہوا اور ننگا۔ خدیجہ اسے صاف صاف دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک ایک مہرا گن سکتی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا جسم اتنا دبلا ہوگا اور اس کے کاندھے اتنے تنگ ہوں گے۔ وہ اپنے سوٹ میں تو بھرے جسم اور چوڑے کندھوں والا مرد نظر آتا تھا۔ پہلی بار جب وہ اس کے باپ کے پاس اس کا ہاتھ مانگنے آیا تھا تو خدیجہ نے فوراً ہاں کر دی تھی۔ اشموی کا باپ کسی زمیندار کا مزارع تھا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو اسکول میں تعلیم دلائی تھی۔ اشموی سرکاری ملازم ہوگیا تھا اور سوٹ پہنا کرتا تھا۔ خدیجہ نے ان تمام نوجوانوں کے رشتے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو سرکاری ملازم نہیں تھے اور جو ابھی تک جلابیہ پہنتے تھے۔ ان میں گاؤں کے مکھیا کا بیٹا بھی تھا جس کی اپنی دس''فیضان'' زمین تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ جلابیہ بہت قیمتی کپڑے کے ہوتے تھے مگر وہ عجیب طرح کاندھوں سے لٹکتے ہوتے اور ٹانگوں میں اس طرح الجھتے جیسے عورتوں کے جلابیے۔ مرد کے لئے تو ضروری ہے کہ اس کے کاندھے سیدھے اور چوڑے ہوں۔ کوٹ میں کاندھے ایسے ہی چوڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر مرد کے پاؤں ایسے ہونا چاہئیں کہ وہ ایک دوسرے سے

الگ نظر آ گئیں تا کہ وہ پورے اعتماد اور آزادی کے ساتھ چل سکے۔ اس کے نزدیک مردانگی اور زنانہ پن میں یہی فرق تھا اور یہ فرق صرف پتلون سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

خدیجہ زندگی میں پہلی مرتبہ اشموی کو لباس کے بغیر دیکھ رہی تھی۔ بستر پر جاتے ہوئے اور بستر سے اٹھتے ہوئے اس نے اشموی کو ہمیشہ سلیپنگ سوٹ پہنے ہی دیکھا۔ اس نے کبھی اسے پورا ننگا نہیں دیکھا۔ ان لمحات میں بھی جب وہ اسے ننگا دیکھ سکتی تھی اس نے کبھی اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اچھے خاندان کی پاکباز عورت تھی۔ اس کے لئے ایسے موقع پر آنکھیں کھلی رکھنا مناسب نہیں تھا۔ یہ صرف حیا ہی نہیں تھی جو اس سے ایسا کراتی تھی بلکہ اسے مرد کا ننگا بدن دیکھتے ڈر بھی لگتا تھا۔ وہ اس سے ڈرتی تھی اور اس سے بچ کے رہنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی اس کے قریب آتا اور اپنے بازو اس کے گرد حمائل کرتا تو وہ کانپ اٹھتی۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ خوش اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اسے جتنا پیار کرنے والا شوہر ملا ہے کسی کو نہیں ملا ہوگا۔ ہاں اشموی اس سے پیار کرتا تھا۔ اس نے اسے خوش رکھنے کی ہی کوشش کی تھی ...... ہر کوشش۔

''ہر کوشش'' کے الفاظ گولا بن کر اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اندر کسی انجانے گوشے سے پرانی مبہم سی یادیں نکل کر اس کے دماغ پر چھانے لگیں۔ جیسے دماغ سے یہ عجیب یادیں نکالنے کے لئے کسی نے باریک پن سے اس میں سوراخ کیا ہو۔ اشموی نے اسے خوش رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے لئے خدیجہ کو خوش رکھنا بہت مشکل تھا۔ اس نے اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے خلاف اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ اشموی کے دل میں خدیجہ کے لئے کبھی نفسانی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی' اس نے کبھی اس سے پیار نہیں کیا تھا۔ خدیجہ کا بھی یہی حال تھا کہ اشموی اسے تحفوں سے لاد دیتا یا بستر پر وہ دونوں اپنی خواہش کی انتہا پر ہوتے جب بھی خدیجہ کے اندر کہیں ایسا احساس ضرور ہوتا تھا جو اسے اشموی سے الگ کرتا تھا جیسے کسی ٹھنڈے شیشے کی دیوار نے ان دونوں کو علیحدہ کر رکھا ہو' جیسے کوئی پھوڑا ہو جو نہ جلد سے باہر آ کر پھٹتا ہو اور نہ خون کے سفید خلئے اسے مارتے ہوں۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو برا بھلا کہتی اور اپنے جسم کو الزام دیتی کہ وہ خواہ مخواہ نفسانی خواہشات اور حرص و ہوس کا شکار رہتا ہے اور کبھی کوئی چیز اسے تسلی نہیں دیتی اور اس کے اندر بہت گہرائی سے ایک تلخی سی ابھرتی جو اسکے دل کو مسلنے لگتی۔

جیسے خدیجہ کی یادوں کے سامنے کا پردہ ہٹ گیا۔ اسے وہ باتیں یاد آنے لگیں جو

MashalBooks.com

پہلے کبھی یاد نہیں آئی تھیں۔ اسے وہ چیزیں دکھائی دینے لگیں جو پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ کتنی مرتبہ اشموی اچانک کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا۔ رات کو بھی وہ میٹنگ کا کہہ کر گھر سے چلا جاتا۔ کتنی راتیں وہ اپنے بستر پر پڑی کروٹیں لیتی رہی اور وہ پڑا خراٹیں لیتا رہا۔ جب وہ اسے خوش کرنے کے لئے اس کے پاس آتا تو ہمیشہ ناکام ہو جاتا۔ شاید اس نے کبھی خدیجہ کو خوش نہیں کیا۔ خدیجہ نے اسے بھی بیوقوف بنایا اور خود بھی بیوقوف بنی۔ مگر اس کے بدن نے اکثر اس کے ساتھ دھوکا کیا۔ وہ اس سے چمٹا رہا کہ کسی طرح وہ سکون حاصل کرے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور اس کے بدن کی خواہش بڑھتی ہی رہی۔ وہ اسی طرح اکڑا رہتا تھا۔ اس تشنج سے اسے کوئی چیز آزاد نہیں کرسکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ تھک کر گر جائے اور ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح پھڑ پھڑاتا رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی کپکپی کم ہو اور پھر وہ بے حس وحرکت پڑ جائے۔

اشموی ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ وہ حرکت کیوں کرے؟ اس نے اکثر کوشش کی، کچھ کرنے کی کوشش کی مگر اب وہ جان گئی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اس کے پاس آئی تھی۔ اس لئے اب اسے نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ وہ عورت ہے اور اشموی مرد۔ کچھ بھی ہو جائے وہ مرد اور عورت ہی رہیں گے۔ محض مرد ہی نہیں، بلکہ باعزت سرکاری ملازم اور اٹارنی کے دفتر میں ڈائریکٹر۔ وہ دن میں کسی وقت بھی اس کے دفتر جاتی تو اپنی آنکھوں سے خود دیکھتی کہ دفتر کا ہر چھوٹا بڑا شخص اشموی کے ساتھ جھک کر ملتا ہے اور کس طرح جنرل ڈائریکٹر اٹارنی سے ملنے کے لئے اس سے اجازت طلب کرتے ہیں اور کس طرح وہ کسی کو بھی ٹیلی فون پر بلا لیا کرتا ہے۔ اشموی نے جب ٹیچرز ٹریننگ کالج سے فراغت حاصل کی تو اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ استاد بن جاتا یا کسی ڈائریکٹر کا پرائیویٹ سیکریٹری بن جاتا۔ اس نے استاد بننے سے انکار کر دیا۔ انسان اگر ایک بار استاد بن جائے تو وہ ہمیشہ استاد ہی بنا رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہیڈ ماسٹر بن جاتا ہے۔ کسی ڈائریکٹر کے ساتھ اسی طرح اپنے آپ کو منسلک کرنا جس طرح جوئیں کھوپڑی کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں ایسا کام ہے جس سے ترقی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے جو لوگ بھی وہاں آئے تھے وہ کسی نہ کسی اہم افسر کے ساتھ منسلک تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے زیادہ اور کس کے تعلقات ہو سکتے ہیں؟۔

اشموی ان لوگوں میں سے تھا جو پرائیویٹ سیکریٹری بننے کے لئے ہی پیدا ہوا

ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی ذاتی شخصیت نہیں ہوتی' کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی' کوئی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ ان کا تو اپنا کوئی ذاتی جسم بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایسا شفاف شیشہ ہوتے ہیں جس میں دوسری شخصیت جھانکتی نظر آتی ہے یا ایسا آئینہ جس میں دوسرے کا عکس نظر آتا ہے۔ ہمیشہ دوسرے کی ہی شکل۔ دوسرے کی شکل جو اصل شکل پر سپرامپوز ہوتی ہے اور اصل شکل کہیں نہیں ہوتی۔

اشموی نہیں جانتا تھا کہ پرائیویٹ سیکریٹری کا اصل کام کیا ہوتا ہے۔ بس اسے خیال تھا کہ اسے باڈی گارڈ کا کردار ادا کرنا ہے' اپنے جسم کو ڈائریکٹر کے لئے فولادی ڈھال بنانا ہے' پہلے ڈائریکٹر کے لئے پھر چیف اٹارنی کے لئے۔ اپنے آپ کو اپنے افسر اور عوام کے درمیان دیوار بنانا ہے' اجلاسوں میں اپنے افسر کے اردگرد رہنا ہے' اس کے دفتر کو ایسی چھلنی بنانا ہے جس کے چھیدوں میں سے سوائے خاص سائز اور وزن کے لوگوں کے باقی سب چھن کر نکل جائیں۔ پرائیویٹ سیکریڑی کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کے لہجے سے ہی انہیں پہچان لیں۔ وہ دفتر میں داخل ہوں تو ان کی چال سے پہچان لیں' جس انداز سے وہ سگریٹ اپنے منہ میں رکھیں اس سے پہچان لیں' وہ جس انداز سے بات کریں' خاص طور سے جب وہ اٹارنی کا ذکر کریں۔ جیسے جب وہ ''مجید بیگ'' کہیں تو پتہ چل جائے کہ وہ برابر کی سطح پر بات کر رہے ہیں یا اعلیٰ اور ادنیٰ کی سطح پر۔ بعض اوقات وہ مجید بیگ نہیں کہتے بلکہ پروفیسر مجید کہتے ہیں اور کچھ تو اپنی بے تکلفی ظاہر کرنے کے لئے صرف مجید کہتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن پر خاص توجہ دینا ضروری ہے اور اشموی اس میں طاق ہو گیا تھا۔ تجربہ سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کا کام بندھی ٹکی باتوں تک ہی محدود ہے جو بندھی ٹکی تو ہیں لیکن اہم بھی بہت ہیں۔ چیف اٹارنی کے دفتر کے باہر دو چپڑاسی ہر وقت بیٹھے رہتے ہیں۔ چیف اٹارنی جب دفتر آنے والا ہوتا ہے یا دفتر سے باہر نکلنے والا ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی ان دونوں کے پیروں میں کھجلی ہونے لگتی ہے اور وہ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو کر سلام کے لئے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ چیف اٹارنی دفتر سے اٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے پہلے دروازے پر اس کی کار موجود ہوتی ہے' اور جیسے ہی چیف اٹارنی کا گنجا سر نظر آتا ہے ڈرائیور فوراً بائیں ہاتھ سے اس کے لئے دروازہ کھولتا ہے اور دایاں ہاتھ سلام کے لئے اٹھاتا ہے۔

چیف اٹارنی کے دفتر میں دوسرے اور بھی ایسے تھے جن پر اشموی کو توجہ دینا پڑتی

تھی اور جن پر اس نے پوری طرح قابو پالیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ افسر کے کسی بھی عضو کے حرکت کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس کے لئے افسر کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً وہ سمجھتا تھا کہ سر کو جھٹکا دینے کا کیا مطلب ہے۔ سر کو جھٹکا دینا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ ہر جھٹکے کا الگ مطلب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جھٹکے کا مطلب ہوتا کہ اشموی کسی آنے والے شخص کے سامنے بیٹھا رہے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے اور سر کو دوسری طرح جھٹکا دینے کا مطلب ہوتا کہ اشموی باہر چلا جائے۔

اشموی ان معاملات کا ماہر ہو گیا تھا۔ جب ڈائریکٹر کے دفتر سے ڈائریکٹر جنرل کے دفتر میں اور پھر چیف اٹارنی کے دفتر میں اس کا تبادلہ کیا گیا تو اسے کچھ سیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ہر دفتر میں کام ایک ہی قسم کا تھا۔ پرائیویٹ سیکریٹری کی سلطنت ہر جگہ ایک ہی جیسی تھی۔ ملازموں کے طور طریقے بھی ایک ہی تھے' افسر اور ماتحت کے تعلقات بھی ویسے ہی تھے حتیٰ کہ اعلیٰ افسر کی شخصیت بھی بالکل وہی تھی۔ وہ اپنے افسر کے سامنے عاجزی سے پیش آتا اور اپنے ماتحتوں کے سامنے شیر بن جاتا۔ ہر ملازم اپنے مرتبہ کے اعتبار سے ''بیگ'' (صاحب) کہتے ہوئے ایک خاص لہجہ اختیار کرتا۔ اسی طرح ہر ملازم کا اپنے ہاتھ میں فائل پکڑنے کا اپنا انداز ہوتا۔ اشموی ہر شخص کو اس کے لہجے' اس کے انداز اور حرکات وسکنات سے پہچان لیتا کہ اس کا عہدہ کیا ہے۔

اشموی نے ایک اور بات بھی سیکھی تھی کہ مہارت سے زیادہ کوئی اور چیز بھی اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے فرمانبرداری اور حکم کی تعمیل۔ خواہ وہ حکم سرکاری ہو یا ذاتی۔ اس کا ایک افسر اسے ہر صبح اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے کے لئے بھیجتا۔ دوسرا اپنی بیگم کے ساتھ اسے بازار بھیجتا۔ ایک اور ڈائریکٹر اسے گوشت خریدنے کے لئے بازار بھیجتا۔ ایک افسر نے تو اسے ہدایت کی کہ وہ شطرنج سیکھے تاکہ فارغ وقت میں اس کے ساتھ کھیل سکے۔ اب جہاں تک اٹارنی کا تعلق ہے اسے کچھ عجیب سے شوق ہیں۔

چیف اٹارنی ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اندر مردانگی دوسروں سے زیادہ ہی ہے۔ ممکن ہے اسے اس کا پورا یقین نہ ہو لیکن وہ ہر وقت مردانگی ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہ یہ تو نہیں جانتا کہ کس طرح اپنی طاقت ثابت کرے لیکن اس کے سامنے جب بھی کوئی آتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اسے کسی طرح مرعوب کر لے۔ رعب ڈالنے کا مطلب عام رعب ڈالنا ہی نہیں ہوتا جیسا کہ افسر ماتحت میں ہوتا ہے بلکہ وہ

چاہتا ہے کہ ہر شخص کو ذہنی اور جسمانی طور پر نیست و نابود کر دے۔ تا کہ وہ اس کے سامنے گڑگڑاتا ہی رہے۔

اس کے پاس رعب جھاڑنے کے کئی طریقے ہیں۔ کبھی تو وہ نرمی سے اپنا کام بنا لیتا ہے اور کبھی خالص وحشیانہ طریقے سے۔ کبھی اتنی شرافت برتتا ہے کہ وہ شخص اس کا غلام بن جاتا ہے' کبھی وہ کسی شخص پر اتنا مہربان ہوتا ہے کہ اس پر نوازشات کی بارش کر دیتا ہے۔ اسے آرام طلبی کی عادت ڈال دیتا ہے' اس کے کولہے کار کی نرم گرم نشست کے عادی ہوتے ہیں اور اس کی بیوی کو آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ پھر اچانک اٹارنی اسے بلندی سے نیچے پھینک دیتا ہے۔ اسے اسی مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں سے اسے اوپر اٹھایا گیا تھا۔ وہ پرانی تنخواہ پر آ جاتا ہے' بغیر سوٹ کے خالی قمیض پتلون پہنتا ہے' بسوں میں ٹھس ٹھسا کر سفر کرتا ہے۔ میٹنگ میں شرکت سے محروم ہو جاتا ہے۔ حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرتا ہے۔ پورے وقت پر دفتر سے جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ان چار آدمیوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھتا ہے جس میں کوئی ٹیلی فون اور چپڑاسی تک نہیں ہوتا۔

اشموی ان تمام حالات سے گزرا تھا اور اس نے سیکھ لیا تھا کہ خوشامد اور طاقت کے سامنے جھکانے سے وہ کس طرح بہت زیادہ فائدے اٹھا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو عزت اور طاقت حاصل ہوتی ہے بہر حال ان کی کوئی حقیقت بھی ہوتی ہے۔ اس نے کبھی کسی ایسے غریب آدمی کے اندر ایسی خصوصیات نہیں دیکھیں جس کے پاس کوئی اختیار نہ ہو۔ جب وہ خوشامد کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس طرح اس نے کچھ کھویا نہیں ہے۔ اگر کبھی اس کے دل میں کوئی خلش بھی ہوتی کہ اس نے کچھ کھو دیا ہے تو وہ اتنی معمولی سی ہوتی کہ بس ایک چبھن بن کر رہ جاتی۔ خوشامد کے لئے اس نے اپنے حقوق کی جو قربانی دینا شروع کی تھی وہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی کہ اب اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اشموی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ جو ہوا ہے وہ کبھی ہو بھی سکتا تھا۔ جب تک یہ واقعہ نہیں ہوا اس وقت تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ صرف وہ خود ہی جانتا ہے۔

اگر خدیجہ کی نظروں سے اس کی نظریں نہ ملتیں تو ممکن تھا کہ یہ واقعہ بھی دوسرے اور واقعات کی طرح یونہی گزر جاتا۔ لیکن جونہی اس کی نگاہیں خدیجہ کی نگاہوں سے ملیں

اس کے سامنے ایک پردہ سا گر گیا جیسے وہ سوتے سے جاگ گیا ہو اور اس واقعہ کے خوفناک نتائج اس پر آشکار ہو گئے ہوں۔ اس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اس نے اپنی بہت بڑی چیز ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کا ایک حصہ دیدیا ہے اور وہ خود کچل کر رہ گیا ہے۔ یہ کسی ایک چیز کا وزن نہیں تھا جس نے اسے کچلا تھا۔ یہ صرف چیف اٹارنی کا وزن نہیں تھا بلکہ ان تمام ڈائریکٹروں اور افسروں کا وزن تھا جن کے ماتحت اس نے کام کیا تھا۔ یہ ان سب کے موٹے تازے جسموں کا بوجھ تھا۔ یہ ان کے بڑے بڑے دفتروں' ایرانی قالینوں' سیاہ اور رنگ برنگے ٹیلی فونوں' ان کی لمبی سیاہ موٹر کاروں' ان کی سرخ روشنیوں' کمخواب کے پردوں میں ڈھکے ان کے دروازوں' سرخ قالین سے ڈھکی سفید سنگِ مرمر کی سیڑھیوں' موٹے سنہری فریموں سے جڑی تصویروں سے آراستہ موٹی دیواروں' ان کی موم بتیوں آئینوں' ہیٹروں' دھوئیں سے بھرے بالوں' ایش ٹرے' فانوسوں' فائلوں' شیڈوں' گریڈز' خفیہ رپورٹوں' سوٹوں اور انعاموں کا بوجھ تھا۔ یہ سب ملے تھے تو ان کا ایک وزن اور ایک بوجھ بن گیا تھا جو اس کی طرف منتقل ہو گیا تھا اور اس نے اس کے ناتواں جسم کو لوہے کی چادر یا سگریٹ کے کاغذ کی طرح کچل دیا تھا۔

خدیجہ ابھی تک اشموی کو گھور رہی تھی جو اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ اس نے قالین میں منہ چھپائے چھپائے اپنا منحنی جسم اس میز کے ساتھ پھیلایا جو آدھی دیوار تک اونچی تھی۔ میز پر شیشہ رکھا تھا جس کے نیچے ہرا فلیٹ کپڑا پڑا تھا۔ اس کے اوپر دیوار پر ایک بڑا سا طغرہ ٹنگا تھا۔ اس پر لکھا تھا...... ''ہم نے تم میں سے کچھ لوگوں کو دوسروں سے زیادہ بلند مرتبہ دیا ہے۔'' میز کے پیچھے ایک اونچی چمڑے کی کرسی تھی۔

خدیجہ کو اس وقت تک احساس نہیں ہوا تھا کہ کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ لیکن اس نے ایک عجیب سی آواز سنی' جیسے سسکیاں دبائی جا رہی ہوں' پھر یہ سسکیاں بلند ہوتی گئیں اور ایسی ہو گئیں جیسے کوئی عورت بین کر رہی ہو۔ اشموی سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ خدیجہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے لگا جیسے اس نے جو دیکھا ہے وہ بھول چکی ہے' جیسے اس نے اپنے آپ کو اشموی کے پاس بیٹھا ہوا پایا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی' اپنے شوہر کے آنسو پونچھ رہی تھی' ایک مرد کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جو بھی ہوا بہرحال اشموی اس کا شوہر اس کا مرد ہے۔ اس کے آنسو چھری کی طرح اس کے دل پر لگ رہے تھے۔ جو بھی ہوا بہرحال وہ اشموی ہے' اس کی زندگی میں آنے

والا پہلا مرد۔ ایک ہی چھت کے نیچے دس سال گزارے ہیں انہوں نے، دس بہترین سال اور غموں سے زیادہ خوشیاں ہی ملی ہیں انہیں۔ ''اٹھو اشموی اٹھ جاؤ'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اشموی کے کپڑے اکٹھے کرنے لگتی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے کپڑے پہنائے ہیں۔ اسے وہ سوٹ پہنایا ہے جس کی وجہ سے ہی گاؤں کے سارے نوجوانوں میں اس نے اسے ہی اپنے لئے چنا تھا۔

MashalBooks.com

وہ خچر نہیں تھا

وہ بیہوش نہیں تھا' اسے احساس تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ سکتا تھا اور پوری طرح سن بھی سکتا تھا بلکہ پہلے سے زیادہ ہی سن سکتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی حرکت نہ تھی' جیسے وہ سانس بھی نہیں لے رہا ہو کیونکہ اس کے سینے میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چوری چوری سانس لے رہا تھا۔ چوری چوری کیسے سانس لیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے پھیپھڑے سانس اندر کھینچیں اور باہر چھوڑیں اور کسی قسم کی حرکت یا آواز نہ ہو؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے سینے میں ہوا داخل ہو اور پھر باہر نکلے اور ناک کا ایک بال تک نہ ہلے؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے بہت سے کام ایسے کرنا شروع کر دیئے تھے جن کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسے کر رہا ہے۔ اس کے جسم کے بعض حصوں نے کسی تربیت یا ورزش کے بغیر خود بخود ہی عجیب و غریب قسم کی نئی طاقت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن اسے پتہ چلا کہ وہ انتہائی اونچی دیوار بھی پھلانگ سکتا ہے' اس نے چھلانگ لگائی تو بہت ہی اونچی چھت پر جا لگا۔ سلاخوں کے ساتھ جا کر اٹک گیا پھر اس نے اپنے ہاتھوں کی پوری طاقت سے جسم کو اوپر اٹھایا اور سوراخوں میں سے نظر آنے والے عجیب و غریب چوکور آسمان کو دیکھنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بعض آوازوں' بعض نظروں اور اشاروں پر اس کا جسم کیوں سخت ہو جاتا ہے۔ یا کیوں نرم پڑ جاتا ہے' یا بے سدھ ہو جاتا ہے یا اچانک نظروں سے غائب ہو کر پھر سامنے آ جاتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس طرح ضرورت کے

MashalBooks.com

وقت اس کے جسم میں کوئی نیا عضو پیدا ہو جاتا ہے جیسے امیبا یا ایک خلئے والا کوئی جانور...... کسی کو یقین بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اس کا جسم جسے وہ بیس سال سے اس طرح لئے پھر رہا تھا اور جس کے حجم اور وزن سے وہ اچھی طرح واقف تھا اس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو جائے گا جیسے وہ اس کا جسم ہی نہ ہو۔ کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے اپنے دانتوں میں خط دبایا اور پوری قوت ارادی کے ساتھ یہ سوچ کر گارڈ کے سامنے سے گزرا کہ گارڈ اسے بالکل نہیں دیکھے گا اور گارڈ نے واقعی اسے نہیں دیکھا۔

اس کے لئے اس میں حیرت کی بات نہیں تھی کہ وہ سانس لے رہا تھا اور اس کا سینہ اوپر نیچے نہیں ہو رہا تھا اور اس کی ناک کا ایک بال بھی نہیں ہل رہا تھا۔ اس کے لئے زندہ رہنے کا یہی طریقہ تھا۔ کیونکہ جیسے ہی اس کا سینہ اوپر نیچے ہونا بند ہوا اور اس کی ناک کے بالوں کی لرزش تھمی تو وہ کرخت آواز بھی بند ہوگئی جو فضا میں گونج رہی تھی اور وہ آواز کسی ایسی چیز سے ٹکرائی تھی جو گوشت کی طرح نرم تھی اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی سنسنی کا احساس بھی ہوا تھا جسے وہ جانتا تھا۔ وہ زیادہ تکلیف دہ درد نہیں تھا بلکہ وہ تو درد ہی نہیں تھا صرف کھینچنے اور دھکیلنے کا سا احساس تھا۔ یہاں بھی اس کے جسم نے عجیب سی طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کا جسم درد سے بے نیاز اور بے حس ہو چکا تھا۔ یوں لگا جیسے جو چھڑی ہوا میں شوں کر کے اٹھی اور پھر نیچے گری وہ اس کے جسم پر نہیں پڑی بلکہ کسی ایسے جسم پر پڑی جو اس سے الگ بھی تھا اور اس سے قریب بھی' اتنا قریب کہ وہ کوئی دوسرا جسم ہو ہی نہیں سکتا تھا' وہ اس کا اپنا جسم ہی ہوسکتا تھا۔ اس شک وشبہ اور الجھن میں درد بھی ایسا مشکوک اور مبہم ہو گیا کہ اس میں دوسرے ہی احساسات شامل ہو گئے جیسے خوشی اور سرور کے احساسات۔ اسے لگا جیسے وہ خوش ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ہنسے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ سارجنٹ ہی واحد شخص ہے جو تھکن سے ہانپ رہا ہے۔ سارجنٹ اس سے ایک قدم دور کھڑا ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے اتنی محنت اور اتنی مشقت کی تھی کہ اس کے منہ سے سانس بھی ایسے نکل رہا تھا جیسے وہ ہانپ رہا ہو۔ سارجنٹ نے لمبا سا سانس لیا جو ہانپتا ہوا اس کے سینے سے باہر نکلا۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا' اس کے ہونٹ نہیں ہلے' اس نے سینے کو حرکت دیئے بغیر سارجنٹ کو اس شیطانی جذبہ کے ساتھ دیکھا جس کی وضاحت طب کی کتابوں میں نہیں مل سکتی۔ ڈاکٹر بھی انسانی جسم سے کتنے بے خبر ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ جسم گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہے جو پانچ بے اثر حواس کے قابو میں رہتا ہے۔ کیا وہ ان نئے حواس اور نئے اعضاء کے

بارے میں جانتے ہیں جو اچانک اگ آتے ہیں؟ بھلا وہ کیسے جان سکتے ہیں۔ وہ تو اس تجربے سے ہی کبھی نہیں گزرے جس سے وہ اس وقت گزر رہا ہے۔

اس نے دیکھا کہ سارجنٹ سیدھا ہوا' اپنے بازو پھیلائے' دو تین بار چھڑی ہوا میں لہرائی اس کی موٹھ اپنے ہاتھ پر ماری اور پھر مٹھی بھینچ کر اس کے سر پر وار کرنے کے لئے چھڑی اوپر اٹھائی۔ آفیسر علوی چھوٹے قد کا موٹا اور گورا چٹا آدمی تھا۔ اسکے اوپر کے ہونٹ پر ایک نالی سی بنی ہوئی تھی جو اس کے منہ اور ناک کے درمیان نہر کی طرح نظر آتی تھی۔ بالکل ماں کے پیٹ میں پلنے والے پہلے مہینے کے بچے کی طرح جس کے جسم کے مختلف اعضاء ابھی الگ الگ ہونا شروع نہ ہوئے ہوں۔ اس کے کانوں میں عجیب سی آواز آئی۔ وہ بتا نہیں سکتا کہ وہ آواز منہ سے نکلی تھی یا ناک سے...... کہاں ہے وہ پرنٹنگ پریس؟ ......گدھے کے بچے؟ ...... بول' بولتا کیوں نہیں۔ چپ رہنے سے تجھے کچھ نہیں ملے گا......اب اس کی ساری طاقت اور قوت مزاحمت اس کے ہونٹوں میں مرکوز ہوگئی اور اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا جیسے اس کے پاؤں پھیل گئے ہوں۔ اس کے ہونٹ دو باریک سی لکیروں میں تبدیل ہونے لگے تھے کہ یکدم اس نے انہیں سختی سے بھینچ لیا۔

کرخت باریک آواز اس کے دماغ میں گونجی۔ وہ بول نہیں سکتا تھا اس لئے نہیں کہ وہ بولنا نہیں چاہتا تھا یا اپنی زبان ہلانا بھول گیا تھا یا اس کی یادداشت جاتی رہی تھی اور یہ بھول گیا تھا کہ وہ پرنٹنگ پریس کہاں ہے یا وہ کسی اصول یا وعدے کی پابندی کر رہا تھا کیونکہ اسے تو انسانی معاملات اور انسانی جذبات یاد ہی نہیں رہے تھے' بلکہ وہ تو انسان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی مخلوق بن گیا تھا جس کا کوئی اور جسم تھا اور کچھ اور ہی اعضا تھے۔ وہ بات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس میں منہ کھولنے اور یہ کہنے کی طاقت تھی کہ ''ہائی اسٹریٹ نمبر ۶'' اس کے حافظے میں یہ الفاظ واضح طور پر محفوظ تھے۔ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ واضح۔ بلکہ اس کے حافظہ میں اور کچھ تھا ہی نہیں وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اپنے مکان کا نمبر' اپنی سڑک کا نام' یا یہ کہ اس کی ماں کی کیا شکل ہے یا پھر علم طبقات الارض کیا ہوتا ہے جسے پڑھنے میں اس نے برسوں لگائے تھے۔ اس کے حافظے نے ساری چیزوں سے اپنا برتن خالی کر لیا تھا۔ اب اس میں صرف ایک ہی چیز رہ گئی تھی۔ ہائی اسٹریٹ نمبر ۶۔

باریک کرخت آواز اس کے دماغ میں پھر گونجی۔ اس نے دماغ کے خلا میں

عجیب سی گونج پیدا کی۔ وہ آواز اس طرح پھیلی جیسے خالی گنبد میں لاؤڈ اسپیکر سے گونج پیدا کی گئی ہو۔

کہاں ہے وہ پرنٹنگ پریس، گدھے کے بچے؟ بول، نہ بولنے سے تجھے کیا مل جائے گا؟ خاموش رہنے سے اسے کیا ملے گا؟ آفیسر علوی یہ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو اسے مار مار کے ادھ موا کرنا ہی جانتا تھا، وہ جان بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی دماغی نشو ونما میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا اس کے چہرے کے خلئے بڑھنا بند ہو گئے تھے بلکہ اس لئے کہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جسے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی اسے نہ سمجھتا اگر وہ اس حیرت انگیز لمحے میں زندہ نہ ہوتا جب اس کا جسم اور اس کی ذات ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مرنے کو تیار نہیں ہے۔ ایک ایسا لمحہ جب آپ کا جسم آپ کی ذات سے دور ہو، اتنا زیادہ دور بھی نہیں بلکہ ایک بال برابر فاصلہ ہو ان دونوں کے درمیان۔ ایسے موقع پر آپ کو اپنے جسم کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ آپ کا جسم ہی نہیں ہوتا، اس کا درد آپ کا درد نہیں ہوتا اور اس کی بقا آپ کی بقا نہیں ہوتی۔ اس لمحے کے ایک چھوٹے سے حصے میں زندہ رہنے کا جذبہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ جو زیادہ بڑا ہوتا ہے اسے آپ پورا جسم سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس کا اور کوئی حصہ نہیں ہے لیکن دوسرا حصہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا وہ بھی اتنا ہی آپ سے قریب ہوتا ہے جتنا آپ کا جسم۔ چنانچہ اس طرح یہ حیرت ناک واقعہ پیش آتا ہے۔ آپ کے گرد جو خول ہے آپ اس میں سے اپنی ذات کے خول میں داخل ہو جاتے ہیں اور بقا کی جتنی بھی قوت ہے وہ آپ کے اندر مجتمع ہو جاتی ہے۔ آپ کا جسم وہاں موجود ہوتا ہے، وہ آپ سے زیادہ دور نہیں ہوتا، برہنہ، بے حس وحرکت، لیٹا ہوا، سردی گرمی سے بے نیاز، اسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ اس پر جو چوٹیں پڑ رہی ہیں وہ تھپڑ ہیں، گھونسے ہیں یا ٹھوکریں ہیں۔ اس کے لئے ہر چیز یکساں ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی دباؤ جو محسوس ہوتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔ جیسے اوپر سے فضا کا یا نیچے سے زمین کا دباؤ پڑتا ہے۔

اس لمحے میں جسم کی بقا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ زندہ رہنا یا زندہ نہ رہنا ایک ہی چیز بن جاتا ہے۔ سب سے اہم آپ کی ذات ہوتی ہے، وہ سریش کی طرح ٹھوس لیکن نرم چیز جو آپ کی بقا ہوتی ہے، زندگی کی وہ ان جانی اور پراسرار بوند جو آپ کو اس حقیقت کے باوجود زندہ رکھتی ہے کہ آپ اپنے جسم کی موجودگی کا احساس کھو چکے ہیں، ایک ایسی بوند جو

اگر سوکھ جائے تو آپ کے اندر زندگی کا سوتا بھی خشک ہو جائے اور آپ مرجائیں خواہ آپ کا جسم ٹھوس رہے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ زندہ رہنے کا جذبہ۔اس ایک بوند میں مرتکز ہو جاتا ہے اور وہ ایک سخت خول بن جاتا ہے۔ایسا خول جس میں داخل نہیں ہوسکتا جیسے فولادی گھیرا جس کا منہ عجیب انداز سے بند کر دیا گیا ہو۔اس کے دونوں سرے ایسے پگھلائے گئے ہوں کہ وہ ایک دوسرے میں چھپ گئے ہوں۔یہ محسوس ہی نہ ہو کہ وہاں کوئی زندہ بھی تھا حتیٰ کہ اس منہ کا نشان تک نہ ہو۔لیکن کیا ماں کے پیٹ والے بچے کے ہونٹ والا افسر علوی اس کا تصور کرسکتا ہے؟ کیا وہ اس فولادی گھیرے کا تصور کرسکتا ہے جس کا کوئی منہ نہیں ہے اور جس میں اتنا موہوم سا خلا ہے جس میں صرف اور صرف ایک بوند رکھی ہوئی ہے' ایسی بوند جس میں اس کی ساری زندگی اور جھنجھوڑی ہوئی یادداشت پگھل گئی ہے؟۔صرف ایک بوند ایک قطرہ جو ایک چیز پر مرتکز ہو گیا ہے اور وہ ہے...... پرنٹنگ پریس۔

کہاں ہے پرنٹنگ پریس؟ بول' بولتا کیوں نہیں......کرخت آواز پھر وہی احمقانہ اور خالی خولی سوال دھرا رہی ہے۔گدھے کے بچے' چپ رہنے سے تجھے کیا مل جائے گا؟ عجیب سوال ہے' بلکہ اتنا عجیب کہ اس نے کبھی ایسا سوال ہی نہیں سنا۔ایسا سوال جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ایسا سوال جس کا جواب ساری وہ انسانی نسل بھی نہیں دے سکتی' جس نے لاکھوں سوالوں کے جواب دے دیئے ہیں' جس نے کائنات کے کروڑوں راز دریافت کر لئے ہیں۔وہ آج تک اس کا جواب نہیں دے سکتی۔جواب کے بغیر سوال خود کوئی سوال نہیں ہے۔ایسا سوال کہ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ سوال کیسے کیا جائے۔نہ یہ معلوم ہو کہ وہ کیا سوال کر رہا ہے۔پوری طرح یہ علم بھی نہ ہو کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔ہاں' وہ جواب جانتا ہے۔وہ جاننا نہیں جسے عام طور پر علم کہتے ہیں بلکہ ایک انجانا علم جو درحقیقت بے خبری جیسا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر کسی جگہ ایک ایسا گوشہ ہے جہاں زندگی مرتکز ہے' ایک ایسا نقطہ ارتکاز' چھوٹا سا' سخت غیر مرئی جو غالباً وہاں بالکل موجود نہیں ہے پھر بھی اس کے جسم میں کہیں موجود ہے اور واضح ہے۔نہیں' اس کے جسم میں نہیں بلکہ اس کی ذات میں کسی جگہ جسے بلامقصد وہ جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے' سراب کی طرح جو سراب نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور جو اس کی ذات کا اظہار ہے۔وہ ایسی نازک حقیقت

MashalBooks.com

ہے جیسے ایک چھوٹا سا ذرہ جس سے وہ ہمیشہ باخبر رہتا ہے' جسے وہ اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے' جس کے گرد وہ اپنی بانہیں ڈالے رکھتا ہے' اسے اپنی بانہوں میں لیتا ہے تاکہ دوام حاصل کر سکے۔ کیونکہ وہی اس کی زندگی کا راز ہے' اس کی بقا اور وجود کا راز ہے۔ وہ اسے جانتا ہے اور اپنے آپ کو بھی جانتا ہے اور وہ اس سے اتنا ہی بے خبر سے جتنا وہ خود اپنے آپ سے بے خبر ہے۔

پرنٹنگ پریس کہاں ہے؟ بول گدھے کے بچے۔ خاموش رہنے سے تجھے کیا ملے گا؟...... تیز اور کرخت آواز اب زیادہ کرخت ہوگئی ہے۔ اس کے اپنے گرد خول اور بھی موٹا اور سخت ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کی بوند زیادہ محفوظ' زیادہ پاک' زیادہ شفاف اور اتنی صاف ہوگئی ہے کہ اس میں حروف واضح طور پر پڑھے جا سکتے ہیں۔ ہائی اسٹریٹ نمبر ۶۔ حروف سیسے کی طرح چمک رہے ہیں' ایک دوسرے میں جڑے ہوئے' وہ جلی اور مخفی ہوتے جاتے ہیں' کبھی الگ ہو جاتے ہیں اور کبھی اکٹھے۔ کاغذ کی بو' پریس کے جوڑوں میں گھس گئی ہے' ایسی بو جو دوسری بو کی طرح آپ کے نتھنوں میں داخل نہیں ہوتی بلکہ جو ایک ایسے لفظ سے آپ کی کھوپڑی کی ہڈی توڑتی ہے اور آپ کے دماغ پر حملہ کرتی ہے جو لفظ آپ پڑھنے سے پہلے ہی جانتے ہیں۔ پریس آپ کے دماغ میں گھومتا ہے' سیسے کے حروف دانتوں کی طرح بجتے ہیں اور پھر لفظ پیدا ہوتا ہے۔ یہ محض لفظ ہے اور کچھ نہیں صرف لفظ۔ لیکن یہ ایسا نقطہ ہے جس سے تمام چیزوں کا آغاز ہوتا ہے' جس سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا اور وہ زندگی برسوں پر پھیلتی چلی گئی حتیٰ کہ وہ لمحہ آ گیا جسے وہ اس وقت جی رہا ہے۔ ایک لمبی ڈوری جو اس سریش جیسے نقطہ تک پھیلتی چلی گئی جس کے گرد اس کی ذات لپٹی ہے' محصور ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ۔

اب دھندلاہٹ کم ہوگئی ہے اب وہ اس لمبی ڈوری کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہے جو بال کی طرح باریک ہے' اور جو اس نقطہ سے شروع ہوتی ہے جس سے ہائی اسٹریٹ نمبر ۶ میں پریس چلتا ہے اور جو اس نقطے پر آ کر ختم ہوتی ہے جو اس کے اندر مقید ہے' دور تک پھیلے اس چٹیل بنجر صحرا میں جہاں سارجنٹ' اس کی مڑی ہوئی چھڑی اور آفیسر علوی اور اس کی کرخت آواز کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

''پریس کہاں ہے؟ گدھے کے بچے۔ بول۔ چپ رہنے سے تجھے کیا ملے گا؟''

سوال وہی تھا۔ مگر اب جواب انجانا نہیں رہا تھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جواب

جانتا ہے' یا اس کے لئے یہ بتانا ممکن ہے کہ وہ کیوں خاموش ہے' یا اس خاموشی سے اسے کیا فائدہ ہوگا' یا اس لمبی ڈوری کی کیا اہمیت ہے جو دو انجانے نقطوں کے درمیان تنی ہوئی ہے' اس میں سے ایک نقطہ خود اس نے اپنے اوپر مسلط کیا ہے اور دوسرا اس پر اسی طرح مسلط کر دیا گیا ہے جیسے اس کی اپنی ذات۔ مگر اسے پورا یقین ہے کہ پریس اب بھی ہائی اسٹریٹ کے مکان میں چل رہا ہے۔ اس کا پہیہ گھوم رہا ہے۔ اس کے سیسے کے حروف ایک دوسرے سے ٹکڑا رہے ہیں' کاغذ اس کے دانتوں کے درمیان سے گزر رہا ہے اور تیز بو دماغ میں گھس رہی ہے۔ کیا وہ اس کی بو سے معلوم کر لیں گے کہ پریس کہاں ہے؟ کیا وہ پریس کا چلنا بند کر دیں گے؟ کیا وہ اس کی وہ آنکھیں نکال لیں گے جن سے وہ صحرا کے دور افتادہ مقام اور ہائی اسٹریٹ کے درمیان طویل فاصلے کے باوجود اسے دیکھ سکتا ہے؟ کیا وہ نقطہ مٹا سکیں گے جس سے اس کی زندگی' اس کی زندگی کی لمبی ڈوری شروع ہوئی اور جس سے وہ اس کی زندگی کے اس نقطے تک پھیلی جو اس کے اندر مقید ہے؟

کیا بُو باہر آ سکتی ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سانس لینے یا جمائی لینے کے لئے منہ کھولا جائے اور ہونٹوں میں سے سانس کے ساتھ ہائی اسٹریٹ نمبر ۶ نکل جائے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس خیال نے ہی اسے جھنجھوڑ دیا کیونکہ اس کا وجود دو نقطوں میں سے ایک تھا۔ ان دو نقطوں کے درمیان وہ ڈوری تنی ہوئی تھی اور اس کی بقا اس ڈوری کی بقا تھی جو دو نقطوں کے درمیان تنی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی ضروری تھے کیونکہ ان میں سے ایک غائب ہو جانے کا مطلب تھا ڈوری کا ٹوٹ جانا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے کا بھی غائب ہو جانا۔

پرنٹنگ پریس کہاں ہے؟ گدھے کے بچے۔ بول۔ چپ رہنے سے تجھے کیا ملے گا؟

اب اسے معلوم ہوا کہ وہ کیوں خاموش ہے؟ وہ اپنے ہونٹ کیوں نہیں کھولتا' وہ جمائی لے کر سانس کے ساتھ ہائی اسٹریٹ نمبر ۶ کے الفاظ کیوں نہیں اگلتا۔ یہاں کسی اصول پر اڑ جانے یا کسی سے کئے ہوئے وعدے کو نبھانے کا سوال نہیں ہے کیونکہ یہاں کسی دوسرے کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کا اپنا جسم اس کے زیادہ قریب ہے جو اس کی ذات سے صرف بال برابر دور ہے۔ اس کا اپنا وجود نہیں ہے تو دوسروں کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ معاملہ اس کی ذات کا ہے' اس کی روح کا' اس کی روح کے زندہ رہنے یا نہ رہنے کا' لمبی تنی ہوئی اس ڈوری کے برقرار رہنے کا جو ہائی اسٹریٹ سے اس کی اس روح تک ہوا اور پانی لاتی ہے جو روح اس

کے خول کے اندر مقید ہے۔ یہاں جسمانی بقا کا مطلب جسمانی بقا نہیں ہے کیونکہ جسم میں تو کوئی حس ہی نہیں ہے۔ یہاں بقا دوسری قسم کی ہے۔ یہاں بقا سے مراد اس ڈوری کی بقا ہے جو دو نقطوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔ وہ ڈوری کیا ہے؟ اور وہ دو نقطے کیا ہیں؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا۔

اب اس نے کرخت منحنی آواز نہیں سنی۔ یقیناً آفیسر علوی نے اپنے گلے کو آرام دینے کے لئے خاموشی اوڑھ لی ہے۔ اس نے سارجنٹ کے بھاری قدموں کی آواز سننا شروع کی۔ فرش سے لوہا ٹکڑا رہا تھا۔ اس نے ہوا میں چھڑی لہرانے کی آواز سنی، تھوڑا وقفہ ہوا اور پھر وہ چھڑی کسی ٹھوس مگر نرم چیز سے ٹکرائی جیسے گوشت، لیکن یہ گوشت نہیں تھا، کم سے کم اس کا گوشت نہیں تھا بلکہ کسی اور کا گوشت تھا جو اس سے بہت دور تھا، اس سے بال برابر فاصلے پر، جدا مگر بہرحال فاصلے پر، جو اسے پٹنے والے گوشت سے الگ کر رہا تھا۔ اگر وہ خچر ہوتا تو اب تک مر گیا ہوتا۔ مگر وہ خچر نہیں ہے۔ وہ انسان ہے جس کا اپنا دماغ ہے جو یہ جانتا ہے کہ کیسے سوچا جاتا ہے اور طاقت پر کیسے غالب آیا جاتا ہے اور آخر میں کیسے فتح حاصل کی جاتی ہے...... کیسے جیتا جاتا ہے...... کیسے......

وہ صرف ایک مقید نقطہ ہے، آزادی کے ساتھ ہوا میں اڑنے والا نہیں۔ وہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتا اور ایٹم کی طرح پھٹ نہیں سکتا۔ وہ تو موٹے سخت خول میں بند ہے جس کا کوئی منہ نہیں ہے۔ کس طرح جیتا جائے؟ کس زبردست چور چور کر دینے والی طاقت کے ساتھ جیتا جائے؟ اس قسم کی طاقت پر وہ مشکل سے ہی اعتبار کرتا ہے اور مشکل سے ہی اپنی خوشی اور اپنا غرور چھپا سکتا ہے۔ مگر کیسا غرور؟ وہ تمام رکاوٹوں کے باوجود جیتنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اپنا منہ بند رکھنے اور کچھ نہ بولنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ وہ پریس چلانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ وہ ہائی اسٹریٹ اور دور افتادہ صحرائی مقام کے درمیان تنی ڈوری میں زندگی دوڑانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ وہ فاتح ہے وہ خوش ہے۔ پھر اس کا ناچنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

منحنی آواز پھر آتی ہے۔ وہ اپنے فولادی ہونٹوں کو ایک دوسرے میں دبا کر بند کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ آری سے اس کا منہ کھولتے ہیں تو اسکے منہ سے ایک ذرہ بھی باہر نہیں نکلے گا کیونکہ اس کا حلق بھی بند ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہوا کی آمد و رفت کے بغیر خول کے اندر وہ کیسے سانس لے سکتا ہے۔

تجھے خاموش رہنے سے کیا ملا؟ کوڑھ مغز؟ تیرے ساتھیوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہائی اسٹریٹ نمبر۶۔ یہ وہی کرخت منمنی آواز ہے۔ وہی جس کی ناک اس کے منہ میں کھلتی ہے' وہی جس نے ہائی اسٹریٹ نمبر۶ کہا ہے۔ وہی جس کی آواز منمنی ہے۔

وہ نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ کیا وہ آواز دھماکے کی طرح اس کے دماغ میں گونجتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا سا پھولا ہوا غبارہ پھٹ گیا ہو' جیسے لمبا تنا ہوا تار اچانک ٹوٹ گیا ہو۔ اب وہ سارجنٹ کو نہیں دیکھ رہا ہے' اب منمنی آواز اسے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اب اسے کوئی سنائی یا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ سارجنٹ کی کھردری انگلیاں بھی محسوس نہیں کرتا جو اس کے پیر پکڑ کر اسے گھسیٹ رہی ہیں۔ کون جانے وہ اسے گھسیٹ کر کہاں لئے جا رہا ہے۔

سب سے بڑا جرم

جو صاحب بھی میری یہ کہانی پڑھ رہے ہیں میں ان کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں بلکہ شاید آپ سب سے زیادہ بے گناہ ہوں۔ مرنے کے بعد مجھے اپنی بے گناہی کا یقین آیا ہے (جی ہاں' میں مر چکا ہوں اسی لئے آپ کے ڈر کے بغیر میں اپنی بات کہہ رہا ہوں) میں بچے کی طرح معصوم تھا...... جس کا مطلب یہ ہے کہ (اگر آپ کی یادداشت صحیح ہے) میں آپ کی نظروں میں بے گناہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو اس وقت بھی آج بھی بچے کی طرح معصوم سمجھتا ہوں۔ کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ جب وہ بچہ تھا تو اس کے دماغ میں کس قسم کے خیالات آتے رہتے تھے۔ جب میں دنیا میں تھا تو میں بھی آپ کی طرح ہی تھا۔ ہم جب بڑھے ہو جاتے ہیں تو اپنا بچپن بھول جاتے ہیں اسی طرح جیسے جب ہم جاگتے ہیں تو اپنے خواب بھول جاتے ہیں۔ بھولنے کا یہ عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ بچپن میں ہم ایسے کام کرتے ہیں جو ہمیں بڑے ہو کر پریشان کرتے ہیں جیسے خواب میں ہم ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں جو جاگنے پر شرمندہ کرتی ہیں۔

لیکن اب میں آپ کی طرح نہیں رہا۔ موت کے تجربے نے مجھے ایسا غیر انسانی حوصلہ عطا کیا ہے کہ اب مجھے اپنی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے اور ایک دور کو دوسرے دور سے الگ کرنے کے لئے کوئی بھاری دیوار کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی زندگی کے ان الگ الگ حصوں اور ٹکڑوں کے بارے میں مجھے اس وقت احساس ہوا جب میں دنیا سے چلا آیا۔ آپ لوگوں نے اپنی زندگی کا جو تماشہ بنا رکھا

ہے اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ واقعی یہ عجیب وغریب تماشہ ہے جیسے کسی انسان کا سر کاٹ لیا گیا ہو، اسکی ٹانگیں بھی جسم سے علیحدہ کر لی گئی ہوں اور صرف اس کا بیچ کا دھڑ رہ گیا ہو۔ لیکن میرے لئے یہ ایک ڈراؤنا منظر بھی ہے۔ اس سے مجھے ٹرین کا حادثہ یاد آجاتا ہے جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ ریل گاڑی کے پہیئے کے نیچے سے ایک شخص کی لاش نکالی جارہی تھی جس کا سر اور ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ آج بھی مجھے وہ منظر یاد آجاتا ہے تو جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس ہولناک واقعہ کو اگر چہ میں بھول چکا ہوں لیکن میرے دماغ سے وہ نہیں نکلا۔ شاید میری زندگی کا یہ واحد واقعہ ہے جسے میں بالکل بھلا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اتنا ہیبت ناک واقعہ تھا کہ وہ میرے دماغ پر مرتسم ہو گیا اور میں اسے کبھی نہیں بھول سکا۔ وہ میرے حافظے کا حصہ بن گیا۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا کہ آپ بھول گئے لیکن آپ سے وہ بھلایا نہیں جاسکا۔ چنانچہ دنیا میں آپ کے کرب اور اذیت کا یہی سبب ہے۔

بہر حال اب میں اس ہولناک منظر سے نہیں ڈرتا اور میرے اندر عجیب سی ہمت پیدا ہو گئی ہے۔ میں پورے ایک سیکنڈ اس منظر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا ہوں۔ میری ہمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ میں اب پورے ایک منٹ اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا ہوں۔ میرے باپ کا چہرہ ایسا ہی تھا جیسے دوسرے باپوں کا چہرہ ہوتا ہے۔ اور تمام باپوں کے چہرے گتے کے ان مکھوٹوں کی طرح ہی ہوتے ہیں جو ہم عید بقرہ عید پر خریدتے ہیں۔ ان مکھوٹوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں بلکہ دو بڑے بڑے سوراخ ہوتے ہیں۔ میں جب ان کے اندر جھانکتا تھا تو مجھے ان میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ان کی ناک گتے کا ایک ابھار سی ہوتی تھی جس میں دو سوراخ کئے ہوتے تھے۔ ناک کے نیچے موٹی موٹی مونچھیں ہوتی تھیں اور یہی مونچھیں تھیں جن پر ہم بچپن میں خوب ہنستے تھے۔ ہم وہ ایک پیاسترمیں خریدتے اور اسے اپنے چہرے پر لگا کر ایک دوسرے کو موٹی موٹی سیاہ مونچھوں سے ڈرایا کرتے تھے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ میں اپنے باپ سے شاید ان کی نوکدار سیاہ مونچھوں کی وجہ سے محبت نہیں کرتا۔ مگر اب میں پہلی بار ان کے چہرے کو دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں تو ان کی آنکھوں کی وجہ سے ان سے محبت نہیں کرتا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں کو دیکھا تو میرے اوپر انکشاف ہوا کہ انہوں نے ہی میری ماں کو مارا ہے۔ بچپن میں میں اپنی ماں

سے محبت کرتا تھا۔ آپ نہیں جان سکتے کہ بچے کے لئے ماں سے محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کبھی بچے نہیں رہے (فراموشی ایسی چیز ہے جو کسی حقیقی واقعہ کو ایسا بنا دیتی ہے جیسے وہ کبھی پیش ہی نہیں آیا) میں اپنی ماں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ میرے اندر انکے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہے...... پہلے بھی میرے اندر اس کی صلاحیت نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں جب دنیا سے چلا جاؤں گا تو اپنی ماں کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا لیکن اب تمام دنیوی جھنجھٹوں سے آزاد ہونے کے بعد بھی ماں کی محبت اسی طرح موجود ہے۔ موت کے ساتھ غیر حقیقی چیزیں ختم ہو جاتی ہے اور، حقیقی چیزیں اسی طرح برقرار رہتی ہیں۔ ماں کے لئے میری محبت اتنی حقیقی تھی کہ میں سوچتا ماں اور میں ایک ہی ہستی ہیں۔ میں ماں ہوں۔ یہ محض کوئی عقیدہ نہیں تھا بلکہ ایک یقین تھا۔ پختہ یقین۔ میرا اور ان کا جسم ایک تھا۔ ماں کے ساتھ میرا بچپن والا بندھن اب بھی وہی ہے کیونکہ حقیقی چیزیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ہم جہاں بھی ہوں، ہم ترقی کر رہے ہوں یا تنزل کی طرف مائل ہوں یہ چیز ہمارے جسم کی طرح ہمارا حصہ بنی رہتی ہے۔ میرے لئے ماں کی محبت اتنی ہی حقیقی تھی جیسے میرا اپنا جسم۔ میں چھوٹا سا بچہ تھا......اور چھوٹے بچے کی نظر میں ہر چیز خوابوں کی طرح غیر حقیقی ہوتی ہے۔ لوگ بھوت پریت یا فرشتے ہوتے ہیں، ریل گاڑیاں خیالی پڑیوں پر چلتی ہیں اور ان کی سیٹی کی آواز میں ایک جادو ہوتا ہے۔ سمندر کی کوئی تہہ نہیں ہوتی اور آسمان بے کنار ہوتا ہے، سڑکیں کہیں ختم نہیں ہوتیں اور اندھیری راتیں موت کی طرح ڈراؤنی ہوتی ہیں۔

میں دو چیزوں سے ڈرتا تھا۔ اندھیرے اور موت سے۔ آدھی رات کے اندھیرے میں میں اپنے پلنگ سے اتر کر اپنی ماں کے بستر میں گھس جایا کرتا تھا۔ میں ان کے گرم جسم میں اپنے آپ کو چھپا لیتا اور ان کے ساتھ خوب زور سے چمٹ جاتا۔ میں اپنے گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر اپنا جسم اتنا چھوٹا کر لیتا جیسے ماں کے پیٹ کا بچہ جو واپس رحم مادر میں جانا چاہتا ہو۔ میرا سارا جسم اس خواہش سے ایسے کانپ رہا ہوتا جیسے مجھے بخار ہو۔ میں سوچتا تھا کہ ماں کے نرم و گرم پیٹ کے سوا موت سے اور کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ میرے لئے راستہ یہی ہے کہ میں اسی میں چھپ جاؤں۔

اس وقت اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میری خواہش بالکل سچی ہے اور اس میں بلا کی شدت ہے اور یہ خواہش محض موت سے بچنے کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنی ماں کے قریب ہونے کے لئے ہے۔ اتنا قریب کہ میں اپنا جسم ان کے جسم میں ضم

کر دوں ۔ہم دونوں کا جسم ایک بن جائے ۔ میں اپنی ماں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ میرے جسم کا ان کے جسم میں تحلیل ہو جانا دراصل میرے جسم کا تحلیل ہو جانا نہیں تھا۔ وہ جسم کا خاتمہ یا اس کی موت نہیں تھی ۔ یہ کوئی تکلیف دہ عمل نہیں تھا کوئی ہیبت ناک چیز نہیں تھی بلکہ وہ میری زندگی کی معراج تھی' میری خوشی کی انتہا۔ میری سلامتی اور میرا سکون قلب ۔

اس کیفیت میں مجھے اور کسی چیز کا احساس نہ رہتا۔ میرے گرد ہر چیز ایسی گرم گرم ہو جاتی جیسے میری ماں کا سینہ اور ایسی خاموشی چھا جاتی جیسے ماں کے پیٹ میں ۔ یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں...... سمندر' آسمان' مکان' درخت' ریل گاڑیاں اور ریل کی پٹڑیاں...... سب غائب ہو جاتیں ۔ تمام آوازیں معدوم ہو جاتیں ۔ اس وقت میرے ناک کان یا ہونٹ بالکل نہیں ہوتے بلکہ محض ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے حواس ہوتے جسے حدت کے سوا اور کسی چیز کا احساس نہ ہوتا اور جس کے لئے دودھ کے سوا اور کوئی خوشبو نہ ہوتی ۔

اس عالم میں میں اپنے باپ کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہوتا جو اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ میری ماں کے پاس لیٹا ہوتا' جس کی نوکیلی کالی مونچھیں اوپر کے ہونٹ کی حرکت کے ساتھ لرز رہی ہوتیں' جس کا نچلا ہونٹ بلند خراٹوں کے بوجھ تلے لٹکا ہوتا اور جس کے ہونٹوں کے کنارے سے رال ٹپک کر اس کی ٹھوڑی تک بہہ رہی ہوتی ۔ اپنی گہری نیند سے' جس کے بارے میں خیال ہوتا کہ وہ کبھی نہیں اٹھے گا' اچانک وہ آنکھیں کھولتا۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ میں اس طرح سکڑا پڑا ہوتا جیسے میں ماں کے پیٹ میں ہوں ۔ اس کے باوجود اس کی اس نظر کو میں دیکھ لیتا جو ایک دم چمکتی اور پھر غائب ہو جاتی ۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چمک خود بخود غائب ہوئی ہے یا اس نے ہی اسے غائب کیا ہے ۔ لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ خود بخود غائب کرتا تھا۔ اس گہرے اندھیرے میں میں اپنا سر بھی اٹھانے کی ہمت نہ کرتا اس کے باوجود اس کی نظریں اتنی طاقتور ہوتیں کہ تیر کی چبھن سے ہوتا اور باوجود اس کے کہ وہ نظریں فوراً ہی غائب بھی ہو جاتیں' ایک پیار کرنے والے باپ کی نظریں واپس آ جاتیں میں جانتا تھا کہ ان نظروں کا مطلب کیا ہے ۔ وہ ایسے شخص کی نظریں ہوتیں جو نفرت کا اظہار کر رہا ہوتا۔

میرا باپ مہذب آدمی تھا اور تمام مہذب آدمیوں کی طرح وہ بھی اپنے جذبات واحساسات چھپا کر دوسرے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ دیکھو ہم کتنے تہذیب یافتہ

ہیں۔ اور ان سب کی طرح میرا باپ بھی اپنی اس خواہش کو دبانے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا کہ میری گردن اپنے پنجوں میں دبوچ کر مجھے دور پھینک دے۔ ویسے اس کا ہاتھ میری طرف بڑھتا تھا مگر وہ کسی مہذب باپ کی طرح صرف اپنے بیٹے کی پیٹھ پر تھپکی دیتا تھا۔ میرا باپ نہایت آہستگی کے ساتھ مجھے میری ماں سے جدا کر دیتا اور میں بستر کے ٹھنڈے کونے پر جا لیٹتا۔ وہ میری گرم جگہ پر خود قبضہ کر لیتا۔

وہ سردیوں کا موسم تھا اور راتیں بہت ٹھنڈی تھیں۔ کمبل کی چوڑائی صرف اتنی تھی کہ وہ مشکل سے پلنگ کی پٹی تک پہنچتا تھا۔ میں چونکہ پٹی پر لیٹا تھا اس لئے میری پیٹھ ننگی تھی۔ پھر میرے باپ نے کروٹ لی اور کمبل کو اس طرح کھینچا کہ میں پورا ننگا ہو گیا۔ میں سردی سے کانپنے لگا۔ ماں کی آنکھ کھل گئی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں سردی سے کانپا بھی نہیں تھا کہ ماں کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ممکن کمبل کھنچنے کی سرسراہٹ یا میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے کے احساس سے ان کی آنکھ کھلی ہو۔ یا سرسراہٹ سے پہلے ہی اور میرے جسم کو سردی کا احساس ہونے سے پہلے ہی ان کی آنکھ کھل گئی ہو۔ یا ہوسکتا ہے آنکھ کھلنے سے پہلے انہوں نے مجھے کمبل اوڑھا دیا ہو۔

میں اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ ہمارے درمیان باپ ایک دیوار بنا پڑا ہوتا' ہم دونوں میں اتنا فاصلہ ہوتا تھا اس کے باوجود وہ سوتے میں نہ جانے یہ کیسے محسوس کر لیتی تھیں کہ مجھے سردی لگ رہی ہے یا میں ننگا پڑا ہوں۔ میری حیرت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب میں نے اپنے باپ کو کہتے سنا کہ ماں بہت گہری نیند سوتی ہیں۔ ایک بار میں نے اسے ماں سے جھگڑتے سنا کہ وہ اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا ہے اور ماں کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔ انہوں نے اتنی دیر سے دروازہ کھولا۔ میرا باپ تو یہ بھی کہتا تھا کہ وہ ٹھیک سنتی بھی نہیں ہیں۔ ایک بار وہ مجھے دودھ پلا رہی تھیں تو باپ نے انہیں مارا بھی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اتنی دیر سے کھانا لگانے کو کہہ رہا ہے اور وہ سنتی ہی نہیں۔ ایک مرتبہ میں نے باپ کو یہ بھی کہتے سنا کہ ماں کے پاس دل ہی نہیں ہے اور انہیں کسی کا دکھ درد نہیں ہے۔ ایک دن میں نے انہیں باورچی خانہ میں چپکے چپکے روتے دیکھا تو میں ان کے پاس گیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں (اس وقت مجھے پوری طرح بولنا نہیں آیا تھا) کہا ''امی' آپ کے اندر تو ابا سے زیادہ پیار ہے۔'' ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیران ہوئیں کہ اتنا چھوٹا بچہ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے جانتا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی گود میں بھینچ لیا اور پیار کیا ''میرا منا'' ......

اس وقت میرا باپ باورچی خانے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے ماں کی گود میں دیکھ لیا۔ اس کی نظر میں وہی تلخی سی لہرا گئی۔ ایک لہر آئی اور چلی گئی مگر وہ نظریں میرے دماغ میں جیسے کھب گئیں اور میں اس زور سے کانپا جیسے کوئی جاندار موت کے سامنے کانپتا ہے۔

اگر وہ ایسا ہی کرتا جیسے عام لوگ کرتے ہیں اور نفرت میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے میری گردن دبوچ لیتا تو مجھے سکون ملتا اور میں سمجھتا کہ وہ عام انسانوں کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ عام انسانوں والا رویہ خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو بہر حال توقع کے مطابق ہوتا ہے اس لئے تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن میرے باپ کا رویہ ایسا نہیں تھا۔ مجھے اس سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے ڈر لگتا تھا۔ شدید اور درشت رویہ کے مقابلے میں نرم اور مشفقانہ رویہ مجھے زیادہ خوف زدہ کرتا۔ میں جب بھی اس کے پاس بیٹھا ہوتا اور وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دیتا خواہ وہ میرا کندھا تھپ تھپانے کے لئے ہی ایسا کرتا یا اپنے منہ پر سے مکھی اڑاتا یا کان کھجاتا تو میں ایک دم اچھل پڑتا اور میرے بدن کے اندر کپکپی سی پیدا ہو جاتی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنے باپ کے قریب کیوں نہیں بیٹھ سکتا کہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ مٹ جائے۔ ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رہا۔ اپنی ماں کے عکس میں نے کبھی اپنے باپ کو چھونے کی ہمت نہیں کی۔ ماں میرے پاس بیٹھتیں تو میں ان کے ساتھ چمٹ جاتا۔ یہ کوئی عام چمٹنا نہ ہوتا بلکہ یہ بے ساختہ اور شدید خواہش کا اظہار ہوتا کہ ہم دونوں کا فاصلہ مٹ جائے اور ہمارے جسم ایک ہو جائیں۔

اس خواہش کا علم میرے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی دوسری اصل خواہشات کی طرح سب سے چھپایا ہوا تھا۔ ایک بار کلاس میں استاد نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کہتے جائیں میں بھی اسے دہراتا جاؤں۔ انہوں نے کہا۔ ''میں ماں کی طرح اپنے باپ سے بھی محبت کرتا ہوں'' میں نے کسی احتجاج کے بغیر اسے دہرا دیا۔ جب مجھے لکھنا آ گیا تو استاد نے کہا کہ میں اپنا نام لکھوں۔ میں نے ''سمیر'' لکھ دیا۔ استاد نے کہا پورا نام لکھو۔ میں نے سمیر عزیزہ لکھ دیا۔ استاد نے دیکھا تو اپنی سرخ پنسل سے عزیزہ کاٹ دیا اور کہا ''باپ کا نام لکھوں'' اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں چیخنا چاہتا تھا مگر استاد بہت بڑے تھے اور میں بہت چھوٹا اس لئے میں نے خاموشی سے ''سمیر آدمی'' لکھ دیا۔ دوسرے دن استاد

نے سب سے پہلے مجھ سے کہا اور زور زور سے کہو ''میں ماں کی طرح اپنے باپ سے محبت کرتا ہوں'' میں نے زور سے کہا اور ساری کلاس نے اسے دھرایا۔ یہ جملہ مجھ سے بار بار کہلوایا گیا۔ پھر استاد نے ہم سب سے کہا کہ اپنی کاپیوں میں اسے پانچ پانچ مرتبہ لکھیں۔ اس سے اگلے دن بھی ہم نے یہی جملہ بار بار دھرایا۔ ہوم ورک میں بھی ہم سے پانچ مرتبہ یہی لکھنے کو کہا گیا اور ہدایت کی گئی کہ دل ہی دل میں دس مرتبہ اسے دہرائیں۔ میں نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا کہ رات کو خواب میں بھی میں اسے ہی دہراتا رہا۔ ''میں ماں کی طرح اپنے باپ سے محبت کرتا ہوں...... میں ماں کی طرح اپنے باپ سے......''

میرے باپ نے مجھے یہ جملہ دہراتے سنا تو وہ مسکرائے۔ اس کی مسکراہٹ عجیب سی تھی۔ اس کا ماتھا بہت چوڑا اور آگے کو نکلا ہوا تھا اور اس پر مستقل شکنیں پڑی رہتیں تھیں حتیٰ کہ سوتے میں بھی وہ اسی طرح رہتیں۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں بہت مضبوط تھیں اور جبڑے اتنے نمایاں تھے جیسے اونٹ یا گھوڑے کے۔ مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹ خواہ کتنے بھی کھل جاتے وہ اپنے جبڑے کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ جب بھی میں کوئی انہونی چیز دیکھتا تو لرز اٹھتا۔ میں نے کبھی گھوڑے یا اونٹ کو ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ ''گھوڑے اور اونٹ کیوں نہیں ہنستے؟'' میں نے اسکول میں اپنے استاد سے پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''صرف انسان ہی ہنستے ہیں، سمیر۔''

میرا باپ نہیں جانتا تھا کہ میرے دماغ میں کیا کھچڑی پکتی رہتی ہے۔ کسی انجانی قوت نے مجھے اپنے جذبات چھپانے کی صلاحیت دے دی تھی۔ میں نے جب کاپی سے پڑھنا شروع کیا تو اپنی آواز خوب اونچی کر لی۔ ''میں ماں کی طرح اپنے باپ سے بھی محبت کرتا ہوں۔ میں ماں کی طرح......'' میں جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور چونکہ میں جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اس لئے ڈرتا تھا کہ کہیں میرے باپ کو اس کا علم نہ ہو جائے۔ اپنے باپ کو دھوکا دینے کے لئے میں خوب زور زور سے چلا رہا تھا۔ ''میں ماں کی طرح اپنے باپ سے بھی محبت کرتا ہوں۔'' میں جتنی زور سے آواز نکالتا میرا خوف اور بڑھ جاتا کہ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ آخر یہاں تک ہوا کہ میں نے ایسے چیخنا شروع کر دیا جیسے کوئی مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ ''میں اپنے باپ سے محبت کرتا ہوں جیسے میں ماں سے محبت کرتا ہوں...... میں باپ سے محبت کرتا ہوں......''

میرے باپ کو سچی بات کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے میرے گالوں پر آنسو

بھتے دیکھے تو وہ میری طرف بڑھا مگر میں حسبِ عادت پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے قریب آیا تو میں اور پیچھے ہو گیا۔ وہ اور قریب آ گیا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے تھوڑا سا ہاتھ اٹھایا۔ میں نے سوچا وہ میری پیٹھ تھپکے گا لیکن اچانک خیال آیا نہیں، وہ تو میرے منہ پر تھپڑ مارنا چاہتا ہے۔ میں اچھل کر پیچھے ہو گیا جیسے میں اپنے آپ کو بچا رہا ہوں۔ میرا باپ اچانک ٹھہر گیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ یہ کسی ایسے شخص کی قدرتی حیرت تھی جو اصل وجہ سے واقف نہیں تھا۔ یہ غیر قدرتی بات تھی، وجہ معلوم تھی، نہ صرف معلوم تھی بلکہ اتنی واضح تھی کہ جسم کے تمام حواس اور سارے جذبات اس کا احساس کر رہے تھے۔

ایسے موقع پر انسان بدحواس ہو جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر اس قسم کے جذبات کا عادی نہیں ہوتا بلکہ ان پر شک کرتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ شک ہی ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ دنیا میں ہمارے لئے سب سے بڑا عذاب یہی ہے کہ ہم مستقل یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔

لیکن اس وقت میں بچہ تھا اور میرے اندر اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ میں انہیں شک یا یقین سے باہر نکال سکتا۔ میں نے اپنا سبق یاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنی پوری طاقت لگا دی کہ میری آواز میں کہیں لرزش پیدا نہ ہو اور وہ ایسی معلوم ہو جیسے میں سچ بول رہا ہوں۔

اور میری آواز واقعی سچی معلوم ہوتی تھی۔ میں جو کچھ کر رہا تھا اس سے زیادہ واقعی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میرا باپ میرے سامنے اسی طرح کھڑا رہا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ میرا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر یہ ہمت ہی نہیں تھی کہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھوں۔ میں نے کبھی ایسا کیا ہی نہیں تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ جیسے ہی اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں گی اسے اس ہولناک حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ اور وہ ہولناک حقیقت یہ تھی کہ شک یقین بھی بن جاتا ہے اور یقین شک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا مگر وہ تیز نظریں میرے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں اور مجھے دھکیل کر پیچھے دیوار سے لگا رہی تھیں۔

اس طرح میں وہاں کھڑا رہا۔ میرے اندر ایک قدم پیچھے ہٹنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ میں اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک پل کے اندر میرا

اور اس کا فاصلہ مٹ جائے گا اور میں دیوار کا حصہ بن جاؤں گا۔ میں نے پوری طاقت سے دیوار کے ساتھ اپنی پیٹھ لگائی مگر دیوار پتھر کی طرح سخت تھی۔

اسی لمحے میری ماں وہاں آ گئیں جیسے وہ اچانک زمین سے نمودار ہو گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم وہ وہاں کیسے آ گئیں اور کب آ گئیں کیونکہ اس دن وہ گھر پر نہیں تھیں اور خالہ کے گھر گئی ہوئی تھیں جہاں ان کا رات گزارنے کا ارادہ تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ انہیں دیکھ کر میرے اوپر کیا گزری۔ یکلخت میرا جسم اچھلا اور پوری طاقت کے ساتھ ان کے ساتھ چمٹ گیا۔ جیسے میں بھاگنا چاہتا تھا اور ان کے ساتھ لپٹنے کے لئے بے چین تھا۔ جیسے میں زندگی کے ساتھ چمٹ جانے کو بے چین تھا۔ میں ان کے ساتھ اتنے زور سے چمٹا کہ دونوں کا جسم ایک ہو گیا۔

اب میں اس دن کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ میری پیٹھ دیوار کے ساتھ لگی رہنا چاہئے تھی۔ مجھے ہمیشہ کے لئے اس دیوار کا حصہ بن جانا چاہئے تھے۔ مگر میں تو جانتا ہی نہیں تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ المیہ تو یہی ہے کہ انسان کو بالکل پتہ نہیں ہوتا کہ اگلے دن کیا ہونے والا ہے' اگلے لمحے کی تو بات ہی اور ہے۔ یہ بے خبری اندھے پن کی طرح ہے بلکہ دراصل وہ اندھا پن ہی ہے۔ اس وقت میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں کہ آپ آنکھوں کے بغیر ٹہل رہے ہیں۔ آپ کی آنکھیں دراصل آنکھیں نہیں گتے کے ان مکھوٹوں کی طرح محض سوراخ ہیں جو میں عید بقرہ عید کو خریدا کرتا تھا۔

مجھے آج تک وہ دن یاد ہے' میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا جیسے وہ دن جب میں نے سر اور پیروں کے بغیر لاش دیکھی تھی۔ میری یادداشت نے اس دن ہونے والے تمام واقعات کو محفوظ کر لیا ہے حالانکہ اسے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اس دوران گزرنے والے بہت سے سال مجھے یاد بھی نہیں ہیں۔ ان دنوں میں صرف دس تک گنتی گن سکتا تھا کیونکہ استاد نے اس سے زیادہ ہمیں سکھایا ہی نہیں تھا۔ لیکن اتنے برس گزرنے کے بعد بھی مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور سادہ سے سادہ بات یاد ہے۔ لیکن میرے باپ کی کوئی حرکت سادہ نہیں تھی۔ حالانکہ ظاہر میں وہ سادہ ہی نظر آتی تھیں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں اچانک لہرانے والی وہ جھلک دیکھی۔ اس کی کالی پتلیاں میری ماں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں ابھی تک ماں کی بانہوں میں تھا۔ میں نے ان کے سینے میں اپنا سر اور منہ

چھپا رکھا تھا۔ میں نے اپنے باپ کی آنکھیں نہیں دیکھیں صرف یہ محسوس کیا کہ میرے جسم پر ماں کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اور زور سے خوب زور سے چمٹا رہی ہیں جیسے وہ مجھے اپنے اندر چھپا لینا چاہتی ہوں۔ جیسے وہ مجھے اپنے پیٹ میں رکھ لینا چاہتی ہوں۔

اب میرے باپ نے اپنا غیر فطری چہرہ اتار پھینکا اور وہ اپنے اصل چہرے میں سامنے آ گیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور میں نے اسی وحشی لکڑ بگے والا چوڑا جبڑا پہلی بار دیکھا۔ پہلی بار میرے والد کا اصل چہرہ میرے سامنے آیا۔ اب میں خوف زدہ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا میرے اندر کہاں سے اتنی ہمت آ گئی۔ مگر میں نے آہستہ سے کہا ''میں آپ سے پیار نہیں کرتا۔'' یہ سن کر جیسے وہ آنکھیں پتھر ہو گئیں اور میرے اندر اور بھی ہمت آ گئی اور میں نے زیادہ بلند آواز میں کہا ''میں آپ سے پیار نہیں کرتا۔'' میں نے اپنے کانوں میں گونجتی اپنی آواز اتنی واضح اور صاف طور پر سنی تو میرے اندر اور بھی حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے پھر دہرایا۔ ''میں پیار نہیں کرتا آپ سے۔ نہیں کرتا پیار......''

وہ بھوکے شیر کی طرح میرے اوپر جھپٹا مگر میری ماں اس سے زیادہ تیز تھیں۔ پلک جھپکتے ہی میری ماں کا جسم میرے اور باپ کے درمیان تھا۔ میں نے ماں کا چہرہ نہیں دیکھا کیونکہ میں ان کے پیچھے کھڑا تھا لیکن ان کی پیٹھ کے پٹھے جس طرح اکڑ رہے تھے ان سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی شیرنی کی طرح جھپٹنے کو تیار کھڑی ہیں۔ پھر مجھے نہیں پتہ کیا ہوا۔ اب جو آوازیں آ رہی تھیں وہ انسانی نہیں تھیں۔ ایک پل کے اندر سب کچھ بدل گیا۔ اب لمحہ بھی لمحہ نہیں رہا تھا کیونکہ وقت تبدیل ہو گیا تھا اور وقت اب وقت نہیں رہا تھا۔ میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا تھا میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا حتٰی کہ میں اپنے آپ کو اور اپنے وجود کو بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ مجھے لگا جیسے میں مرا ہوں پھر زندہ ہو گیا ہوں' پھر مرا ہوں' پھر زندہ ہو گیا ہوں۔ مرا اور زندہ ہوا۔ دس بار' ایک سو بار' ہزار بار' لاتعداد مرتبہ۔ جیسے میرا جسم ایک اتھاہ پاتال میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ گھومتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ وہ محور پر کرہ ارض کے چکر سے بھی زیادہ تیز چکر لگا رہا ہے۔

یکلخت میرے پیروں کے نیچے زمین نے گھومنا بند کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وقت بھی تھم گیا۔ ہر چیز ٹھہر گئی اور ایک جگہ جم گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اپنی ماں کو زمین پر لیٹے دیکھا۔ میں نے سوچا وہ سو رہی ہیں جیسے وہ گرمیوں میں فرش پر سویا کرتی

MashalBooks.com

تھیں۔ ڈرتے ڈرتے میں ان کے پاس گیا اور آہستہ سے ان کے کان میں کہا ''امی!'' مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو میری ذرا سی حرکت پر اٹھ بیٹھتی تھیں۔ وہ تو میرے حرکت کرنے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھتی تھیں۔ میرے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکلتا اور وہ جاگ کر بیٹھ جاتیں۔ وہ آنکھیں نہ بھی کھولتیں تو میں محسوس کرتا کہ ان کے جسم میں لرزش ہوئی ہے۔ میرے منہ سے لفظ نکلنے سے پہلے' اس سے پہلے کہ میں اپنی آواز خود سنوں وہ سن لیتی تھیں۔

میں جان گیا تھا کہ وہ نہیں سن رہی ہیں پھر بھی میں ان کے کان میں بولے جا رہا تھا۔ پھر جب میرے باپ چچا کے ساتھ اندر آئے اور ماں کو اٹھا کر باہر لے گئے اور گھر ماں کے بغیر رہ گیا تب مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ایسی عام سی حیرت نہیں تھی جو بڑی عمر کے لوگوں کو ہوتی ہے' یہ ایک بچے کی حیرت تھی' ایک عجیب سی حیرت جہاں ہر چیز غیر حقیقی ہو جاتی ہے۔ جیسے جو کچھ ہوا ہے وہ نہیں ہوا' خوابوں جیسی حقیقت۔ ایسی حقیقت جو خواب معلوم دے۔ میں باپ کے ساتھ دوسرے گھر میں منتقل ہو گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ دن سے مہینے اور مہینے سے سال بن گئے۔ میں بڑا ہوا' بوڑھا ہوا اور مر گیا۔ تاہم میں آج بھی یہی سوچتا ہوں کہ اس روز جو کچھ ہوا وہ نہیں ہوا تھا۔

دنیا چھوڑنے کے بعد اب میں اس قابل ہوں کہ زمین کو واضح طور پر دیکھ سکوں۔ میں آپ کو بھی بہت صاف دیکھ رہا ہوں۔ صرف آج میں اس سب سے بڑے جرم' اس گناہ کبیرہ کو جان سکا ہوں جس کا ارتکاب تنہائی میں کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہے۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا جرم وہ نہیں تھا جب قابیل نے ھابیل کو قتل کیا تھا بلکہ سب سے بڑا جرم وہ تھا جب آدم نے میری ماں کو مارا تھا۔ اس نے اس لئے قتل کیا تھا کہ میں ماں سے محبت کرتا تھا اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ کاش اس نے سوچا ہوتا کہ اگر وہ مجھ سے محبت کرتا تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا۔ مگر میرے باپ میں محبت کرنے کی اہلیت ہی نہیں تھی حالانکہ میں بچہ تھا پھر بھی میں جانتا تھا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اور وہ میری ماں سے بھی محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف اپنی خواہشات کی تسکین سے محبت کرتا تھا۔

اسے کسی نے بتایا ہی نہیں

سڑک لمبی تھی اور بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ گہرا دھند لکا چھایا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کوئی چیز بھی صاف نظر نہیں آرہی تھی مگر وہ رکی نہیں۔ وہ ان چیزوں کی تلاش میں تھی جن کا نام وہ نہیں جانتی تھی لیکن جاننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر لینا چاہتی تھی کیونکہ کوئی خطرناک بات ہونے والی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں نوکدار جوتوں میں پھنس رہی تھیں' جوتے کی ایڑیاں لکڑی کی تھیں جن سے آواز پیدا ہو رہی تھی اور اس کے لئے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے پیروں کی شکل بگڑ چکی تھی' ایڑیاں نیچے سے چھل گئی تھیں بالکل اس کی ماں کی طرح' اس کی ماں کی سہیلیوں کی طرح' بڑی عمر کی تمام عورتوں کی طرح۔ وہ ان عورتوں کے ساتھ اپنے آپ کو ملانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان چیزوں سے نفرت کرتی تھی کیونکہ بڑی عمر کی عورتیں عجیب باتیں کرتی تھیں۔ وہ باتیں جو اس سے چھپائی جاتی تھیں۔ وہ باتیں سرگوشیوں میں کی جاتی تھیں تاکہ وہ نہ سن لے' ایسے اشارے کئے جاتے کہ اس کی سمجھ میں نہ آئیں' بغلوں میں منہ دے کے ہلکے ہلکے قہقہے لگائے جاتے۔ وہ ان عجیب وغریب چیزوں سے بھی نفرت کرتی تھی جو اس کی ماں وارڈ روب کی اوپر والی دراز میں چھپا کر رکھتی تھیں...... لمبے لمبے بندھے ہوئے بنڈل' موٹی چیزوں کی تہہ...... اور ان عجیب نظروں سے بھی اسے نفرت تھی جو اسے دیکھتی تھیں۔ خاص طور پر جب وہ غسل خانے میں ہوتی' اس کی ماں اسے نہلاتی

تھیں، نہاتے نہاتے اسکی ماں اس کے جسم سے نظریں چرانے لگتیں، جیسے ان کی زبان کی نوک پر کوئی لفظ آیا ہے لیکن وہ کہنا نہیں چاہتیں۔ وہ کچھ بتانا چاہتی ہیں مگر بتاتی نہیں...... ایک پراسرار سا خوف اس کے بدن میں سنسنی پیدا کرتا۔ اس کے سامنے غسل خانے کی اونچی خاموش دیواروں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا یا پھر اس کی ماں کی غصے میں بھری سانسیں اور اس کی آنکھوں پر چھائی گھٹا جو معنی خیز قہقہوں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہونے والے اشاروں سے ہی ہٹتی تھی۔ ان موقعوں پر بھی اس کی ماں کی آنکھوں پر اداسی کا ایک نقاب سا پڑا رہتا۔ یہ نقاب اس کی ماں کی سہیلیوں کی آنکھوں پر بھی ہوتا، بڑی عمر کی تمام عورتوں کی آنکھوں پر بھی ہوتا، جیسے کوئی چیز عورتوں پر حملہ کرنے کو تیار ہو، کوئی ایسی چیز جو اسے ڈراتی تھی۔ اونچی ایڑی کے جوتوں کی آواز اسے پریشان کر رہی تھی۔ جوتے کی باریک نوک میں اس کے پاؤں کی انگلیاں دکھ رہی تھیں۔ اس کا مڑا ہوا پیر اس کے بدن میں کپکپی پیدا کر رہا تھا اور وہ اس کے اور ماں کے درمیان مشابہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اسے اس پراسرار اور خوفناک چیز کے قریب لئے جا رہا تھا۔ دل کا تیز تیز دھڑکنا بند نہیں ہوا۔ اس کے بغل میں دبے ہوئے چھوٹے سے بیگ میں رکھے سکے جھنجھنانے لگے لیکن ان کی آواز ٹین کی گلک میں رکھے ان سکوں جیسی نہیں تھی جو وہ چوئنگم خریدنے کے لئے جمع کیا کرتی تھی۔ روزانہ وہ گلک کو اٹھا کر ہلاتی اور سکوں کی آواز سنتی۔ وہ آواز اس کے کانوں کو بہت بھلی لگتی ایک دن وہ اپنی گلک کھولے گی اور سارے سکے نکالے گی۔ وہ بہت امیر ہو جائے گی اور بہت سی چوئنگم خریدے گی اتنی چوئنگم کہ اس کا منہ بھر جائے گا۔ ایسے نہیں کہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں ڈالے اور وہ اس کے دانتوں یا تالو پر چپک جائے، پھر جو بچے گی وہ دوسرے بچوں میں بانٹ دے گی لیکن اس کو بالکل نہیں دے گی جو ہر وقت چوئنگم کھاتی رہتی ہے اور کبھی اسے نہیں دیتی۔

اس کی زندگی میں چوئنگم ہی سب سے اچھی چیز تھی۔ اس کی گلک بھاری ہوتی جا رہی تھی مگر اس کا بدن بھی اب ہلکا پھلکا نہیں رہا تھا۔ پہلے وہ ایک ساتھ تین تین سیڑھیاں چڑھ جاتی تھی اب صرف دو سیڑھیاں ہی پھلانگی جاتی تھیں۔ جب وہ فرش پر گرتی تو اس کا جسم کانپ جاتا اور اسے درد سا ہوتا۔ اس کے سینے میں دو جگہ درد سا ہوتا جو اس طرح تکلیف کے ساتھ ہلتا جیسے پھوڑے کا منہ۔ اب اس کی پتلونیں بھی تنگ ہو گئی تھیں۔ وہ سلائی پر سے ادھڑ گئی تھیں اور انہیں باورچی خانے کی صافی بنا لیا گیا تھا۔ اسے دوسری

پتلونیں بنا کر دی گئی تھیں۔ اسے سائیکل پر چڑھنے کا بہت شوق تھا بلکہ چوئنگم سے بھی زیادہ اسے سائیکل پسند تھی مگر اس کی ماں کی شک وشبہ سے بھری نظروں کی وجہ سے وہ سر جھکا لیتی تھی۔

اب سائیکل پر چڑھنا بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ اس کے اردگرد سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا اس کے سینے پر جو کپڑے سپاٹ ہوتے تھے اب ان میں لہریں پڑنے لگی تھیں۔ اب بنیان کی جگہ اسے رنگ برنگے ایسے کپڑے پہنائے جاتے جن کے پیچھے ڈوریاں لگی ہوتیں جیسے اس کی ماں کے ہوتے تھے۔ اس مشابہت پر اسے جھری جھری سی آ گئی۔ وہ بھی اس خوفناک چیز کی طرف بڑھ رہی ہے۔ گھر میں جو کچھ بھی ہوتا وہ اسکے لئے تنبیہہ کا درجہ رکھتا۔ گھر کی میزوں سے تصویروں والے رسالے غائب ہو گئے' ریڈیو جو دن بھر چلتا رہتا تھا اب صرف ماں کے کانوں کے لئے ہی رہ گیا' پارک میں جا کر کھیلنا بند کر دیا گیا' بلکہ ہوا کھانے کے لئے گھر سے باہر نکلنا بھی ممنوع ہو گیا۔

گھر سے باہر کی زندگی بھی پر اسرار خطروں سے بھری ہوتی تھی...... ماں کی آنکھیں چوری چوری اس کے بدن کو' اس کے بدن کے ہر ہر حصے کو دیکھتی رہتیں' اس کی ہر حرکت پر نظر رکھی جاتی' جب وہ چلتی' جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوتی' جب وہ سوتی' جب وہ غسل خانے میں جاتی یا جب وہ اپنے سر یا پیٹ پر ہاتھ رکھتی تو اسے فوراً دیکھا جاتا۔ کچھ ہونے والا تھا' کوئی خوفناک بات' ایسی بات جسے وہ نہیں جانتی تھی لیکن جسے وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کے لئے کیسے تیار رہا جائے۔ لیکن اس کی ماں کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں اور وہ جو کچھ پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف یہی کر سکتی تھی کہ چوری چھپے بستر کے نیچے الماری میں' غسل خانے میں کپڑوں کی تہوں میں' ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں اور اپنے بدن کی تہوں میں اسے تلاش کرے۔ اس کا ننھا معصوم دل خوف سے بیٹھنے لگا' ہونٹ بھنچ گئے اور سانس کا ایک گولا سا حلق میں اٹک گیا۔ اس آفت کے آنے سے پہلے موت آ جانا بہتر ہے۔ مگر موت سے بھی ڈر لگتا ہے۔ باورچی خانہ کی چھری اتنی کھٹل تھی کہ اس کے پیٹ میں چبھتی تک نہیں۔ بڑی بڑی چھریاں لئے لمبے لمبے نوکیلے ناخنوں والے بھوت اندھیرے میں اس کی طرف بڑھتے۔ ان کے سر سانپ کے دانتوں کی طرح نوکیلے ہوتے۔ وہ چیخنے کی کوشش کرتی مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ جاتی۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتی مگر اس کے پاؤں ساتھ نہ دیتے۔ اب نیند بھی اس کے لئے نئی مصیبت بن گئی تھی۔ اسے اپنے خواب

یاد نہیں رہتے لیکن وہ خواب بھول جانے والے بھی نہیں ہوتے کیونکہ وہ رات کو شروع ہوتے تو دن بھر بھی اسی طرح جاری رہتے۔ ہاں' اس کے دن کے خواب ڈراؤنے نہیں ہوتے' کیونکہ وہ ان خوابوں میں سمندر کے گرم پانی میں نہاتی ہوتی۔ اس کے بدن پر شفاف اور ملائم لباس ہوتا اور اس پانی کی طرف بڑھتی جو اس کے گدگدی کر رہا ہوتا سینے پر ابھرے ہوئے پھوڑے کا منہ اسے تکلیف دے رہا ہوتا۔ وہ درد زیادہ تیز نہیں ہوتا لیکن اس کا بدن لرز جاتا اور ایک انجانا سا سرور اس کے روئیں روئیں میں بھر جاتا۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتی لیکن نامعلوم بازو اسے جکڑ لیتے اور دو آنکھیں اس پر گڑ جاتیں۔ وہ آنکھیں اجنبی نہیں ہوتیں' اس کے باپ کی آنکھیں ہوتیں۔ وہ باپ کی آنکھیں دیکھ کر رونے لگتی اور آنسوؤں میں وہ بازو غائب ہو جاتے۔ وہ اپنی پلکیں بند کر کے انہیں زور سے دباتی لیکن پھر وہ بازو یا اس کے باپ کی آنکھیں واپس نہ آتیں۔صرف وہ آنکھیں اس کے سامنے آتیں جو ریاضی کی استانی کی طرح ہوتیں۔

ریاضی کی استانی کی کہانی بھی عجیب ہے۔ایک دن وہ استانی غسل خانے گئیں وہاں سے آئیں تو لڑکیوں نے غسل خانے میں ایک کپڑا پڑا دیکھا جو سرخ روشنائی میں سنا ہوا تھا...... ایک لڑکی نے اس کے کان میں کہا۔''ہمیں ایسی استانی نہیں چاہئے جو سرخ روشنائی سے لکھتی ہے۔'' ایک اور لڑکی نے اپنے کپڑے سنبھالے اور کہنے لگی کہ جب سے ٹرکی مرغی نے اس کے کاندھے پر چونچ مار کر اس کا خون نکال دیا تھا اس کے بعد سے اسے لال رنگ بالکل اچھا نہیں لگتا۔اس وقت اس نے لال رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایک اور لڑکی آئی اور اس کے کان میں کہنے لگی۔ وہ لال روشنائی نہیں ہے بیوقوف' وہ تو خون ہے۔ یہ عجیب قسم کی بیماری ہے...... یہ ریاضی کی تمام استانیوں کو ہو جاتی ہے۔ پھر یہ افواہ پھیلتی گئی۔ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری تک پہنچی۔نہیں لڑکیو ریاضی کی استانیوں کو ہی نہیں تمام عورتوں کو یہ بیماری ہوتی ہے۔چھوٹے چھوٹے بدن ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ کسی کو بھی صحیح بات کا پتہ نہیں تھا۔ ہر لڑکی نے اپنی ہی کہانی سنائی جو اس نے اپنی ماں' نانی دادی یا نوکرانی سے سنی تھی۔

ننھے بچے عورتوں کے کانوں سے پیدا ہوتے ہیں ہر ایک نے اپنے کان چھو کر دیکھے نہیں' وہ ناک سے نکلتے ہیں...... ہر ایک نے اپنے کپکپاتے ہاتھ اپنی ناک پر رکھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے نتھنے تو تنگ ہوتے ہیں' بچے بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہوں گے۔ اس

سے پہلے کوئی بہت ہی ہولناک بات ہوتی ہوگی' ایسی باتیں جو مائیں نہیں بتاتیں اور یہ مصیبت آتی ہی رہتی ہے...... ہر سال...... پاگل نہ بنو۔ ہر مہینے افوہ' کتنی مصیبت ہے۔

اس مصیبت سے زیادہ خوفناک تو اس کا انتظار ہے۔ یہ مصیبت اس پر اسی وقت آ رہی ہے۔ اسے اپنے اندر ہلکا سا درد اٹھتا محسوس ہوا......نہیں ابھی نہیں...... اس وقت نہیں......سڑک پر نہیں...... یہاں تو اتنے بہت سے آدمی ہیں' موٹی موٹی مونچھوں اور لمبی لمبی پتلونوں والے آدمی۔ یہاں تو تماشہ بن جائے گا۔ کاش وہ چھوٹی سی گٹھری بن کر ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کاش زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ اس کے آس پاس ساری نظریں اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس کے پیروں کو' پنڈلیوں کو' ٹانگوں اور کولہوں کو دیکھ رہی ہیں۔ اس کے جسم میں کوئی شرمناک اور ناپاک چیز پیدا ہو رہی ہے کوئی ممنوعہ چیز۔ ساری آنکھیں اس پر لعن طعن کر رہی ہیں۔ ساری آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ انہوں نے اس کا محاصرہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے قدم تیز کر دیتی ہے' بغل میں دبے بیگ میں سکے کھنک رہے ہیں' پراسرار درد اس کے بدن میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ کوئی بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کیلئے تیار کرنا چاہتی ہے...... مگر وہاں تو بے شمار دوکانیں ہیں۔ پنساری کی دوکان پر بے شمار بوریاں رکھی ہیں' لیکن وہ اس کی ماں کی بوریوں کی طرح نہیں ہیں۔ دوکانوں پر بہت سے بنڈل ہیں مگر وہ بھی ویسے نہیں ہیں۔ جوتے کی نوک میں اس کے پیروں کی انگلیاں جل رہی ہیں۔ اس کے پیٹ کے پٹھے اکڑ رہے ہیں۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے اور سانس آسمان کی طرف اڑ رہا ہے۔ مصیبت آیا ہی چاہتی ہے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ چیزیں وہاں موجود نہیں ہیں' وہ چیزیں جن کے نام وہ نہیں جانتی۔ جن کے نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ جاننا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے اسے کبھی نہیں بتایا۔ کوئی اسے نہیں بتانا چاہتا اور وہ پوچھ نہیں سکتی۔ اس کی اونچی ایڑی کے جوتے کھٹ کھٹ کر رہے ہیں اور بغل میں سکے کھنک رہے ہیں' پرانی سڑک لوگوں سے بھری ہوئی ہے' کہر اور غبار گہرا ہو گیا ہے' اس کے آس پاس ہر چیز دھندلا گئی ہے۔ لیکن وہ چلی جا رہی ہے۔ وہ رکتی نہیں۔

''بیوٹی فل''

اس رات وہ گھر آیا تو وہ بستر میں نہیں تھی۔ جب سے وہ نئی کمپنی میں ملازم ہوا تھا رات کو وہ اس وقت واپس آتا جب وہ سو چکی ہوتی اور صبح اسکے جاگنے سے پہلے دفتر چلا جاتا۔ آج صبح وہ گھر سے نکلا تو وہ حسبِ معمول سو رہی تھی۔ وہ دیوار کی طرف کروٹ لئے ایسے پڑی تھی جیسے چادر میں بندھی کوئی گٹھری پڑی ہو۔

وہ خاموشی سے کھڑا اندھیرے میں دیکھتا رہا۔ بستر ایسے سپاٹ تھا جیسے اس میں کوئی سویا ہی نہ ہو۔ جیسے اس میں گٹھری بنی ہی نہ ہو۔

وہ آہستہ قدم اٹھاتا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جب بھی وہ پریشان ہوتا اسی طرح آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ آئینے سے ایک لمبوترا چہرہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے باپ کا چہرہ۔ اس کی کمر میں کوبھ سا نکل آیا تھا۔ یہ کوبھ صبح تو نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے صبح کو گزرے دس بیس یا اس سے بھی زیادہ سال گزر چکے ہوں۔ اتنے زمانے سے وہ آئینے کے سامنے کھڑا نہیں ہوا۔ اس کے ذہن میں اپنی تازہ ترین جو تصویر تھی وہ نوجوانی کے زمانے کی تھی۔ اکڑا ہوا جسم' تنے ہوئے اعصاب' سر اونچا اور سیدھی کمر۔ وہ اپنے گرد اپنے بازو حمائل کرتا تو لگتا کہ اس نے ساری کائنات کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اور رات کو وہ اسے اپنی آغوش میں بھر لیتا جیسے وہی ساری کائنات ہو۔

پرانے قاہرہ کی ایک کمپنی میں وہ بھی اسکے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ ان کی زندگی ان کے سامنے نارنجی دھوپ کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے بازو جب اس

کے اپنے گرد حمائل ہوتے تو گویا پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتے۔ وہ کائنات کا مالک تھا اور جب اسے اپنی آغوش میں سمیٹتا تو اس کا مالک بھی ہو جاتا۔ اسے قابو میں کرنے کا سرور اپنے اندر عجب سا مزہ رکھتا تھا۔ اس کی موجودگی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی۔

اس کے پاس اس کے اور کائنات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے باپ کا انتقال ہوا تو ترکے میں اسے باپ کی اس تصویر کے سوا اور کچھ نہیں ملا اور جو اس کے دل میں اور دیوار پر ٹنگی رہتی تھی۔ تصویر میں اس کے باپ میڈل وصول کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ آگے کو بڑھے ہوئے ہیں اور سر جھکا ہوا ہے اور کمر میں خم ہے۔

اس نے اپنے باپ کو کبھی کسی کے سامنے سر جھکاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باپ جب کھڑے ہوتے تو وہ طویل قامت اور غرور سے پر نظر آتے۔ ان کی کمر سیدھی ہوتی اور سر اونچا۔ اسکول میں اسکے دوست جب اپنے باپ کے بارے میں بڑ ہانکتے اور بتاتے کہ ان کے پاس فلاں فلاں چیزیں ہیں تو وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتا کہ اس کے باپ وہ ہیں جنہوں نے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا اور جن کی کمر ہمیشہ سیدھی رہتی ہے۔

اس زمانے میں اس کے دوست اپنی ماؤں کے بارے میں کسی قسم کی گپ نہیں ہانکتے تھے بلکہ کسی نے کبھی اپنی ماں کا نام تک نہیں لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی ماں پر فخر کرتا تھا کیونکہ اس کی ماں اس کے باپ کے سوا کسی اور مرد کو نہیں جانتی تھیں اور وہ اس وقت تک کام کرتی رہیں جب تک چار آدمی اپنے کاندھوں پر سوار کر کے انہیں قبرستان نہ لے گئے۔ وہ اتنی دھیمی آواز میں بولتیں جیسے سرگوشیاں کر رہی ہوں۔ کسی نے ان کی اونچی آواز نہیں سنی۔ جب وہ چلتیں تو ان کے جوتے کی آواز نہیں آتی صرف ان کے لباس کی سرسراہٹ ہی سنائی دیتی۔ انہیں کبھی زور سے چھینک آ جاتی تو شرمندہ ہو جاتیں اور معافیاں مانگتیں۔

باپ کی طرح اس کی ماں بھی چلتے پھرتے اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ جب وہ بستر پر لیٹتیں تو وہ دیوار کی جانب بستر کا تھوڑا سا حصہ ہی گھیرتیں۔ باپ گھر آئے تو فوراً ہی اٹھ جاتیں اور اس وقت تک نہ لیٹتیں جب تک باپ نہ سو جاتے۔ وہ مریں بھی اس وقت جب اس کے باپ کا پہلے انتقال ہو گیا۔ باپ مرے تو ماں نے ان کے کپڑے اکٹھے کیے اور لکڑی کے صندوق میں رکھ دیئے اور صندوق پلنگ کے نیچے سرکا دیا۔ صندوق میں ان کا شام کا لباس تھا اور سینے پر لگا ہوا میڈل۔ اس صندوق میں ماں نے فینائل کی گولیاں

بھی ڈالی دی تھیں۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب کھولیں تو وہ اسی طرح آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے باپ کی طرح شام کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے سینے پر میڈل کی جگہ ایک ٹکیہ سی تھی جو میڈل کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی طرح زرد تھا جیسے مرنے کے بعد اس کے باپ کا ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے بستر اسی طرح سپاٹ تھا جیسے اس پر کوئی گٹھری نہ پڑی ہو' جیسے اس پر وہ بالکل نہ سوئی ہو۔ ہر رات وہ دائیں کروٹ سے لیٹتی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف ہوتا اور پیٹھ اس کی طرف۔ اور اسی طرح گٹھری بن جاتی جیسے اس کی ماں بن جاتی تھیں۔ اس کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوتے' گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگے ہوتے اور سر چادر سے ڈھکا ہوتا اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی نظر نہ آتا۔

اس کا سویا ہوا جسم اسے اس کے پتی ورتا ہونے کا پورا یقین دلاتا اور اگر وہ واقعہ پیش نہ آ گیا ہوتا تو وہ اس پر بھی اسی طرح فخر کرتا جیسے اپنی ماں پر کرتا تھا۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی تصویر اس کے دماغ سے محو ہو گئی اور وہ بھول گیا کہ کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اسے وہ واقعہ یاد آیا پھر اسے بھول گیا۔ پھر یاد آیا پھر بھول گیا۔ پھر ہزاروں بار اسے یاد آیا اور ہزاروں بار اسے بھولا۔ اس نے اسے اپنے سامنے دیکھا بستر میں سوئے ہوئے نہیں بلکہ سامنے بیٹھے' اپنے ساتھ' اپنے بھائی یا خاندان کے کسی مرد کے ساتھ نہیں' اپنے محلے یا اپنے ملک کے کسی مرد کے ساتھ بھی نہیں بلکہ ایک غیر ملکی مرد کے ساتھ۔ باہر کے ایک ایسے مرد کے ساتھ جو عربی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ اپنا سرخ نائلون کا گاؤن پسند نہیں کرتی تھی بلکہ آسمانی رنگ کا وہ سوتی گاؤن اسے زیادہ پسند تھا جس پر چنبیلی کے پھول کاڑھے گئے تھے۔ یہ گاؤن وہ تھا جو شادی پر اس نے اس کے ساتھ پہنا تھا اور جب اس نے پہنا تھا تو اس وقت صرف اس کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ شادی کے بعد ان آنکھوں میں یہ پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں اور بند ہوتی رہیں پھر آخر کار وہ ختم ہی ہو گئیں۔ وہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا مگر اس کے بعد اسے اس پر شک ہونے لگا۔ یہ شک بھی کبھی ہوتا اور کبھی غائب ہو جاتا۔ اب جب بھی اسے اس کی آنکھوں میں یہ پھلجھڑیاں نظر آتیں تو وہ چوکنا ہو جاتا۔ وہ اپنے آس پاس دیکھتا۔ اگر ادھر ادھر کوئی کھڑکی ادھ کھلی بھی نظر آ جاتی تو سمجھ لیتا کہ اس کے پیچھے کوئی مرد کھڑا ہے۔

ان دنوں وہ پرانے قاہرہ میں ہی رہتا تھا۔ وہاں مکان ایک دوسرے میں جڑے ہوئے ہیں۔ پڑوسیوں کی کھڑکیاں دن بھر کھلی رہتیں یا بند رہتیں۔صرف ایک کھڑکی ایسی تھی جو آدھی کھلی رہتی۔اس کے پٹ بوسیدہ ہو چکے تھے اور اس کے پیچھے سے جو چہرہ جھانکتا ہوتا وہ بھی عمر رسیدہ اور آفت زدہ ہوتا۔مگر بہر حال وہ مرد کا چہرہ تھا۔اور کوئی مرد اس وقت تک کھڑکی کے سامنے نہیں کھڑا ہوتا جب تک وہ کسی عورت کو نہ تاک رہا ہو۔

وہ کبھی کھڑکی کے سامنے نہیں کھڑی ہوتی تھی۔صرف چھٹی کے دن جب گھر پر ہوتی تو کھڑکی کے سامنے جاتی۔کھڑکی چھوٹی سی تھی جس کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور وہاں لکڑی لگا دی گئی تھی۔ساتھ کی دیوار کی وجہ سے صرف سورج ڈوبنے کے وقت تھوڑی سی روشنی اندر آ جاتی تھی۔وہ بھی اس طرح کہ کھڑکی کی نگر کے پاس سورج کی چند کرنیں پڑ جاتی تھیں۔اس وقت وہ اپنا ہاتھ نکال کر ان کرنوں کو چھونے کی کوشش کرتی۔سردیوں میں وہ کرنیں گرم گرم محسوس ہوتیں اور ان کا عکس اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیوں کی طرح پھوٹتا محسوس ہوتا۔اس نے یہ پھلجھڑیاں دیکھیں تو چوکنا ہوگا۔اس نے اردگرد دیکھا۔اسے سورج یا اس کی کرنیں بالکل دکھائی نہیں دیں۔اسے صرف ادھ کھلی کھڑکی ہی نظر آئی۔اسے خیال آیا کہ اس کھڑکی کے پیچھے کوئی اس طرح کھڑا ہے کہ وہ خود کسی کو نظر نہ آئے۔

ذرا سی بات پر اسے غصہ آتا تو اس کی آواز بھی اپنے باپ کی طرح بہت بلند ہو جاتی۔لیکن کوئی ایسی بات نہ ہوتی کہ وہ اس پر غصہ کرتا۔وہ تو اس کی ماں کی طرح ہر وقت کام میں جتی رہتی تھی۔ماں کی طرح چلنے پھرنے سے بھی کوئی آواز نہ ہوتی۔اس کی آواز بھی سرگوشیوں کے مانند دھیمی ہی رہتی اور وہ کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتی۔مگر ایک بات ایسی تھی جس پر اسے غصہ آ جاتا وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوتی تھی۔اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ اس کی ماں کی طرح ہے۔وہ اس کے سوا اور کسی مرد کو نہیں جانتی۔لیکن اپنے باپ کی طرح وہ بھی شک وشبہ کے بغیر محبت کرنا نہیں جانتا تھا۔اور یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی عورت بغیر وجہ کے بھی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوسکتی ہے۔وہاں کوئی مرد ضرور ہوگا۔

ایک بار اس نے اس کے تھپڑ مار دیا۔اسے حکم دیا کہ کھڑکی بند کرا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ایک ہفتہ گزر گیا۔اس کی چھٹی کا دن پھر آ گیا۔اس نے دیکھا کہ کھڑکی پھر کھل گئی ہے۔اس نے اسے پھر مارا اور زیادہ زور سے مارا۔وہ سمجھتا تھا کہ وہ جتنا زور سے اسے مارے گا اتنا ہی اس کے دل کی جلن کا اظہار ہوگا اور اتنی ہی اس کی محبت ظاہر ہو

گی ۔اس کی ماں کی طرح اسے بھی اس بات پر خوش ہونا چاہئے ۔اس کے باپ اس کی ماں کو پیٹتے تھے تو وہ خوش ہوتی تھیں ۔لیکن وہ عورت نہیں ہوئی ۔

وہ اس وقت بھی خوش نہیں ہوئی جب وہ اس کے سرخ نائلون کا گاؤن خرید کر لایا۔ وہ پہلے کی طرح پرانا سوتی گاؤن ہی پہنتی رہی ۔ جب وہ معدی کے علاقے میں زیادہ کشادہ فلیٹ میں منتقل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ خوش نہیں ہوئی ۔ جب اس کی تنخواہ بڑھ گئی اور اس نے اس سے کہا کہ اب وہ کام نہ کیا کرے بلکہ گھر بیٹھے تب بھی وہ خوش نہیں ہوئی ۔ چچا عثمان ان کے گھر آئے اور اسے اپنے ہاتھ سے کھانا نہ پکانا پڑا اس وقت بھی وہ زیادہ خوش محسوس نہیں ہوتی تھی ۔حالانکہ اسے نوکر مل گیا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اسی طرح آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔اس کا چہرہ اپنے باپ کی طرح دبلا پتلا اور لمبوترا تھا۔ باپ کی طرح ہی کمر میں خم تھا' سینے پر میڈل کی جگہ ایک ٹکیہ چمک رہی تھی ۔ وہ دھات کا بلا نہیں تھا بلکہ ہرے رنگ کے کپڑے کی ٹکیہ سی تھی جس پر نائلون کے سفید دھاگے سے لکھا تھا'' Transnational''

غیر ملکی زبان میں لکھے ہوئے وہ حروف عجیب سے نظر آرہے تھے ۔ایسا لگتا تھا جیسے اس نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔لگتا جیسے وہ بیج اپنے سینے پر پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے ۔ بیج پر نئی کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ گذشتہ دس سال اس کمپنی میں کام کر رہا تھا لیکن اس سارے عرصے میں اس نے آئینے میں اپنے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ وقت کم ہوتا تھا اور ہر لمحہ قیمتی تھا اور وہ کمپیوٹر میں محفوظ کیا جاتا تھا۔اسے ڈالروں میں تنخواہ ملتی تھی ۔اس کی میز بہت وسیع وعریض تھی جس پر بانات بچھی ہوئی تھی ۔اس کا ٹیلی فون ایسا تھا جس میں کئی نمبر ایک ساتھ محفوظ ہو جاتے تھے اور چھوئے بغیر ہی وہ مطلوبہ نمبر ملا دیتا تھا۔کھڑکیوں کے شیشے باہر سے درآمد کئے گئے تھے ۔ان میں سے آپ تو باہر دیکھ سکتے ہیں باہر سے اندر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔اور اس کے سر پر نیون لائٹ اتنی روشن تھی جتنے دس لیمپ۔

وہ اس روشنی میں بیٹھی تھی ۔اس نے سرخ نائلون کا گاؤن پہن رکھا تھا جس کے گلے پر چیونٹیوں کے چھتے کی طرح گچھے بنے ہوئے تھے ۔ کمر کے پاس آکر وہ گاؤن پتلا ہو جاتا تھا وہاں مخمل کی چوڑی سی بیلٹ بندھی تھی ۔ وہ گاؤن اس کے سینے پر کنول کی طرح پھولتا چلا گیا تھا۔

''بیوٹی فل ۔''

غیر ملکی زبان میں بولا ہوا یہ لفظ اسکے کانوں میں گونجا۔ جیسے یہ لفظ وہ پہلی بار سن رہا ہو۔ جیسے اس کے معنی پہلی بار اس پر آشکار ہو رہے ہوں' پہلی بار اسے پتہ چل رہا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ اسے بولنے والا ایک مرد ہے' وہ مرد جو اس عورت کا شوہر' بھائی باپ یا اس کے خاندان کا کوئی فرد نہیں ہے بلکہ وہ تو اس کے ملک کے رہنے والا بھی نہیں ہے وہ تو بالکل ہی اجنبی اور غیر ملکی ہے۔ اس کا چہرہ گلابی ہے ناک لمبی اور مڑی ہوئی ہے اور اس نے آنکھوں پر ان سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی ہے جن میں سامنے والا اپنی شکل دیکھتا ہے لیکن دیکھنے والے کی آنکھیں نظر نہیں آتیں۔

وہ اس شخص کے سامنے سرخ نائلون کا گاؤن پہنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے غصہ بھی نہیں آ رہا تھا اور زیادہ خوشی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ناراض بھی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھی سر ہلاتی رہی جیسے خوش ہو کر پھر وہ زور سے انگریزی میں بولی۔

''تھینک یو۔''

وہ جو اس کے سامنے بیٹھا تھا اس نے سمجھ لیا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ وہ بیٹھی رہی۔ وہ کھڑی ہوئی نہ غصے ہوئی۔ وہ شخص اس کے سامنے بیٹھا اس سے فلرٹ کرتا رہا۔ اس کے نزدیک کسی عورت سے یہ کہنا کہ وہ خوبصورت ہے اس سے فلرٹ کرنا ہے۔ اور وہ کوئی اور عورت نہیں تھی اس کی بیوی تھی۔ اور وہ کوئی عام مرد نہیں تھا اپنے باپ کی طرح سخت مزاج والے مردوں میں سے تھا جو کسی مرد کو اپنی بیوی دیکھنے' اس سے ملنے' اس سے ہاتھ ملانے اور فلرٹ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے سامنے ایسا ہو جائے تو وہ عورت یا مرد یا دونوں کو مار مار کر ادھموا کر دیتے ہیں۔ یا کسی اور طرح اپنے غصے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن اس روز وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر غصے کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ جب بھی ان دونوں سے اس کی نظر ملتی تو وہ مسکرا دیتا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت بھی مسکرا رہا تھا مگر اس کا چہرہ باپ کے مردہ چہرے کی طرح زرد اور کھنچا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں اور بھی خم پڑ گیا تھا۔ اس نے اسے چھپانے کے لئے اپنے پٹھے اکڑا لئے۔ لیکن وہ چھپ نہیں سکا اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ اس نے چہرے کے اعصاب بھی اکڑائے کہ اس پر سے مسکراہٹ غائب ہو جائے لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا۔ اس نے وہاں سے جانے کے لئے قدم اٹھانے

MashalBooks.com

کی کوشش کی لیکن وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکا۔ وہ بھی اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اٹھے اور وہاں سے چلی جائے لیکن وہ بیٹھی سر ہلاتی رہی اور انگریزی میں تھینک یو کہتی رہی۔

یہ لفظ تیر کی طرح اس کے کانوں میں پیوست ہو گیا۔ اسے ایک ثبوت مل گیا تھا جو اس کے دماغ پر مرتسم ہو گیا۔ وہ بے وفا ہے جیسے شادی کے بعد وہ کبھی اس کے ساتھ وفادار ہی نہیں رہی۔ اس نے اس سے ہمیشہ بے وفائی کی ہے۔ شادی سے پہلے' شادی کے بعد' اس کے اپنے وجود سے پہلے بلکہ اس کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے بھی۔

اس کی بے وفائی پر اسے اچنبھا ہوا جیسے پہلی بار کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔ وہ اپنے آپ سے پوری توقع رکھتا تھا کہ اس تھپڑ کا جواب اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ دے گا۔ اس کا بھاری بھر کم ہاتھ ہوا میں ابھرا مگر پھر ہچکچا کر رہ گیا جیسے وہ تھپڑ اس کے اپنے یا اپنے باپ کے منہ پر پڑ گیا ہو۔ لیکن پھر اسے اس کی بے وفائی یاد آئی' اسے اپنے اوپر اور اپنے باپ پر طیش آیا اور وہ تھپڑ اس عورت کے منہ پر پڑ گیا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور اپنے آپ کو اسی طرح آئینے کے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس کا چہرہ اسی طرح کھینچا ہوا اور زرد تھا جیسے مرنے کے بعد اس کے باپ کا ہو گیا تھا مگر اب وہ لمبوترے اور دبلے پتلے دو چہروں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان اوپر سے نیچے تک ایک گہرا شگاف پڑ گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس ہاتھ پر خون کے رنگ کی ایک باریک سی لکیر تھی۔

MashalBooks.com

ایک آرٹسٹ دوست کے نام ذاتی خط

تم نے اپنا دل میرے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور نرم الفاظ میں لیکن کسی قدر سختی کے ساتھ مجھ سے شکایت کی ہے۔ سختی کے مقابلے میں نرم دلی مجھے زیادہ رلاتی ہے۔ اس لئے اب مجھے بھی یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ میں بھی تم سے شکایت کروں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک آرٹسٹ دوسرے آرٹسٹ سے یا ایک ایسی عورت کسی ایسے مرد سے شکایت کر سکتی ہے جن کے درمیان قربت کا رشتہ بہت گہرا' بہت مضبوط اور ہوا کی طرح شفاف ہو۔ اس رشتے کو اگر چہ ہم بہت گہرا اور اپنے حواس پر چھا جانے والا محسوس کرتے ہیں لیکن سچائی کے لمحے میں ہم اسے برقرار رکھنے میں قاصر رہتے ہیں۔ لگتا ہے قربت کے احساس کی یہی خاصیت ہے کہ اس میں جتنی سچائی اور حقیقت ہوتی ہے اتنا ہی وہ ہمیں خواب سا لگتا ہے۔

تم نے چونکہ مجھ سے شکایت کی ہے اس لئے مجھے بھی اجازت دو کہ میں تم سے شکایت کروں۔ میں نے آج تک کسی سے شکایت نہیں کی۔ میں نے تو اپنے ماں باپ سے بھی شکایت نہیں کی میری مرضی کے بغیر وہ مجھے اس دنیا میں کیوں لائے۔ بلکہ میں تو خدا سے بھی شکایت نہیں کروں گی کہ میری مرضی کے بغیر مجھے اس دنیا سے کیوں اٹھا رہا ہے۔ نہیں مجھے کسی سے شکایت نہیں چاہے وہ عورت ہو یا مرد یا خدا۔ کسی صورت میں بھی شکایت نہیں خواہ محبت ہو یا نفرت۔

مگر تمہیں میری زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں ہے۔

میں جب بھی لکھنے کے لئے قلم اٹھاتی ہوں تو میں عام لوگوں کے لئے نہیں لکھتی بلکہ صرف ایک شخص کے لئے لکھتی ہوں' صرف ایک شخص کے لئے جو سب سے الگ ہے۔

کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ کوشش کے باوجود میں صرف اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں لکھ سکتی' جیسے میرے اندر کوئی بہت ہی گہرا زخم ہے یا میں کسی اتھاہ کنویں میں گر گئی ہوں۔ پھر مجھے اپنے دماغ میں درد سا محسوس ہوتا ہے جو روم روم میں اترتا چلا جاتا ہے۔ کیا میرا مقدر یہی ہے کہ میری قسمت میں جو لکھا گیا ہے۔ میں اس سے مختلف زندگی گزاروں؟ یعنی میں عورت نہ رہوں (عام تصور کے مطابق) اور ڈاکٹر بھی نہ رہوں۔ میڈیکل کالج کی ڈگری کے مطابق مجھے ہونا چاہئے۔ یا میری قسمت میں یہ ہے کہ عورت سے پہلے میں ایک ذات' ایک شخصیت بنوں اور ڈاکٹر سے پہلے میں ایک آرٹسٹ بنوں؟

میں جب سے پیدا ہوئی ہوں قسمت کے ساتھ لڑنا میرا مقدر بن چکا ہے حالانکہ میرا دوسرا پہلو محسوس کرتا ہے کہ قسمت میرے ساتھ ہے اور میرا مقدر یہی ہے کہ میں ایک آرٹسٹ اور منفرد شخصیت بنوں۔ پھر وہ کونسی طاقت ہے جو مجھے عورت اور ڈاکٹر بنانے پر تلی ہوئی ہے؟ کیا جس قسمت کو ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ بھی کوئی قسمت ہے؟

ساری زندگی میں دو قیمتوں کے درمیان لٹکتی رہی ہوں جیسے کسی درندے کے جبڑوں میں پھنسا ہوا گوشت کا پارچہ۔ میں اس سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہوں اور بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے میں بھاگنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔ میں بچ گئی ہوں۔ میں گہرا سانس لیتی ہوں قلم اٹھاتی ہوں کہ ایسے فطری انداز میں جیسے موت آجاتی ہے یا ایسی سادگی کے ساتھ جیسے بچے کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے میں اپنے آپ کو کاغذ پر بکھیر دوں۔ اور پھر بچے کے بھولپن کے ساتھ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے کوئی قابلِ قدر کام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ بھی مجھے ناکافی معلوم ہوتے ہیں' جیسے مجھ سے بھی زیادہ کمزور۔ میرے آس پاس کی دنیا خوف سے لرز جاتی ہے جیسے خلوص' دیانت کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ شکاری جانور ہے۔ گویا سچائی موت یا موت سے بھی زیادہ بدتر بن گئی ہے۔

کیا موت سے بھی بدتر کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ شاید یہ ہماری زندگی ہے جو کبھی کبھی موت سے بھی بدتر بن جاتی ہے۔ یہ سوال میں اپنے آپ سے کرتی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ موت یا زندگی اس کا جواب ہے۔ اکثر اوقات تو مجھے علم ہی نہیں ہوتا کہ موت اور زندگی میں کوئی فرق بھی ہے۔ بعض اوقات مجھے اپنی زندگی موت کی طرح معلوم ہوتی ہے

MashalBooks.com

اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ موت ہی زندگی کا واحد سہارا رہ گئی ہے۔

چاقو سے بھی زیادہ گہرا زخم میرے اندر چلا جاتا ہے۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتی ہوں، دیکھتی ہوں کہ کوئی اور شخص بھی ہے جو اپنے جسم میں چاقو ترازو کئے پھر رہا ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو مجھ سے کہے۔ ''ہا، تم سچائی پر ہو، دنیا غلطی پر ہے تم سچ بولتی ہو اور اگر ہم اسے تلاش کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ دل کی لاکھوں دھڑکنوں میں سچی اور پرخلوص دھڑکن کونسی ہوتی ہے۔ ایک منٹ میں ستر مرتبہ، ایک گھنٹے میں چار ہزار مرتبہ اور ایک مہینے میں تیس لاکھ مرتبہ دل دھڑکتا ہے۔ پوری زندگی میں دل کتنی مرتبہ دھڑکتا ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو لاکھوں دھڑکنوں میں سے سچی دھڑکن کو پہچان لے؟ اور اگر ہم اسے پہچان بھی لیں تو کیا اسے اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں؟

انہوں نے جو مجھے پڑھایا تھا اس کے برعکس میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کو پیدائش سے موت تک کے برسوں میں نہیں گنا جا سکتا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دل کی دھڑکن کے علاوہ بھی ایک دھڑکن ہے اور میری زندگی کا خلاصہ اس سچی دھڑکن میں ہے جسے میں لاکھوں جھوٹی دھڑکنوں میں سے اپنی گرفت میں لے سکتی ہوں یا پھر اس سچے لفظ میں ہے جسے میں صفحات پر بکھرے لاکھوں جھوٹے الفاظ میں سے اپنی مٹھی میں لے سکتی ہوں۔

مجھے اس سچائی کا احساس ہو گیا۔ میں نے اپنے دماغ اور اپنے جسم اور اپنے سارے حواس کے ساتھ اسے محسوس کیا۔ پھر بھی کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ یہ غیر معمولی یقین غیر معمولی شک میں بدل گیا ہے اور شک ہی یقین بن گیا اور باقی ہر چیز مشکوک ہو گئی۔ ایسے مواقع پر مجھے لگتا ہے جیسے ذہنی اور جسمانی طور پر مجھے ذبح کر دیا گیا ہے۔ جیسے میں غلطی پر ہوں اور دنیا صحیح ہے۔ میں اپنے آپ کو سڑک پر چلتا گاڑی ڈرائیو کرتا دیکھتی ہوں لیکن مجھے یقین ہوتا ہے کہ مجھے ذبح کر دیا گیا ہے اور یہ جو جسم چل پھر رہا ہے میرا اصلی جسم نہیں ہے اور میرے قاتل نے میرا اصلی جسم کسی گڑھے میں دبا دیا ہے۔ میں اپنے غیر حقیقی جسم کو اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھتی ہوں۔ یہ جسم لوگوں سے مصافحہ بھی کرتا ہے اور مسکراتا بھی ہے اور یہ دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ وہ صحیح ہے اور میں غلط ہوں......

میں اپنا ذبح کیا ہوا جسم گڑھے سے باہر کیسے نکالتی ہوں؟ اپنے مفلوج ہاتھ کو قلم پکڑنے پر کیسے مجبور کرتی ہوں۔ میں نہیں جانتی لیکن کسی بھی وقت جب میں بیٹھی ہوتی ہوں یا کھڑی ہوتی ہوں یا کار ڈرائیو کر رہی ہوتی ہوں تو میں اپنے جسم کو خود بخود اٹھتا دیکھتی

MashalBooks.com

ہوں۔ پھر میں تو بیٹھی ہوتی ہوں لیکن اپنے آپ کو کھڑا دیکھتی ہوں' اور کھڑی ہوتی ہوں تو بیٹھا دیکھتی ہوں یا لوگوں سے اپنے آپ کو دور بھاگتا دیکھتی ہوں جبکہ میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں یا لوگوں کی طرف اپنے آپ کو بھاگتا دیکھتی ہوں جبکہ میں تنہا ہوتی ہوں۔

جیسے کوئی شخص موت کے روبرو کھڑا ہو اس طرح ڈر کے مارے کانپتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم واقعی کانپ رہا ہے اور میری آواز لرز رہی ہے۔ لیکن یہ بس ایک پل کے لئے ہی ہوا۔ جیسے کسی بولنے والے کو خاموش کرانے کے لئے میں ایک چیخ ماروں یا کسی خاموش آدمی کو بولنے پر مجبور کر دوں۔

ایسے ہی ایک لمحے میں بولنے والا میرے میڈیکل کالج کا سپروائزر تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن سے دنیا بھری پڑی ہے' ایک ایسا ڈاکٹر جو اپنی پیشہ وارانہ کامیابی کو اس زمین کے ساتھ تولتا ہے جو اس نے اس دنیا میں حاصل کی ہے۔ دنیا کے ان مردوں میں سے ایک مرد جو عورت کو عورت ہی سمجھتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہتا تھا جیسا سلوک وہ ساری دنیا کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے لئے انکار آسان اور قدرتی تھا کیونکہ میں فطری طور پر ایک شخصیت ہوں عورت نہیں۔ اور فطری طور پر میں ایک آزاد آرٹسٹ ہوں ڈاکٹر نہیں۔ میرے لئے انکار ایسا ہی تھا جیسے سانس لینا۔ لیکن اس کے لئے انکار بہت بڑا صدمہ تھا موت سے بھی بڑا صدمہ۔

یہ بات مجھے ہمیشہ پریشان کرتی ہے کہ مرد انکار کیوں برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور سے وہ انکار اگر عورت کی طرف سے ہو۔ میں نے ان میں سے ایک کو ایسے موقع پر دیکھا اس کے چہرے سے خون جیسے بالکل ہی نچڑ گیا تھا اور چہرہ ایسا سفید ہو گیا تھا جیسے مردہ۔ یا اس انکار نے اسے بھی اپنا اصل چہرہ دکھا دیا تھا اور اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ چہرہ تو کسی مردہ کا چہرہ ہے۔ یا پھر خود اس کے دل نے بھی اسے پھٹکارا تھا اور اچانک اسے ان دونوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔

اس نے نہایت تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کہا تھا کہ آج تک کسی ملازم نے میرے ساتھ بحث نہیں کی اور کسی عورت کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ اس نے اپنی شاندار میز کی دراز کھولی اور وہ سرٹیفکیٹ نکال کر دکھائے جن سے اس کی برتری ظاہر ہوتی تھی اور اس کی بہادری اور جرات کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے کمرے کی دیواریں ایسے سنہری فریموں سے لدی ہوئی تھیں جن میں مصر اور بیرون ملک

MashalBooks.com

سے ملنے والے سٹرفکیٹ جڑے ہوئے تھے۔ پھراس کے چہر پرخون دوڑ گیا اب وہ سفید نہیں تھا۔ چھوٹی سی گردن پر اس کا سر اونچا اٹھا ہوا تھا گردن میں ٹائی (امریکی انداز میں) لگی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ کے اعصاب نے اکڑ کر اس کے سینے کو پھلایا ہوا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا سینہ پھلائے ہوئے تھا جیسے وہ اپنے جسم کے پٹھوں کو بھی یہ یقین نہ دلا سکا ہو کہ اس نے کتنے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ گویا اندرونی طور پر وہ ایسی شکست کھا چکا ہے جس کا کسی اور کو علم نہیں ہے۔

غالباً اس نے دیکھ لیا یا محسوس کیا کہ میں واحد شخصیت ہوں جو اس کی ناکامی کی گواہ ہے۔ اور چونکہ میں عورت ہوں اس لئے اس کی ناکامی کی اذیت اور بھی بڑھ گئی۔ اس کی خوشی غصے میں بدل گئی اور پسند ناپسندی میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے ترقی دینے اور ساتویں آسمان تک اٹھانے کی خواہش اس ارادے میں بدل گئی کہ مجھے کسی گہرے گڑھے میں گاڑ دیا جائے اور اس گڑھے کو موم سے بند کر دیا جائے۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی کہ میں نے کسی مرد کو ناکام ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں بہت سے مرد ہیں اور ان کی ناکامیاں بھی بہت ہیں۔ صرف میں اکیلی عورت ہوں۔ لیکن عورت ہونے کے باوجود، صرف واحد عورت ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ مردوں کے اس ہجوم میں کم سے کم ایک مرد ایسا ضرور ہوگا جو ناکام نہیں ہے۔ میں جو بھی قدم اٹھاتی، جس کو جس طرح بھی حرکت دیتی، خواہ وہ کسی سڑک پر چلتے ہوئے سر کی جنبش ہوتی، دانستہ یا نادانستہ طور پر ذہنی یا جسمانی یا دونوں طرح کی بیک وقت حرکت ہوتی مجھے احساس ہوتا کہ میں ایسے ہی شخص کی تلاش میں ہوں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنہا مرد نہیں ہوگا دو تین یا چار اور بھی ہوں گے، یقیناً ان کی تعداد اتنی ہی ہوگی کہ انگلیوں پر گنا جا سکے لیکن وہ ہیں ضرور اور چونکہ وہ ہیں اس لئے انہیں تلاش کرنا میرے لئے لازم ہے۔

میں نے تمہیں ایک بار دیکھا۔ میں تیز تیز قدموں سے جا رہی تھی۔ میں اس سپروائزر سے ناراض تھی۔ اور میں جب غصے میں ہوتی ہوں تو تیز تیز چلتی ہوں۔ غصہ مجھے ایک اور میدان جنگ کا راستہ دکھاتا ہے۔ مجھے راستے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی بن جاتا ہے اور وقت گزرنے کا احساس اتنا اذیت ناک ہو جاتا ہے کہ میں دوڑنے لگتی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ میدان کارزار میں پہنچنے سے پہلے مجھے موت نہ آلے گویا یہ میری زندگی کی آخری جنگ ہے اس کے بعد میں مرجاؤں گی۔ لیکن

چونکہ میں پہلے ہی مردہ ہوں اس لئے موت مجھے خوف زدہ نہیں کرتی۔ اور چونکہ میں موت سے نہیں ڈرتی اس لئے لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جنگ سے میں زندہ بچ کر نکلتی ہوں اور اس سرزمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہوں۔

اس روز تم نے میرے غصے کی وجہ پوچھی اس لئے میں نے تمہیں بتا دیا۔ اس سے پہلے میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا اور یہ جانتی بھی نہیں تھی کہ کیا بتاؤں۔ اگر جانتی بھی ہوتی تو نہیں بتاتی کیونکہ میری بات سننے والا اور اس پر اعتبار کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اور میں کہتی بھی کیا؟ یہ کہ ساری دنیا غلطی پر ہے اور میں صحیح ہوں؟ یہ کہ ساری دنیا پاگل ہے اور تنہا میں صحیح الدماغ ہوں؟ یہ کہ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں الفاظ میری رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں؟ یہ کہ جب میں ہاتھ میں قلم تھامتی ہوں تو ساری دنیا میرے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کھانے پینے، پیار محبت اور جنس اور موت کی خوشیاں بھی غائب ہو جاتی ہیں؟ اور میں ایک ایک جملے میں ایسے سما جاتی ہوں جیسے کوئی محبت یا موت میں کھو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کسی چیز میں نہیں کھوئی؟ کیا میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ آرٹ میرا انتخاب ہے اور میرا عورت ہونا ایک اتفاق ہے؟ یہ کہ بچپن سے میں نے اپنی نسوانیت کو مسترد کیا ہے کیونکہ یہ میں نہیں ہوں، یہ میری بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس دنیا کی بنائی ہوئی ہے جو مردانگی سے تو بھری پڑی ہے لیکن مردوں سے عاری ہے۔ کیا میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کو عقل و ہوش سے کم اور بے شمار محبت کے ساتھ چلایا ہے؟ یہ کہ میڈیکل ڈپلومہ کے باوجود میں عقل و ہوش کی تعریف نہیں کرتی کیونکہ عقل و دانش تو ہمارے اردگرد کی دنیا نے پیدا کی ہے۔ اور چونکہ دنیا جھوٹ ہے اس لئے اس نے عقل و دانش کو بھی جھوٹا بنا دیا ہے۔ دنیا کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے ہمیں اس عقل و دانش کے خلاف بھی بغاوت کرنا چاہئے۔ تو کیا میں یہ باتیں کروں گی تو دنیا اس کا اعتبار کرلے گی؟

اس دن تم نے کہا کہ تم میرا اعتبار کرتے ہو تو اس پر میں اتنی حیران ہوئی تھی کہ مجھے خود اس کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں تمہارے سامنے بت بنی بیٹھی رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر اور بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں اٹھی اور چلی گئی۔ مجھے یاد نہیں میں کیوں گئی تھی۔ شاید کوئی آ گیا تھا یا ٹیلی فون کی یا دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ بہرحال میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد ہم بہت کم ملے۔ کبھی کبھی تیز تیز چلتے ہوئے سڑک پر تمہاری جھلک نظر آ جاتی۔ میں بھی تیز چل

MashalBooks.com

رہی ہوتی۔ کبھی کبھی میں تمہاری لکھی ہوئی کوئی چیز دیکھتی اور ٹھہر جاتی۔ کبھی چہروں کے سمندر میں تمہارا چہرہ نظر آتا میں ہاتھ ہلاتی کہ شاید تم نے بھی مجھے دیکھ لیا ہو۔ اگر تم نہ دیکھتے تو میں مڑ جاتی اور دوسری طرف چلی جاتی۔ میرے تیز تیز قدموں کے باوجود مجھے احساس ہوتا کہ تمہارا کوئی حصہ میرے ساتھ ہے' ہمیشہ سے میرے ساتھ ہے۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتی کہ کیا تمہیں بھی احساس ہے کہ وہ وقت جو گزر گیا اس میں میں نے بھی تمہیں اپنا کچھ حصہ دیا تھا۔ وہ حصہ جو میں اب واپس نہیں لے سکتی۔ بعض اوقات میں تمہارے پاس آنے کے لئے کار میں بیٹھ جاتی مگر پھر سوچتی کہ میں تم سے کیا کہوں گی۔ کیا تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے درمیان کیا ہوا تھا۔ کیا واقعی کوئی ایسی بات ہوئی تھی کہ تم اسے یاد رکھو؟

میں نہیں جانتی کہ کچھ ہوا تھا۔ اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا؟ کیا وہ کوئی ایسی بات تھی جسے گواہی کے طور پر یادداشت نے محفوظ کر لیا ہو؟ کوئی ایسی بات ہے کہ اگر میں تمہارے پاس آ جاؤں تو میرے پاس اس کے لئے جواز موجود ہو؟ ایک وجہ جسے میں لفظوں میں بیان کر سکتی ہوں وہ یہ ہو سکتی تھی کہ میں تم سے یہ کہلواتی کہ ''تم کیوں آئی ہو؟''

کتنے برس گزر گئے تمہارے پاس آئے ہوئے۔ میں نہیں جانتی میں وقت کا حساب برسوں سے نہیں لگاتی۔ میرے نزدیک میری ساری زندگی میں ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہو سکتی جسے میں اپنے دماغ' اپنے جسم اور اپنی تمام محفوظ توانائی کے ساتھ محسوس کر سکتی ہوں۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ جو میرے حواس ہیں میرے اندر صرف وہی حواس نہیں ہیں' سطح کے نیچے دل کی دھڑکن کے علاوہ ایک اور نبض بھی ہے' دماغ کے نیچے ایک اور دماغ بھی ہے' جسم کے نیچے ایک اور جسم بھی ہے۔ کیا میرے اندر ایک اور پوری عورت بھی ہے؟ ان میں سے میں کون ہوں؟ کون اصلی ہے اور کون نقلی؟ میں ہمیشہ محسوس کرتی رہی کہ اصلی اور نقلی کے درمیان صرف بال برابر کا فرق ہے اور میں ہمیشہ اس دریا کو پار کر کے نامعلوم مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہی مگر معلوم اور نامعلوم دونوں مجھے اپنے جسم میں خوف کی طرح رینگتے محسوس ہوئے۔ میرے خیال میں میڈیسن اور سرجری نے جسم کا خوف اور آرٹ نے نامعلوم کا خوف دور کر دیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو جسم کے تمام حصوں کے بارے میں اس طرح بات کرنے کی اجازت دی جیسے شاعر دل کی بات کرتے ہیں۔ اور میں اپنے آپ سے پوچھتی کہ صرف دل کی دھڑکن کی بات کرنے کی ہی اجازت کیوں ہے؟

تم سے ملے کتنے برس گزر گئے مجھے یاد نہیں۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ بے سوچے سمجھے اس لمحے میں جب میں نے معلوم اور نامعلوم' یقین اور بے یقینی کی دیوار کے پار چھلانگ لگائی' جب میں نے محسوس کیا کہ دنیا غلط ہے اور میں صحیح ہوں اور جب میں نے اپنی زندگی سے اس شخص کی طرح ناطہ توڑا جو موت کی خواہش میں مرا جاتا ہو یا میں نے اچانک زندگی کی خواہش میں موت سے رشتہ توڑا ہو......ایسے لمحے میں میں ٹیلی فون کی طرف بڑھی اور تمہارا نمبر گھمایا۔ ایک مرد کی آواز آئی کہ تم موجود نہیں ہو۔ میں نے اپنا نمبر اور اپنا نام اسے بتایا اور کہا کہ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔

میں نے کتنے برس انتظار کیا؟ مجھے یاد نہیں اور میں نے یاد کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں اداس ہوگئی اور اداسی نے میری یادداشت کو کھرچ دیا۔ اس لئے مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ جب بھی میں یاد کرتی اداس ہو جاتی۔ حتیٰ کہ میں پھر اداس نہیں رہی اور پھر بھولی بھی نہیں۔ ایک موقع پر جب کچھ یاد آ رہا تھا تو مجھے علم ہی نہیں ہوا کہ یاد رکھنے کی کیا بات ہے۔ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہوا تھا کہ حافظہ اسے محفوظ رکھتا۔ کوئی شہادت کوئی ثبوت کوئی جواز کچھ بھی نہیں تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا تو میں بیان کر سکتی۔

ایک بار میں نے تمہیں دور سے دیکھا۔ میں ٹھہر گئی اور تمہاری طرف بڑھی۔ مگر پھر جلدی سے مڑ کر دوسری طرف چل دی' اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے کہ یہ محبت ہے یا محبت نہیں ہے۔ تمام باتیں اتنی پیچیدہ ہو گئی ہیں۔ یہاں تک کہ محبت اور عدم محبت اور سیاہ اور سفید کے درمیان تمیز ہی مشکل ہوگئی۔ نابینا انسان کی طرح میں اپنا سر پکڑ کر کھڑی ہوگئی اور آنکھیں بند کر لیں یا کھول لیں۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا دنیا نے میری آنکھوں سے بینائی چھین لی ہے؟ کیا دنیا نے آنکھوں اور دل کے اعصاب ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ دنیا نے ہر چیز کے پرزے پرزے کر دیئے ہیں' انسانیت کو مالکوں اور غلاموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ فرد کو دماغ اور جسم میں منقسم کر دیا ہے' جسم کو باعزت اور بے عزت اعضا میں بانٹ دیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ دنیا نے میرے علاوہ ہر چیز کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ مردوں' عورتوں بچوں کو' حاکموں اور محکوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سیاسی تقسیم اور جنسی تقسیم کو علیحدہ کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ سچا فن کار اپنی سچائی کے ساتھ سیاسی داؤ پیچ میں جا پھنستا ہے اور اپنے فن کو جنس کی دلدل میں گرا دیتا ہے۔ سیاست اور جنس دونوں فن اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ لیکن وہ فنکار جو اپنے فن کے

ذریعہ کسی نام کسی زمین کے حوالے سے محکوموں کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے' جو اپنی انسانیت کے ناطے کسی شکل میں بھی حکمرانوں کو مسترد کرتا ہے' جو کسی قسم کی محبت کے واہمہ میں جنس کی طرف راغب ہوتا ہے' جو دنیا میں موجود ہر چیز کے ساتھ کمٹمنٹ کرتا ہے جبکہ جانتا ہے کہ دنیا اسے تقسیم کر دے گی' وہ فن کار یقین رکھتا ہے کہ اس کے پرزے نہیں کئے جا سکتے۔

تمہارے پاس گئے مجھے کتنے برس ہو گئے؟ ایک بار میں نے اخبار کھولا۔ حالانکہ میں ایسی دنیا میں اخبار نہیں دیکھتی جہاں قلم اور جسم جھوٹ بولتے ہیں۔ شاید میں اسے باورچی خانے کے شیلف پر بچھانا چاہتی تھی۔ میں نے اخبار میں تمہارا چہرہ دیکھا اور محتاط سیاہ لفظ پڑھے۔ چھپے ہوئے الفاظ بھی ایسے لگ رہے تھے جیسے تمہارا اپنا خط۔ الفاظ کی سچائی میں وہ جنبش تھی جو تمہاری آنکھوں میں اس وقت تھی جب تم نے مجھے دیکھا تھا۔ تم نے جب وہ لکھا تھا تو کیا تم اس وقت مجھے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے؟ لیکن تم نے تو مجھے برسوں سے نہیں دیکھا اور یادداشت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو برسوں پہلے کی بات کہاں محفوظ رکھ سکتی ہے اور اگر کچھ ہوا ہی نہ ہو تو پھر......؟

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے سوچا تمہارے دفتر کے سوا اور کہیں سے بھی وہ ہو سکتا ہے۔ تمہارے پاس آئی تو میں نے سوچا کہ تم عام باتیں کرو گے جیسے دو شناسا لوگوں یا دوستوں کے درمیان ہو سکتی ہیں۔ مگر تمہارے الفاظ عام نہیں تھے اور تمہاری شکایت بھی عام نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے حیران ہونا چاہئے تھا میں حیران نہیں ہوئی اور جہاں تک مجھے صدمہ ہونا چاہیے تھا مجھے صدمہ نہیں ہوا۔ میں نے تمہیں بتایا کہ ایک بار تم سے رابطہ کی کوشش کی تھی مگر تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تم نے اعتبار نہیں کیا اور کہا کہ اگر میں آنا چاہتی تھی تو آ جاتی۔ میں نے اصرار کیا کہ میں نے بہت کوشش کی لیکن تمہیں یقین نہیں آیا۔ تم کہتے رہے کہ اگر تم ملنا چاہتیں تو کوئی طاقت تمہیں نہیں روک سکتی تھی۔ تم بھی بڑی تلخی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ تم میرا اعتبار نہیں کر رہے تھے۔ تمہاری تلخی سے مجھے جتنی تکلیف پہنچتی جاتی اتنی ہی میری حیرت بڑھتی جاتی۔ شاید تم نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی طرح حیرت دیکھ لی تھی۔ میں اتنی حیرت زدہ تھی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اتنے برسوں کے بعد کیا یادداشت ان باتوں کو محفوظ رکھ سکتی ہے جو ہوئی ہی نہیں؟ اگر ہوئیں تو کیا وہ ایک گزرتے لمحے کی طرح تھیں جیسے روشنی کا کوندا جو ظاہر ہوتا ہے اور فوراً

غائب ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ دل کی دھڑکن جو ایک بار دھڑکتی ہے اور پھر دوسری لاکھوں کروڑوں دھڑکنوں میں کھو جاتی ہے۔

تم نے خدا حافظ کہنے کے لئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو میں جانتی تھی کہ تم مجھے پیار کرو گے اور میرے چہرے پر تمہارا وہ بوسہ نہایت نرم و نازک اور شفاف سا ہو گا۔ جیسے ایک بچہ دوسرے بچے کو پیار کرتا ہے جو معصوم بھی ہوتا ہے۔ اور اتنا معصوم بھی نہیں ہوتا بالکل وجدانی احساس کی طرح۔

تم نے کاغذ کے پرزے پر مجھے اپنا فون نمبر دیا اور میں نے وعدہ کیا میں فون کروں گی۔ میں نے خلوص کے ساتھ وہ وعدہ کیا تھا لیکن جیسے ہی میں پرہجوم سڑک پر پہنچی ہر چیز مجھے ایک خواب اور ایک واہمہ سا محسوس ہوئی۔ تمہاری شکایت ایسے لگی جیسے ایک زمانے کے بعد ملنے والے دو دوستوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ بوسہ بھی عام سا ہی محسوس ہوا جیسے دو دوستوں یا ساتھیوں میں کیا جاتا ہے۔ اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں اسی رفتار سے اس وقت تک چلتی رہوں گی حتٰی کہ میں مر جاؤں گی اور نہ جانے کتنے سال گزر جائیں گے۔ اور میں اصل اور نقل میں تمیز نہیں کر پاؤں گی۔ میں موت کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتی اور شک اور یقین کے درمیان موجود بال برابر فرق کو مٹانے کی صلاحیت میرے اندر نہیں ہے۔ کیا میں صحیح ہوں اور دنیا غلطی پر ہے؟ یا پھر دنیا صحیح ہے اور میں غلط ہوں؟ اگر اس وقت تم نے میرا یقین نہیں کیا تو مجھے تم سے اس کی شکایت ہے۔ اگر تم نے یقین کر لیا تھا تو تم سے میری شکایت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

MashalBooks.com

دو سہیلیاں

آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں ابھی تک وہی تیس سال پہلی والی چمک تھی۔ دن کی روشنی کی طرح تیز اور چبھنے والی چمک۔ اس کے ہاتھ اسے اپنی بانہوں میں جکڑنے کے لئے خود بخود اٹھ گئے۔ لیکن اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اکڑ گئی تھیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے زور سے بھینچ لے یا ہلکے سے' ایک ملی میٹر برابر فاصلہ رکھے کہ دونوں کے سینے ایک دوسرے سے مس نہ ہوں۔ اس کا سینہ ویسا ہی تھا جیسے تیس سال پہلے تھا' وہی بینگنی رنگ کا پیدائشی نشان۔ سفید لباس کے اندر کی چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کے پٹھے سخت اور اکڑے ہوئے تھے جیسے وہ کچھ لئے بغیر سب کچھ دے دینا چاہتی ہوں۔ اس کے دل کے دروازے ایسے کھلے تھے جیسے کسی بھولی بھالی لڑکی کا دل جسے مرد نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔ جیسے اس نے تین مرتبہ اپنی کوکھ میں بچوں کو نہ پالا ہو اور تین بچوں کو جنم نہ دیا ہو۔

دونوں کو ملے تیس سال ہو چکے تھے۔ اگر وہ راستے میں کہیں مل جاتیں تو ایک دوسرے سے نظریں چرا کر گزر جاتیں۔ پہلے یہ حال تھا کہ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ وہ نہ ملتی ہوں یا ٹیلی فون پر یہ نہ بتاتی ہوں کہ کل دن میں یا رات کو ان پر کیا گزری۔ کلاس میں بھی ہر وقت وہ سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ ایک دوسرے کو نئی نئی باتیں بتاتیں' شرارتوں بھر قصے سناتیں یا لطیفے کہتیں۔ وہ ہنسی روکنے کے لئے اپنی سانس دبا لیتیں جس سے ان کے سینوں میں اتنی ہوا بھر جاتی کہ ایک دم بھبھا کا نکلتا اور وہ کھانسنے لگتیں جیسے انہیں اچھو لگ گیا ہو۔ اس پر بلیک بورڈ کے سامنے ٹہلتے ٹہلتے استانی ٹھہر جاتیں اور چاک کی طرح اپنی

پتلی اور لمبی انگلی کا اشارہ کر کے ان دونوں کو کلاس سے باہر نکال دیتیں۔ چھٹیاں اور تفریحی پروگرام اس وقت مزہ دیتے جب سہیلی ساتھ ہوتی۔ سہیلی کے بغیر سمندر' ریت' گھر' اسکول' سڑک بلکہ ساری دنیا اور ساری زندگی اکتا دینے والی اور خوشیوں کے بغیر ہوتی۔ اس وقت اس کے پاس ماں' باپ اور چچا چچی کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ ان سے وہ کیا بات کر سکتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں اسکے سوا اور کیا جانتے تھے کہ ہر سال کتنے نمبر لے کر پاس ہوئی ہے یا پھر وہ یہ دیکھتے رہتے کہ اس کا جسم کہاں کہاں اور کتنا بھر گیا ہے۔ اس کا جسم بھر رہا تھا۔ اس کا سینہ ماں کے برابر ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے چوڑے سینے کے نیچے مٹھی برابر ایک چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا بھی ہے جو اس وقت زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے جب اس کی نظریں کھڑکی کی جھری میں سے لمبی ناک والے اس چہرے پر پڑتی ہیں جس چہرے پر بڑی بڑی کالی مونچھیں ہیں۔ اس کا نام اس کی زبان پر نہیں آ سکتا تھا۔ جب وہ دونوں کمرہ بند کر کے باتیں کرتیں تو اس کی ماں کواڑوں کو کان لگا کر سنتیں اور اس وقت اطمینان کا سانس لیتیں جب ان دونوں کی باتوں میں کسی لڑکے کا نام نہ آتا۔ وہ دونوں صرف لڑکیوں کے نام ہی لیتیں۔ ہر نام کے بعد ماں غور سے سنتیں کہ نام کا آخری حرف کیا ہے کیونکہ نام کیا آخر میں ''ہ'' کا حرف لگ جانے سے لڑکا لڑکی بن جاتا۔ جیسے امین' امینہ اور نبیل' نبیلہ بن جاتا۔ ان کی باتیں رات بھر جاری رہتیں' دن بھر جاری رہتیں اور سال بھر جاری رہتیں حتیٰ کہ امتحان کا وقت آ جاتا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتی رہیں اور تعلم کا آخری سال آ گیا۔ پھر ان کی شادیوں نے ان کے نام کے آخر میں مرد کا نام لگا دیا۔ اور اچانک وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں۔

اس کے ہاتھ ابھی اٹھے ہوئے تھے' بازو کی مچھلیاں اکڑی ہوئی تھیں۔ وہ جھجک رہی تھی کہ اسے جکڑ کے بازوؤں میں لیا جائے یا دونوں سینوں کے درمیان فاصلہ چھوڑ دیا جائے۔ ماتمی لباس میں اس کی چھاتیاں اسی طرح بھاری اور لٹکی ہوئی تھیں جیسے اس کی ماں کی وہ چھاتیاں تھیں جن سے سات بچوں نے دودھ پیا تھا اور جو کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں' ہمیشہ ہی بھر جایا کرتی تھیں۔ جب سے اس کا دودھ چھڑایا گیا اسی وقت سے ماں کے ساتھ اس کی نفرت بڑھتی چلی گئی تھی۔ پھر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کا اپنا سینہ ماں کے سینے سے مس ہوا ہو۔ کبھی وہ سفر سے لوٹتی تو گردن میں بانہیں ڈالنے کی رسم صرف ہاتھ ملانے یا دونوں بازو پھیلانے تک ہی محدود رہتی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ برقرار رہتا۔ دونوں کے خلا

میں مٹی کے ذرے اڑتے رہتے وہ اپنے باپ کے بالوں بھرے چوڑے سینے کے ساتھ اس طرح سکڑ کر لیٹتی جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ۔ اس وقت اس کے کانوں میں باپ کی میٹھی آواز آتی۔ وہ اپنا سر ان کی موٹی گردن پر رگڑتی پھر آگے بڑھ کر بھری مونچھوں کو چھوتی جن سے تمباکو کی بدبو آتی ہوتی باپ اس کے گال پر چٹکی لیتے اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتی۔ وہ زور سے ان کی مونچھیں کھینچتی تو وہ منہ کھول کر قہقہہ لگاتے جس سے ان کے تمباکو سے سیاہ دانت نظر آنے لگتے۔ اس کی ماں فرش پر جھاڑو لگاتے لگاتے اس کی طرف دیکھتی۔ ان کے چہرے کے سامنے گرد اڑ رہی ہوتی اور ان کی پلکوں پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوتی۔ باپ چپکے سے اس کے کان میں کہتے۔ ''تمہاری ماں جلتی ہیں تم سے۔'' وہ آواز اس کے کانوں کے پردے سے ٹکراتی اور الفاظ اس کی شریانوں اور اس کے خون میں تیرتے چلے جاتے اور اس کے دماغ کے خلیوں کو ایک خیال میں تبدیل کر دیتے۔ ایسا خیال جو فولاد کی طرح ٹھوس ہوتا۔ ''ماں اس سے جلتی ہیں۔ اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ وہ دونوں رقیب ہیں ایک دوسرے کی۔''

باپ ماں سے پہلے ہی مر گئے۔ اسے یقین تھا کہ انہیں ماں نے مارا ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہتی بس اس کی آنکھوں میں شکایت بھری رہتی۔ یہ شکایت اس وقت تک بھری رہی جب تک ماں کے آخری دموں میں وہ ان کے چوڑے سینے سے الگ ہوگئی وہ آخری بار اسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بازو پھیلائے ہوئے تھی مگر ان کا سینہ مل نہیں رہا تھا۔ ماں نے ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرنے سے پہلے پوری طاقت سے آنکھیں کھولیں اور کچھ کہے بغیر اسے غور سے دیکھا۔ ان پر حقیقت کا انکشاف اب ہو رہا تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ گویا دونوں پر حقیقت روشن ہوئی اور دونوں کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ زمین کی طرح وسیع ہوتی گئیں، اتنی جتنی وسیع وہ خود حقیقت تھی جس کا علم انہیں اتنی دیر سے ہو رہا تھا۔ لیکن فاصلہ ختم نہیں ہوا تھا وہ دیوار کی طرح دبیز ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کا سینہ اب وہ سینہ نہیں رہا تھا بلکہ اس کے ہاتھ کے نیچے زمین کی طرح کھنچ گیا تھا اور اس کا رنگ سیمنٹ جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کے کمرے کا رنگ غائب ہو چکا تھا اور ایک دوسرے پر رکھی اینٹیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس پر اس کے باپ کی تصویر تھی جو سر پر کوئی بہت بڑی چیز رکھے بیٹھے تھے۔ ان کا کاندھوں پر ایسے ابھار تھے جیسے اور کاندھے رکھے ہوں۔ ان کی مہربان مسکراتی آنکھوں میں کوئی اور آنکھیں بھی تھیں جو مہربان نہیں تھیں اور مسکرا بھی نہیں رہی تھیں۔ اس نے جھنجھلا

کر اپنے ہاتھ پھر اٹھائے۔ وہ دونوں سینوں کے درمیان کا فاصلہ کم کرنا چاہتی تھی۔ دوسرا سینہ مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ جما ہوا تھا' دل کھلا ہوا تھا اور سب کچھ دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کی چھاتیاں بڑی اور لٹکی ہوئی تھیں اور احساسِ جرم سے بھری ہوئی تھیں اور اتنی بھاری تھیں جتنی زمین۔ اس نے تیس سال اپنی ماں کے ساتھ نفرت کرتے گزارتے تھے۔ اسے اپنی بھاری چھاتیوں سے بھی نفرت تھی جو اس کی ماں سے ملتی تھیں۔ نفرت اس کی چھاتیوں سے سارے جسم میں پھیل جاتی اور اسے یقین نہیں آتا کہ اس کے باپ سے زیادہ کوئی بھی مرد اس سے محبت کر سکتا ہے۔ باپ کی موت کے بعد اس نے ایک شخص سے شادی کی جسے وہ اپنے سینے میں چھپائے پھری۔ شادی کے بعد اس کے نام کے آخر کا نسوائی حصہ غائب ہو گیا۔ اس کے بالوں بھرے سینے پر وہ ماں کے پیٹ والے بچے کی طرح سکڑ کر لیٹنے کی کوشش کرتی اور اس کی لمبی لمبی مونچھیں نوچتی اور کھل کھلا کر ہنستی۔ لیکن اس نے اس شخص کو کبھی قہقہہ لگاتے یا مسکراتے نہیں دیکھا۔ پھر بھی اس کے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ کسی مسکراہٹ' خوشی اور مسرت کے بغیر۔ اس کیلئے تو کھانے پینے کی خوشی بھی جاتی رہی تھی۔ اس کے لئے صبح کی خوشبو بھی حرام ہو گئی تھی۔ اب صرف وہ گرد و غبار تھا جو فرش پر جھاڑو دیتے ہوئے اس کے ساتھ چلتا۔ صوفے پر اس کی چھوٹی بیٹی اس شخص کے پیروں پر جھولتی یا وہ بیٹی کے لئے گھوڑا بن جاتا۔ سورج کی ان کرنوں میں سے جس میں مٹی کی ذرے اڑ رہے ہوتے وہ ان دونوں کی طرف دیکھتی۔ اچانک ان کے قہقہے رک جاتے مسکراہٹ غائب ہو جاتی اور ان چھ آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھا جاتی۔ وہ سہاگ رات سے ہی اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا مگر ابھی تک وہ صابن سے اس کی پیٹھ دھلاتی۔ اس کے سینے پر گھنے بالوں کی گھاس اگ آئی تھی۔ جب بھی وہ باہر سے آتا وہ اسے اپنی بانہوں نے لیتی اور اس کا بھاری سینہ بیٹے کے سینے سے چمٹ جاتا۔ اس وقت اس کے کانوں میں بیٹے کے باپ کی روکھی آواز گونجتی۔ ''اب وہ بچہ نہیں ہے۔ اب وہ پورا خچر ہو گیا ہے۔'' اور اس کا بیٹا ہونٹوں میں کہتا۔ ''یہاں آپ کے سوا اور کوئی خچر نہیں ہے۔''

اوپر کے ہونٹ پر سفید بال تھے اور تمبا کو سے کتھی پڑ جانے والے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ سارے دانت گلے سڑے تے۔ چوڑا چکلا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہاتھ بیٹے کے منہ پر پڑے یا ماں کے منہ پر۔ مگر بیٹا قد میں باپ سے

بھی اونچا نکل گیا تھا اور پورا مرد بن چکا تھا۔ اس لئے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر وہ ہاتھ ماں کے منہ پر ہی پڑا۔

وہ خود بھی کسی کے تھپڑ مارتی ' تو ہچکچاتی کہ وہ تھپڑ چاروں بیٹوں میں سے کسی ایک کے منہ پر پڑے یا چھوٹی بچی کے منہ پر۔ اور ہر بار وہ بچی کے منہ پر ہی پڑتا کہ وہ سب سے چھوٹی اور سب سے کمزور تھی اور پھر وہ لڑکی تھی۔ لیکن رات کو پھر وہ اسی کے ساتھ سوتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ اسے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ صبح کو وہ شوہر کے لئے چائے بناتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ کام پر چلا جاتا تو وہ بھی اپنے کام پر جاتی۔ اس کے واپس آنے سے پہلے خود واپس آ جاتی۔ وہ آ کر دیکھتا کہ گھر کا سارا کام ہو چکا ہے۔ فرش صاف کیا جا چکا ہے' برتن اور کپڑے دھوئے جا چکے ہیں اور کھانا پکایا جا چکا ہے۔

اس کے بازو اسے جکڑنے کے لئے پھیل جاتے۔ وہ چاہتی کہ دونوں سینے مل جائیں مگر اس کے ہاتھ اکڑ جاتے اور دونوں سینوں کے درمیان کا فاصلہ اسی طرح برقرار رہتا۔ آنکھیں دوسری آنکھوں میں جھانکنے سے ہچکچاتیں لیکن آنکھوں میں چمک وہی قائم رہتی جو تیس سال پہلے تھی۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد جھریاں پڑ چکی تھیں لیکن چہرہ اسی طرح کھنچا ہوا تھا۔ چھوٹے مگر سخت سینے کے نیچے دل اسی طرح دھڑکتا تھا۔ اس کی پیٹھ کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے اور بازوؤں کے اعصاب ایسے دھڑک رہے تھے جیسے دل دھڑکتا ہے۔ نوجوانی کے روشن شعلے کی طرح اس کی رگوں کی حدت خون میں تیرتی ہوئی اس کے بازوؤں سے ہوتی کاندھوں تک اور پیٹھ تک جا رہی تھی۔ اس کے تمام اعصاب دھڑک رہے تے اور برسوں کا سفر طے کر کے وہ واپس اسی عمر میں پہنچ گئی جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ سر کے پیچھے رہنے والا پرانا درد ہلکا پڑ گیا اور اس کے کندھوں پر رکھا سر کا بوجھ' اس کی گردن' اس کے سینے اور اس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گا۔ اسے ہر چیز ہلکہ پھلکی محسوس ہونے لگی حتٰی کہ اس کی وہ بھاری چھاتیاں جن سے وہ پریشان رہتی تھی وہ بھی اب اکڑے ہوئے پٹھوں کے ساتھ اس کی پسلیوں پر اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اس کے دل کی ہوا کی نالیاں جو بند رہتی تھیں اب کھل گئی تھیں اور اس کی ناک اور منہ سے ہوا اس طرح خارج ہو رہی تھی کہ اسے جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ اس کی بانہیں اور آگے ہوئیں اور اس نے جھنجھلا کر دو سینوں کا فاصلہ دار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دماغ میں تانبے کی گیند کی طرح ایک ہی خیال بیٹھ گیا تھا۔ اس کی زندگی میں ہر چیز تبدیل ہو چکی تھی سوائے اس خیال

کے۔اس کے جسم میں تبدیلیاں آ گئی تھیں‘ اس کا چہرہ بدل چکا تھا۔آنکھوں کا رنگ‘ پٹھوں کی ہیبت‘ اس کے زمین چلنے کا انداز حتیٰ کہ خود زمین بھی تبدیل ہو چکی تھی۔اس کے دماغ کے خلئے بدل کر ان کی جگہ نئے خلیوں نے لے لی تھی۔مگر صرف یہی ایک خیال تانبے کی گیند کی طرح اس کے دماغ میں رکا رہا تھا۔تانبے کی ایسی گیند کی طرح جس کا حجم کامن پن کے سر کے برابر تھا جو سر کے پیچھے سے تھوڑا آگے‘ بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں حرکت کرتا رہتا تھا۔لیکن اسی طرح وہاں برقرار رہتا تھا۔

اسے اپنی بانہوں میں جکڑنے کے لئے اس کے بازو اسی طرح پھیلے ہوئے تھے۔دونوں سینوں کے درمیان فاصلہ اسی طرح تھا‘ وہی ایک ملی میٹر کے برابر۔اس نے اپنا سر اس نازک گردن کے ساتھ رگڑا اس کی نبض ماں کے دل کی طرح دھڑک رہی تھی۔اس کی گردن سے خون اس کی پیٹھ کی طرف دوڑا اور ریڑھ کی ہڈی سے ہوتا دوبارہ سر میں تانبے کی اس زنگ آلود گیند سے ٹکرایا۔اس نے تمباکو کی بو سونگھنے کے لئے اپنا منہ اس کی گردن کے ساتھ لگا دیا۔اس کا ہاتھ مونچھیں نوچنے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس کی انگلیاں بغیر بالوں کے ہونٹ سے ٹکرا کر واپس آئیں۔اس کا سینہ تمباکو کے بجائے بکائن کی خوشبو سے بھر گیا۔اپنے پھیلے ہوئے بازو کے اوپر اس نے اکھڑے پینٹ والی دیوار دیکھی اور اس پر سیاہ فریم میں ٹنگا اسے اپنے باپ کا چہرہ دکھائی دیا۔ان کے ماتھے پر اتنی گہری لکیر تھی جیسے بہت گہری خندق۔اس خندق کے نیچے دو آنکھیں تھیں اس کے شوہر کی سی آنکھیں۔اس نے اس کے ساتھ تیس برس گزارے تھے۔اس کی آنکھیں دیکھے بغیر اس نے ایک ہی بستر پر تیس برس گزارے تھے۔دن گزرتے رہے‘ راتیں گزرتی رہیں مگر اس نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔وہ صبح کو حسبِ معمول اس کے جانے کے بعد اپنے کام پر جاتی اور اس کے لوٹنے سے پہلے گھر آ جاتی۔روزانہ کی طرح وہ فرش پر جھاڑو لگاتی‘ برتن مانجھتی اور کپڑے دھوتی۔

ایک دن وہ خلافِ معمول وقت سے پہلے گھر آ گئی۔اس نے دیکھا وہ کسی اور عورت کو اپنی بانہوں نے سمیٹے پڑا ہے۔اس کی پیٹھ اس کی طرف تھی اس لئے اس نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔اس کے سامنے دوسری عورت کا سینہ تھا۔چھوٹی چھوٹی اور تنی ہوئی چھاتیوں والا سینہ جو کچھ لئے بغیر سب کچھ دینے پر آمادہ نظر آتا تھا۔اس کے سینے پر خاص دل کی جگہ بینگنی رنگ کا پیدائشی نشان تھا۔

MashalBooks.com

اس کے دماغ میں جو تصویر مرتسم ہو گئی تھی اسے صاف کرنے کی دھن میں اس کے ہاتھ کے پٹھے بری طرح اکڑے ہوئے تھے۔ وقت کالے بادل کی طرح اس کے سر پر چھایا ہوا تھا۔ درد کسی گہری خندق کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ اس کا شوہر گھر سے چلا گیا اور مر گیا۔ پھر وہ واپس آ گیا۔ اب اس کے جسم پر کالی چادر تھی جیسے عورت کی نقاب جس نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ دیوار سے اس کی آنکھیں باپ کی آنکھوں کی طرح اسے گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مسکراہٹ نہیں تھی۔ چوڑے ماتھے پر خندق جیسی گہری لکیر تھی بالکل اس کے باپ کی طرح۔ اسکی بانہیں آخری بار اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچنا چاہتی تھیں۔ مگر ایک سینے اور دوسرے سینے کے درمیان فاصلہ اسی طرح تھا اور ہوا کسی بڑی دیوار کے برابر دبیز تھی جس پر زخم کی طرح گہرا شگاف تھا۔ لیکن آنکھ کی سیاہ پتلی میں چمک اتنی ہی تیز تھی جیسے دن کی روشنی۔ اور اس کے سینے پر بینگنی رنگ کا پیدائشی نشان تھا۔ اس کے دل کا دروازہ کھلا تھا' کچھ لئے بغیر سب کچھ دینے کو تیار۔ خون تیزی کے ساتھ دل سے سر کی طرف دوڑا۔ اس تیزی میں دماغ کے خلیوں سے زنگ آلود گیند کا ایک ٹکڑا ٹوٹا اور خون کے ساتھ بہہ گیا۔ وقت آنکھوں پر پگھل گیا جیسے نقاب آنسوؤں میں بہہ جائے۔ سینہ کسی فاصلے کے بغیر سینہ کے ساتھ مل گیا اور سر سے سر ایسے جڑ گئے جیسے اسکول کے زمانے میں جڑ جاتے تھے۔ ان کی سانسیں گھٹ گئیں یہاں تک کہ سینے ہوا سے بھر گئے اور ان کا دم گھٹنے لگا۔ مقید ہوا جھٹکوں کے ساتھ ان کی ناکوں اور منہ سے نکلنے لگی جیسے بچے بیک وقت ہنس بھی رہے ہوں اور رو بھی رہے ہوں۔ دیوار کے روزن سے کھلی آنکھ نے انہیں دیکھا اور رونے پر قہقہے چھا گئے۔

MashalBooks.com

تصویر

اگر اس کا ہاتھ اتفاق سے نبویہ کے کولہوں پر نہ پڑتا اور اس کی انگلیوں میں نرم نرم گوشت کی گول گول گیند نہ آئی ہوتی تو نرجس کی زندگی اسی طرح گزر رہی ہوتی۔ نبویہ کپڑے دھو کر جھاڑ رہی تھی تو نرجس نے اس کے جلابیہ میں دو چھوٹے چھوٹے گول گول ابھار لرزتے دیکھے اور حیران رہ گئی۔ اسے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ نبویہ کے کولہے بھی ہیں۔ نبویہ پچھلے برس گاؤں سے ان کے گھر کام کرنے آئی تھی۔ وہ سوکھی چھڑی کی مانند دبلی پتلی تھی۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کا آگا کونسا ہے اور پیچھا کونسا۔ اگر اس کا نام نبویہ نہ ہوتا تو سب اسے لڑکا ہی سمجھتے۔

نرجس اپنے کمرے میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی اس نے گردن گھما کر اپنا پچھایا دیکھنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے اپنے جلابیہ میں بھی دو گول ابھار تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر اس نرم نرم گوشت کو محسوس کیا۔ وہاں بھی وہی نرم نرم گیندیں تھیں۔ اس کے بھی کولہے بھر رہے ہیں۔

اس نے پیچھے سے کپڑا اٹھایا اور گردن پوری طرح موڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی گردن کے ساتھ وہ کولہے بھی مڑ گئے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے جسم کا نچلا حصہ ایک ہی جگہ رہے اور گردن اس طرح مڑے کہ کولہے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں لیکن وہ ایسا نہیں کرسکی۔ جیسے ہی اس کا سر مڑتا اس کا دھڑ بھی مڑ جاتا۔ اوپر کا حصہ

MashalBooks.com

مڑتا تو نچلا حصہ بھی اسکے ساتھ ہی دوسری طرف ہو جاتا۔ وہ پریشان ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو پیچھے سے نہیں دیکھ سکتی۔ مگر نبویہ کو دیکھ سکتی ہے۔ اسے لگا کہ اس نے انسان کی ایک کمزوری دریافت کر لی ہے۔ انسان اپنے اس جسم کو پوری طرح خود نہیں دیکھ سکتا جس کے ساتھ وہ پیدا ہوا ہے۔ اور جسے وہ ہر جگہ لئے پھرتا ہے۔ البتہ وہ دوسروں کا جسم دیکھ سکتا ہے۔

اسے خیال آیا کہ وہ باورچی خانے میں جا کر نبویہ سے کہے کہ وہ اس کے کولہے دیکھ کر بتائے کہ وہ کیسے ہیں۔ ان کی شکل کیا ہے؟ کیا وہ بیٹھتے وقت لرزتے ہیں یا جب وہ چلتی ہے تو ان میں لرزش پیدا ہوتی ہے؟ کیا وہ باہر کو ایسے نکلے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظر ان پر پڑے؟

وہ باورچی خانے جانا ہی چاہتی تھی مگر پھر ٹھہر گئی۔ وہ نبویہ سے ایسی بات کیسے کرے گی؟ نبویہ تو نوکرانی ہے وہ تو اس سے باتیں بھی نہیں کرتی۔ وہ تو نبویہ کو حکم دیتی ہے اور نبویہ کسی مشین کی طرح ''اچھا'' اور ''جی اچھا'' میں ہی جواب دیتی ہے۔

یہ سوچ کر اسے مایوسی ہوئی اور اس نے اپنے کولہے خود ہی دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اپنے کولہے ننگے کر لئے' سختی کے ساتھ زمین پر اپنے پاؤں جمائے اور سر کو موڑا اور آنکھیں ٹیڑھی کر کے کولہوں پر نظریں جمائیں۔ مگر اس کا سر کتنا مڑ سکتا تھا اور اس کی آنکھیں آخر کتنی پیچھے تک جا سکتی تھیں۔ اس نے پھر اپنے اعصاب اکڑائے اور پھر کوشش کی۔ ابھی وہ آئینے کے سامنے کولہے ننگے کئے گردن موڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر اپنے باپ کی آنکھوں پر پڑی اور وہ ڈر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ آنکھیں سچ مچ اس کے باپ کی نہیں ہیں بلکہ دیوار پر ٹنگی ان کی تصویر کی ہیں پھر بھی اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کپڑے اٹھائے اور پہن لئے۔ اس نے اپنے کولہے چھپا لئے تھے۔ وہ اپنے باپ کی آنکھوں سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکتی تھی۔ وہ انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے باپ کو دیکھتی اسے محسوس ہوتا کہ اس نے انہیں اچھی طرح نہیں دیکھا۔ وہ انہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اس دنیا میں آئے تیرہ سال ہو گئے تھے لیکن ہر روز وہ اپنے باپ کی صرف پیٹھ ہی دیکھتی تھی۔ جب وہ اس کی طرف سے مڑتے تو وہ نظریں اونچی کرتی اور ان کے لمبے چوڑے قد کو دیکھتی۔ اس نے کبھی انہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا

تھا کہ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے بات کی ہو۔ وہ اس کی طرف دیکھتے تو وہ سر جھکا لیتی اور وہ جب بھی اس سے بات کرتے تو وہ بات چیت نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف حکم یا ہدایات ہوتی تھیں۔ وہ بھی خالص مشینی انداز میں نہایت سعادت مندی اور فرمانبرداری کے ساتھ ''جی'' اور جی بہت اچھا'' ہی کہہ سکتی تھی۔ اس کے باپ نے جب اسے حکم دیا کہ اسکول جانا بند کرو اور گھر میں بیٹھو تو اس نے اسکول جانا بند کر دیا اور گھر بیٹھ گئی۔ جب انہوں نے حکم دیا کہ پردے سے باہر نہ جھانکو تو اس نے کھڑکی سے جھانکنا بند کر دیا۔ اس سے کہا گیا کہ کھڑکی بند کر دو تو اس نے کھڑکی بند کر دی۔ حتیٰ کہ انہوں نے جب اسے حکم دیا کہ رات کو سونے سے پہلے وضو کر کے نماز ضرور پڑھا کرو تا کہ پاکیزہ خواب آئیں تو اس نے وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی اور پاکیزہ خواب دیکھنے لگی۔

اب اس کی نظریں باپ کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھنا چاہتی تھی' ان کے سامنے اپنا سر جھکانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے باپ کو جاننا چاہتی تھی' ان سے بے تکلف ہونا چاہتی تھی' لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی اپنی اور باپ کی نظروں کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ رہا۔ اس وقت بھی اگر چہ اس کی ناک تصویر کے شیشے کے ساتھ ٹکرا رہی تھی لیکن ان کے درمیان اب بھی فاصلہ موجود تھا۔ اسے اپنے باپ کا چہرہ بہت بڑا نظر آ رہا تھا' ان کی ناک بہت لمبی اور آگے کو جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور دور دور تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اسے اپنے باپ کی بڑی سی میز یاد آئی جس پر رکھے کاغذوں کے انبار کے پیچھے سے ان کی لمبی ناک ابھرتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سامنے کھڑے لوگوں کی لمبی قطار پر ایک نظر ڈالتے۔ لوگ ان کے سامنے گڑگڑاتے پھر وہ اپنا بڑا سا سر کاغذوں کے درمیان ہلاتے اور ان کی کھردری انگلیوں میں دبا قلم تیزی سے کاغذ پر چلنے لگتا۔ وہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہتی۔ اس کی اپنی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگتیں وہ سانس روکے بیٹھی رہتی۔ کیا وہ اتنے بڑے آدمی کی بیٹی ہو سکتی ہے؟ اس کے باپ کھڑے ہوتے تو میز کے پیچھے کسی چٹان کی طرح بلند نظر آتے۔ ان کی لمبی ناک جیسے چھت کو چھو رہی ہوتی۔ سڑک پر وہ ان کے ساتھ چلتی تو فخر سے اس کا سر بلند ہو جاتا۔ سب لوگ اس کے باپ کو دیکھ رہے ہوتے۔ جو منہ بھی کھلتا وہ اس کے باپ کی تعریف میں ہی کھلتا۔ اس کے ننھے ننھے کان ان سرگوشیوں کو سنتے جو لوگ کر رہے ہوتے۔ ''دیکھو یہ کیسا پہاڑ جیسا انسان ہے' اور یہ اس کی

بیٹی ہے نرجس' جو اس کے ساتھ جا رہی ہے۔'' چلتے چلتے اس کے باپ جب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور اپنی انگلیاں اس کے ننھے سے ہاتھ پر کس لیتے تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا' اس کا سانس تیز ہو جاتا اور وہ اپنے باپ کا ہاتھ چوم لیتی۔ اس کے ہونٹ باپ کے بالوں بھرے ہاتھ سے مس ہوتے تو اس کی ناک میں تیز سی خوشبو آتی ...... یہ اس کے باپ کی خاص خوشبو ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ خوشبو کیا ہے مگر وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اسے ان کی خوشبو آ جاتی ہے۔ جب وہ اس کے کمرے میں آتے ہیں تو ان کی خوشبو بستر پر' الماری میں' اسکے کپڑوں میں بلکہ سارے کمرے میں بس جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے باپ کے کپڑوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جاتی ہے' انہیں پیار کرتی ہے انہیں اچھی طرح سونگھتی ہے۔ وہ بستر کے اوپر لگی ان کی بڑی تصویر کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتی ہے جیسے ان کی پرستش کر رہی ہو۔ وہ عبادت نہیں جو ان دیکھے خدا کی جلدی جلدی کی جاتی ہے' بلکہ جیتے جاگتے دیوتا کی پوجا' ایسا دیوتا جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے' جس کی آواز اپنے کانوں سے سنتی ہے اور جس کی خوشبو اپنی ناک سے سونگھتی ہے۔ وہی تو اسے کھانے اور پہننے کو دیتے ہیں۔ ان کا کتنا بڑا دفتر ہے' ان کے پاس کتنے بہت سے کاغذ ہیں اور ہر بات جانتے ہیں۔ وہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اتنی تیزی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اسے چکر سا آ جاتا ہے۔

نرجس نے دیکھا کہ وہ اپنے باپ کی تصویر کے سامنے اس طرح جھکی ہے جیسے عبادت کر رہی ہو۔ وہ کھڑی ہوگئی انکساری کے ساتھ اپنا سر جھکایا اور باپ کے ہاتھوں پر ایسے ہی بوسہ دیا جیسے وہ ہر رات سونے سے پہلے دیا کرتی ہے......بستر پر لیٹی تو اس کے ابھرے ہوئے کولہے پلنگ سے لگتے محسوس ہوئے' ایک نامعلوم مزہ کے احساس کے ساتھ اسے جھرجھری سی آ گئی جو سارے جسم میں پھیل گئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھ کولہے پر رکھے۔ گوشت کے دو گول گول ابھار اس کے اور بستر کے درمیان پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ ہٹا لئے کہ اب انہیں نہیں چھوئے گی۔ لیکن ابھرے ہوئے کولہے تو جیسے اس کے پیٹ میں گھسے جا رہے تھے۔ وہ سونا چاہتی تھی۔ اس نے کروٹ لے لی۔ مگر اس کی ہر سانس کے ساتھ باہر کو نکلے کولہے بستر سے لگ رہے تھے۔ اس نے سانس روک لیا' لیکن پھر ایک دم اس کا منہ کھلا اور اب اور بھی زور زور سے سانس آنے لگا۔ اتنی زور زور سے کہ پورا پلنگ ہلنے لگا اور چرچراہٹ سی بھی ہونے لگی۔ اسے لگا کہ بستر کی چرچراہٹ کی

MashalBooks.com

آواز خاصی بلند ہے۔ برابر کے کمرے میں لیٹے اس کے باپ بھی یہ آواز ضرور سن رہے ہوں گے اور وہ جان گئے ہوں گے کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے۔

اس خیال سے وہ ڈر گئی۔ اس نے سانس روکنے کی کوشش کی تاکہ پلنگ کی چرچراہٹ ختم ہو جائے لیکن سانس زیادہ دیر روکنے سے اسے ایک دم اچھو لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جسم نے اس زور سے جھٹکا کھایا کہ پورا پلنگ ہل گیا اور بہت زور سے چرچر کی آواز آئی۔ اس نے بستر سے چھلانگ لگا دی......

وہ فرش پر گری تو پلنگ کی چرچر ختم ہو گئی۔ اب صرف اس کے اپنے سانس لینے کی آواز تھی جو آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تو اسے یاد آیا کہ اس نے لیٹنے سے پہلے وضو تو کیا ہی نہیں تھا اور نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ یہ سوچ کر اسے تسلی ہوئی کہ اس کے دل میں جو شیطانی خیالات آئے تھے اس کی وجہ یہی تھی۔ اس کے ناپاک جسم میں شیطان داخل ہو گیا تھا۔

نرجس وضو کر رہی تھی تو اسے باورچی خانے میں سے ہلکی سی آواز آئی۔ اس کا مطلب ہے نبویہ ابھی نہیں ہوئی؟ اس نے باورچی خانے کے دروازہ کو ہولے سے دھکا دیا۔ مگر وہ نہیں کھلا۔ اس نے دروازہ کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اس نے تیز سانسوں اور کھینچا تانی کی آواز سنی۔ وہ مسکرائی۔ اسے تسلی ہوئی نبویہ اپنے نئے کولہے دریافت کر رہی ہے! دروازہ کے ساتھ سر لگائے لگائے اس نے چابی والے سوراخ سے اندر جھانکا۔ وہ چھوٹا سا صوفہ خالی تھا جس پر نبویہ سویا کرتی تھی اور اسے وہاں کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ اس نے پھر غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے ننگے گوشت کا ایک ٹیلا سا دیکھا جس کے دو سر تھے اور وہ فرش پر ہل رہا تھا۔ ایک سر نبویہ کا تھا جس کی دو لمبی چوٹیاں تھیں اور دوسرا سر اس کے باپ کا تھا۔ ان کی لمبی ناک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے لگا کہ وہ غش کھا کر گر جائے گی مگر اس کی آنکھیں جیسے دروازے کے سوراخ کے ساتھ ہی چپک گئی تھیں' جیسے وہ دروازہ کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی نظریں گوشت کے اس ٹیلے پر جیسے جم گئی تھیں۔ نبویہ کا سر نیچے تھا جو کوڑے کی ٹوکری کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ اس کے باپ کا سر اوپر سنک سے ٹکرا رہا تھا۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے اپنا رخ بدل لیا۔ اب نبویہ کا سر سنک کے نچلے حصے سے ٹکرا رہا تھا اور باپ کا سر کوڑے کی ٹوکری کے ساتھ تھا...... پھر دونوں سر اس میز کے نیچے غائب ہو گئے جس پر برتن رکھے جاتے تھے۔ اب چار ٹانگیں

اور بیس انگلیاں نظر آ رہی تھیں جو ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں اور عجیب انداز میں ہل رہی تھیں جیسے بے شمار ٹانگوں والا سمندری جانور یا آکٹو پس۔

نرجس کو کچھ پتہ نہیں کہ کیسے اس نے اپنی آنکھیں اس سوراخ سے ہٹائیں اور کس طرح اپنے کمرے میں واپس آئی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کا ننھا سا سر لرز رہا تھا اور اسے چکر آ رہا تھا۔ اس کی تھکی تھکی نظریں اس کے گول گول کولہوں پر پڑے جو لرز رہے تھے۔ بے خیالی میں اس نے ہاتھ پیچھے کر کے اپنے کولہے ننگے کیے تو اس کی نظر اپنے باپ کے چہرے پر پڑ گئی۔ وہی پرانی کپکپی اس پر طاری ہو گئی او کپڑا نیچے گر گیا مگر اس نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا اب وہ سر جھکائے بغیر اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ باپ کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور ان کی لمبی ناک نے چہرے کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ پھر رات کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ مکڑی کا جالا اڑ کر آیا اور اس لمبی طوطے والی ناک کے ساتھ چمٹ گیا۔

نرجس آگے بڑھی کہ تصویر سے جالا صاف کر دے مگر اس کے منہ سے تھوک کی ایک پھوار سی نکلی جو باپ کی تصویر پر بکھر گئی۔ وہ جالا تصویر کے ساتھ اور بھی چپک گیا۔ اس نے جالا تصویر سے ہٹا دیا لیکن اب اس کے ساتھ وہ تصویر بھی نکل آئی تھی جو اس کے تھوک سے لتھڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ تصویر پرزے پرزے ہو کر فرش پر بکھر گئی......

MashalBooks.com

مضمون

بڑی سی انگیٹھی میں دہکتی آگ کی حرارت آہستہ آہستہ لال لال خون کی شکل میں اس کے گالوں پر نمودار ہوئی اور گرم گرم آسودگی کے احساس کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کے پوروں تک سرایت کرتی چلی گئی' لیکن آگ کی حدت سے سرخ ہو جانے والی انگلیوں میں پھنسا ٹھنڈا قلم کورے کاغذ کی خالی سطروں پر بلا مقصد کیڑے مکوڑے بناتا رہا۔

وہ میز پر سے اٹھا اور انگیٹھی کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے قلم کو آگ کے قریب کیا کہ قلم کے ٹھنڈے ٹھار جسم میں بھی تھوڑی سی حرارت پیدا ہو جائے۔ بھڑکتی آگ نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ اس نے انگیٹھی پر نظریں گاڑ دیں۔ اسے عجیب سی کاہلی کا احساس ہوا جیسے اس پر نشہ سا چھا رہا ہو۔ بلکہ نشہ سے بھی زیادہ ایک سرور کی کیفیت اس پر طاری ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ عمر بھر اسی طرح آگ کے سامنے بیٹھا رہے اور اس کے جوڑ جوڑ میں یہ حدت سرایت کرتی رہے۔ مگر انگلیوں میں پھنسے قلم نے اسے یاد دلایا کہ آج ہی مضمون لکھ کر اخبار کو دینا ہے۔ وہ کوشش کر کے اٹھا اور جماہی لیتا ہوا پھر میز کے سامنے کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے قلم کاغذ کی طرف بڑھایا اور لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کاکروچ کی ٹانگوں کی طرح ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچنے سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔

معاً اسے اپنا اسکول کا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ بیالوجی کی کلاس میں بیٹھا کاکروچ کی مونچھیں اور ٹانگیں بنا رہا ہے۔ اسے کاکروچ اور بیالوجی سے سخت نفرت تھی۔ اس کا جی

چاہتا تھا کہ اسکول کی دیوار پھلانگ کر بھاگ جائے۔ مگر اسے اپنے باپ کی آنکھوں کا خیال آ جاتا جو کھانے کی میز پر رکھی ساگ کی پلیٹ پر سے جھانکتی ہوئی بڑے پیار سے اسے سمجھا رہی ہوتیں۔ دل لگا کر پڑھو بیٹے تاکہ تم بھی اپنے چچا بیگ کی طرح بڑے آدمی بن جاؤ۔ چچا کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ اپنی لمبی سی کار سے اتر رہے ہیں ان کے ساتھ ان کی موٹی تازی گوری چٹی بیوی ہے پیچھے پیچھے ان کی فیشن ایبل سمارٹ لڑکی ہے وہ تینوں ان بچوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے سرخ اینٹوں والے اپنے مکان کی طرف بڑھ رہے ہیں کچی گلی میں جو گردوغبار اٹھ رہا ہے اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے انہوں نے اپنی ناکیں ریشمی رومال سے ڈھانپ رکھی ہیں۔ وہ ایک بچے کی آواز سنتا ہے جو ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے کان میں کہہ رہا ہے...... ''تمہارے چچا۔ صاحب بہادر۔ چچا۔''

وہ بڑے فخر سے اپنے چچا کی طرف دیکھتا ہے اور مٹی میں سنا ہاتھ آگے بڑھائے ان کی جانب دوڑتا ہے۔ اس کا سانس چڑھا ہوا ہے وہ ہانپتے ہوئے کہتا ہے۔ ''مرحبا چچا جان' مرحبا۔''

اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر میز پر گر گیا۔ وہ اداسی کے ساتھ مسکرایا اس نے کاغذ پر بنے کاکروچ کی ان ٹانگوں کو دیکھا جنہوں نے اسے دور ماضی میں پہنچا دیا تھا۔ پھر اس نے نرم نرم ریشمی رومال اپنی ناک پر رکھا تاکہ بیش قیمت مردانہ خوشبو گرد آلود ماضی کے سائے کو دور بھگا دے۔ میز پر سے اس کی نظریں اٹھیں تو سامنے دیوار پر نہایت قیمتی فریم میں لگی بیوی کی تصویر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دل میں جیسے کچھ ہوا۔ وہ بیوی کے چہرے کے سرد اور تیکھے نقوش دیکھنے لگا۔ تکبر کے ساتھ ذرا سی اوپر کو اٹھی ناک' پتلے اور سختی کے ساتھ بھنچے ہوئے ہونٹ کہ وہ ساری عمر یہ جان ہی نہیں سکا کہ ان پر پیار کس طرح کیا جائے۔ تیز چبھتی ہوئی آنکھیں جن کی نیلاہٹ میں سے کراہت اور نخوت ٹپکتی تھی۔ اس نے دانتوں میں ہونٹ دبائے اور سوچنے لگا کہ شادی کے لئے ظاہری شکل و صورت کی کیا ضرورت ہے اور خدیجہ کی خوب صورتی اس کے کس کام آئی؟ پھر اس کی نظریں بیوی کی تصویر سے ہٹ کر دوبارہ سفید اور کورے کاغذ پر جم گئیں۔ اس نے قلم اٹھایا اور جلی حروف میں مضمون کا عنوان لکھا۔ ''سوشلزم کے لئے ہمارا راستہ'' اس کے نیچے اس نے موٹی سی لکیر کھینچی اور مضمون کا آغاز سوچنے لگا۔ اس نے انگلیوں میں اس مضبوطی کے

MashalBooks.com

ساتھ قلم جکڑا ہوا تھا جیسے وہ قلم سے الفاظ نچوڑنا چاہتا ہو۔لیکن قلم نے پھر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ پھر کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں بنا رہا تھا۔کبھی وہ کاکروچ کی ٹانگیں بناتا تو کبھی عنوان کے نیچے اور لکیریں کھینچنے لگتا۔ کچھ نہیں تو وہ پہلی لکیر کو ہی اور موٹا کرنے لگا۔اس کا سیدھا ہاتھ یہ کیڑے مکوڑے بنا رہا تھا تو الٹا ہاتھ داڑھی مونچھوں کے بالوں میں الجھا ہوا تھا۔ بے خیالی میں وہ کبھی مونچھوں کے بال اکھاڑتا تو کبھی داڑھی میں خلال کرنے لگتا۔

پھر اس نے گردن آگے جھکائی' آہستہ سے قلم جھٹکا اور کاغذ پر نب رکھی مگر پھر اسے احساس ہوا کہ اس کاغذ پر کاکروچ کی اتنی ٹانگیں اور اتنے کیڑے مکوڑے بن چکے ہیں کہ اب وہ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔اس نے کاغذ کو مروڑا اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ نیا کاغذ نکالنے کے لئے اس نے میز کی دراز کھولی۔ دراز میں رکھی چھوٹی سی کتاب پر اس کی نظر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔کتاب کا نام تھا۔''سوشلزم کی جانب پیش قدمی'' اس نے کتاب اٹھالی۔ جلدی سے اسے کھولا ور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں چمک آٹھیں' یوں لگے جیسے اس پر وجدانی کیفیت طاری ہونے لگی ہے۔اس پر الہام نازل ہو رہا ہے۔اس نے کتاب بند کی اور نیا کاغذ نکال کر میز پر رکھا۔ پھر اس نے لکھنا شروع کر دیا۔''میں ایک کسان ہوں' ایک غریب کسان کا بیٹا......''

اب اس نے قلم کاغذ پر سے اٹھایا اور اپنے لکھے ہوئے جملے کو دیکھا کہ کیسا لگتا ہے۔اسے غریب کا لفظ اچھا نہیں لگا وہ لفظ اس نے کاٹ دیا۔اس کی جگہ اس نے''مفلوک الحال'' لکھا۔ یہ لفظ پڑھ کر وہ خوش ہوا......ایک مفلوک الحال کسان کا بیٹا...... یہ لفظ بہتر ہے اس سے اس کا ماضی زیادہ آبرومندانہ معلوم ہوتا ہے۔

اب اس کا سینہ جوش سے بھرا ہوا تھا اور قلم تیزی کے ساتھ کاغذ پر چل رہا تھا۔ اس کے دل ودماغ غربت وافلاس کی بے پایاں عظمتوں سے مملو تھے اور اس کا قلم لکھ رہا تھا کہ اس کے باپ دادا نے مفلسی اور محتاجی کی زندگی کتنی عزت اور کتنی شان کے ساتھ گزاری۔ابھی وہ بے بسی' غریبی اور تباہ حالی کے قصیدے لکھ ہی رہا تھا کہ اچانک لاشعور کی گہرائی میں دبی کرب ناک یادوں کے غار کا پتھر ہٹ گیا اور محرومی اور محتاجی کی بے شمار تصویریں اور لاتعداد شکلیں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ میلے اور دھول میں اٹے جلابیہ میں لپٹی اس کی ماں اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔اس نے سر پر میلا کالا رومال

باندھا ہوا تھا جس کا لمبا سرا پیچھے چوٹی کی طرح گندھا ہوا تھا۔ پیروں میں لوہے کے کڑے تھے، پنڈلیاں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ پھٹی ایڑیوں کے ساتھ تھکے اونٹ کی طرح پھٹر پھٹر کرتی زمین پر پیر گھسیٹ رہی تھی۔ وہ خود پھٹے پرانے میلے کچیلے جلابیہ میں لپٹا چولہے کے سامنے بیٹھا راکھ کرید رہا تھا۔ اس کی مکڑی کی سی پتلی پتلی ٹانگیں سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ اس کے باپ کی گھٹی گھٹی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ''یہ میرے ساتھ کھیتوں میں کام کرے گا'' اور اس کی ماں اپنی تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''نہیں، یہ اسکول جائے گا''۔ پھر اسے جمائی آئی اس کا اوپر کا ہونٹ اور اوپر کو اٹھا اور اس کے مسوڑھے ننگے ہو گئے اور باہر کو نکلے دانت اور باہر آ گئے۔ پھر یکدم اس کے سامنے چچا کے لمبے دانت اور ان میں سے جھانکتے لال لال مسوڑھے آ گئے۔ وہ چچا کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ پھٹی پتلون میں پھنسے گھٹنوں کو اس نے دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا اس کے خالی پیٹ میں مسلسل گڑگڑ ہو رہی تھی۔ اس کے چچا نے اس طرح اسے بیٹھے دیکھا تو منہ کھول کر جمائیاں لینا شروع کر دیں۔ چچا کے باورچی خانے سے چٹ پٹے کھانوں کی خوشبو جتنی تیز ہوتی جاتی تھی چچا کی جمائیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اپنے خالی پیٹ میں بھی چوہے دوڑنے لگتے تھے۔ اس نے اپنا منہ پھیر لیا جیسے اس نے چچا کو جمائیاں لیتے دیکھا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کے دل میں چچا کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی جو نرم گرم صوفے پر کسی قیمتی بیل کی طرح پھسکڑا مارے بیٹھا تھا۔ اسے چچا کی بیوی سے بھی سخت نفرت تھی جس نے کھانا لانے میں اتنی دیر کر دی تھی۔ وہ کافی دیر بعد باورچی خانے سے باہر نکلی تھی اور انہیں کھانے کے لئے بلایا تھا۔ اس کے مٹاپے کا یہ عالم تھا کہ جب وہ گابھن گائے کی طرح چلتی تو اس کی رانیں ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتیں۔ اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف بھی نفرت ابھر رہی تھی جو کھیت جوتنے کے سوا اور کسی کام کا نہیں تھا۔ اسے اپنی ماں سے بھی نفرت تھی جس نے اسے اپنے بھوکے پیٹ میں پالا اور بدصورتی اور غربت کے سوا اسے کچھ بھی نہیں دیا۔ اسے ان تمام لوگوں سے نفرت تھی جو نرم بستر پر سوتے ہیں۔ اسکول جاتے ہیں اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی ان کے پاس اتنا بچ رہتا ہے کہ جب تک پوری طرح سیر نہیں ہو جاتے اس وقت تک کھاتے رہتے ہیں۔

اسے ہر چیز سے نفرت تھی۔ یادوں سے، اسکول سے، طالب علموں سے، جاڑوں

MashalBooks.com

کے موسم سے' ٹھنڈی ہواؤں سے جو رات کو' دیوار کی درزوں سے اس پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ اسے دن سے اور دھوپ سے بھی نفرت تھی جو ساری گرمیاں اسکے سر کو جلاتی تھی۔ اسے مالک مکان سے بھی نفرت تھی جو ہر مہینے کرایہ مانگتا تھا۔ ان کرایہ داروں سے بھی نفرت تھی جو اچھے مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ دبلی پتلی سانولی عورت بھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جو چھت کے دوسری طرف لکڑی سے بنے کمرے میں رہتی تھی۔ اس عورت کے کپڑوں سے باسی کھانوں کی بو آتی تھی اور جب وہ اس کے کان کے قریب منہ لا کر بے شرمی کی بات کرتی تو اسے قے آنے لگتی۔

وہ ہر شے سے نفرت کرتا تھا حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی اسے نفرت تھی۔ اسے اپنے کپڑوں سے آتی سڑاند سے نفرت تھی' اپنے ہڈحرام جسم سے نفرت تھی جو ہمیشہ پسینے میں چپ چپاتا رہتا تھا۔ اسے اپنے پیروں کی ان گٹے پڑی انگلیوں سے نفرت تھی جو ہمیشہ پھٹے جوتوں میں جھانکتی رہتی تھیں۔ اسے اپنی نفرت بھری نگاہوں سے بھی نفرت تھی جو ٹوٹے آئینے سے اسے جھانکتی تھیں...... اپنے اس حرام خور پیٹ سے نفرت تھی جو پلک جھپکتے پوری روٹی اور طعامیہ کے دس کوفتے نگل جاتا تھا اور پھر بھی خالی کا خالی رہتا تھا۔ اس کا پیٹ بھیڑیئے کی طرح غراتا رہتا تھا۔

وہ ہر چیز اور ہر وقت سے نفرت کرتا تھا سوائے اس شاندار وقت کے جب اس کے پاس روٹی اور دس طعامیہ کوفتے ہوتے' وہ انہیں لئے کہیں دبکا بیٹھا ہوتا۔ پہلے وہ کوفتے زبان سے چاٹتا پھر روٹی کے ساتھ لقمہ بنا کر منہ میں رکھتا اور مزے لے لے کر چبانے لگتا۔ وہ اس وقت تک چباتا رہتا جب تک وہ لعاب کے ساتھ مل کر غائب نہ ہو جاتے......

اس کے ہونٹ کھل گئے اور گرم گرم رال کا ایک قطرہ کاغذ پر ٹپک پڑا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ہونٹ بند کر لئے اور حقارت کے ساتھ غربت اور محتاجی کے الفاظ پر لکھنا شروع کیا ''سوشلزم کا مطلب یہ ہے کہ ساری رات دیوار کی درزوں میں سے ٹھنڈی ہوائیں نہ آئیں' دن بھر سر پر تیز دھوپ نہ پڑتی رہے۔ پھٹے جوتوں سے پیروں کی انگلیاں باہر نہ نکلی رہیں' اور لوگوں کے دلوں میں نفرت کا لاوا نہ پھوٹتا رہے......''

اس کی انگلیوں میں پھنسا قلم یکدم رک گیا۔ اس نے آخری جملے کو دیکھا' پڑھا

اور اس پر غور کرنا شروع کیا...... ''لوگوں کے دلوں سے نفرت نکل جائے گی تو پھر وہ جدو جہد کیوں کریں گے؟ لڑیں گے کیوں؟ یہ نفرت ہی تو تھی جس نے اسے اپنے لئے جنگ کرنا سکھایا اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا حوصلہ دیا۔ یہ نفرت نہیں تھی تو اور کیا تھی جس نے اس کے اندر عزم پیدا کیا' جس نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑائیں' جس نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے چین نہیں لینے دیا۔ یہ نفرت نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ اس نے وہ کاغذ بھی اٹھایا۔ مٹھی میں بھینچ کر اس کا گولا بنایا اور ردی کی ٹوکری کی طرف اچھال دیا۔ اب دراز سے ایک اور صاف کاغذ نکالا......

مگر اس کے قلم نے پھر وہی اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ وہ پھر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا اور کاکروچ کی ٹانگیں بنا رہا تھا۔ لفظ تھے کہ باہر ہی نہیں آ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس نے پہلے کبھی کچھ لکھا ہی نہیں۔ حالانکہ وہ ایک زمانے سے اخباروں اور رسالوں میں لکھ رہا تھا۔ اس نے رسالوں اور اخباروں کے صفحے کے صفحے سیاہ کئے تھے۔ وہ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ اور ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ آسانی کے ساتھ لکھتا چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے کچھ لکھنا مشکل ہی نہیں تھا۔ اس کا نام اتنا طویل تھا کہ دائیں سے بائیں پورا کاغذ اس کے نام سے ہی بھر جاتا۔ اس کی تعلیم بہت اچھی تھی جو پرائمری اسکول سے لیکر قانون میں ماسٹر کی ڈگری تک پہنچتی تھی۔ اسے بے شمار ادبی اور فنی اصطلاحات اور تراکیب یاد تھیں۔ آج اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ اس سے اتنا سہل اور آسان مضمون بھی نہیں لکھا جا رہا جو اس سے بہت کم تعلیم یافتہ شخص بھی آسانی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔

اس نے قلم کو زور سے پکڑا اور پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ کاغذ پر رکھا۔ اس نے لکھا۔ ''آج ہم جس انقلابی دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ بنیادی اور لازمی نظریہ کو عملی کاموں کے ساتھ یک جا کیا جائے' اور یہ کام کیا جائے اس معاشرہ کے سرکاری قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے جو سوشلسٹ مستقبل کے افق کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

اس نے قلم رکھ دیا قیمتی مردانہ خوشبو میں بسا ہوا ریشمی رومال نکالا اور منہ صاف کیا۔ بڑے فخر کے ساتھ گردن آگے کر کے اپنے لکھے الفاظ پڑھے۔ ہاتھ اٹھا کر اور پاؤں پھیلا کر انگڑائی لی اور بڑی سی جمائی کے لئے منہ کھول دیا۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا ڈھیلا

چھوڑ دیا اور آرام کرنے لگا۔ پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا کاغذ کو تہہ کیا اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ وہ گھر سے باہر نکلا تو چھوٹا لڑکا بھاگا بھاگا آیا اور اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ کار کے اندر بیٹھا اور چابی لگا کر کار اسٹارٹ کی۔ وہ لڑکا اب کار کا شیشہ صاف کر رہا تھا۔ پھر وہ لڑکا بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگا کہ آنے جانے والی کاروں کی آمدورفت میں وقفہ ہو تو اس کی کار کو اشارہ کر سکے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے سڑک پر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے زور سے ایکسیلیٹر دبایا اور تیر کی طرح چوڑی سڑک پر نکل گیا......

اس نے سامنے والے آئینے سے دیکھا کہ وہ لڑکا اسی طرح ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس چھوٹے سے لڑکے کی آنکھوں میں جو تاثر تھا اسے اس نے پہنچان لیا۔ یہ وہی تاثر تھا جو برسوں پہلے ایک ٹوٹے سے آئینے میں اس نے دیکھا تھا۔

☆::☆::☆

MashalBooks.com